OSMANIA UNIVERSITY

جامعۂ عثمانیہ

اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں

سلسلۂ مطبوعات جامعۂ عثمانیہ

اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں

تصنیف
جیمس فرگسن
سی۔آئی۔ای، ڈی۔سی۔ایل، ایل ایل۔ڈی، ایف۔آر۔ایس، ایف۔آر۔آئی۔بی۔اے

ترجمہ
مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی
رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ

سنہ ۱۳۵۰ھ م سنہ ۱۳۴۱ف م سنہ ۱۹۳۲ء

دار الطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

۷۸۶

فہرست مضامین

"اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی فنِ تعمیر ہندوستان میں ١٨٦

باب اوّل

مُقدّمہ

بہت قدیم زمانے سے، بحرِ متوسط اور دریائے سندھ کے درمیان، مغربی ایشیا کے علاقے میں متمدن قوموں کا ایک بڑا گروہ آباد تھا جو الگ تھلگ رہتا اور سوائے جنگ اور عداوت کے اپنے ہمسائوں سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا۔ اس کے ایک طرف ہندوستان اور دوسری طرف یورپ کی قومیں رہتی بستی تھیں مگر مذکورۂ بالا گروہ، انہیں قریب لانے کے بجائے، کچھ کرتا تھا تو ایک دوسرے سے علٰحدہ اور دور ہی کرتا تھا۔

سکندر یونانی کی زبردست یورش پہلی کوشش تھی کہ یہ سدِّ فاصل توڑ کر مشرق و مغرب کو تجارتی اور تمدنی تعلقات کے ذریعے ملایا جائے اور اس ذہین و ذی حوصلہ فاتح نے

جو نقشہ ڈالا تھا، اسے وثیقہ الکبریٰ کی بتدریج وسعت و تنظیم نے عملاً پورا کر دکھایا اور جب تک اس کی سیادت قائم رہی، اس وقت تک مغربی ایشیا کی اقوام میں امن و انتظام رہنے سے یورپ اور ہندوستان کے درمیان آمدورفت کا راستہ کھلا رہا اور بظاہر کوئی وجہ نہ معلوم ہوتی تھی کہ اس میں خلل پڑ جائے گا۔ لیکن رومی دنیا کو یہ خبر نہ تھی کہ اس طویل راستے کے دونوں جانب دو بدوی قومیں ایسی موجود ہیں جن پر رومی تمدن کا سایہ تک نہیں پڑا اور جو تاک میں بیٹھی ہیں کہ سلطنت رومہ میں کمزوری آتے ہی اس سے فائدہ اٹھائیں ؎

ان میں عرب زیادہ بے باک وجری اور مرکز سے نزدیک تر تھے اور اپنی حدود سے اوّل انھی نے قدم باہر نکالا۔ ساتویں صدی عیسوی میں وہ دشت عرب سے نکل کے شام، ایران، مصر اور شمالی افریقہ پر چھا گئے۔ اندلس پر ان کا تسلط ہو گیا اور ہندوستان بھی ان کے قبضے میں آنے سے ذرا ہی بچ گیا۔ امویوں کے پہلے خلیفہ امیر معاویہؓ کے عہد میں جنوب کی طرف سے دریائے سندھ کو عبور کرنے کی کوششیں ہوئیں اور یہ وہ راستہ تھا جس سے تھوڑی ہی مدت پہلے سیتھی قومیں ہندوستان میں در آئی تھیں۔ لیکن یہ کوششیں کامیاب نہ ہوئیں البتہ خلیفہ ولید کے زمانے میں محمد ابن قاسم کے ماتحت عرب سندھ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ (۹۳ھ = ۷۱۲ء) بایں ہمہ یہ فتح غیر مثمر ثابت ہوئی اور گو یہاں ایک مسلمان خاندان کی حکومت قائم ہو گئی تھی لیکن یہ خلافت کی ماتحتی سے تھوڑے ہی دن بعد آزاد اور آخر میں محو و بے نشان ہو گئی ؎

عربی خلافت کی سیادت جس قدر درخشاں تھی اسی قدر محدود و ناپائیدار ثابت ہوئی۔ اس کے انتہائی عروج کا وقت ۸۰۰ء کے قریب سمجھنا چاہئے جب کہ ہارون الرشید وارث تاج و تخت تھا۔ اس کے بعد انحطاط شروع ہو گیا اور ضعف و فساد جو ایشیا کے شاہی خاندانوں کی خصوصیت ہے اس قدر بڑھے کہ دو صدی بعد شمالی گروہوں کو ہاتھ پاؤں نکالنے کی جرأت ہو گئی ؎

یہ گیارھویں صدی مسیحی کا ذکر ہے کہ تاتاری لشکر جبال قہستان کے جنوب میں نمودار ہوئے جن کی نسبت اس وقت تک صرف یہ علم تھا کہ وسط ایشیا کے کوہستانی جنگلوں میں مویشی چراتے پھرتے ہیں۔ مگر آئندہ چھ سو برس تک انکا قدم برابر بڑھتا رہا حتی کہ

سنہ ۱۶۸۳ء میں ہم ترکوں کو ویانا کی شہرپناہ کے سامنے خیمہ زن دیکھتے ہیں۔ مغل بادشاہ اورنگ زیب سارے ہندوستان پر فرماں روائی کرتا ہے اور مصر اور بیچ کے سب ملک تورانی نژاد بادشاہوں کے زیرنگیں نظر آتے ہیں۔

خلافت عربی کے تحت میں جو قومیں تھیں، ان کی عمارات کا دوسرے مقام پر ذکر آچکا ہے اور یہ بہت کم وقعت رکھتا ہے[1]۔ ان کے فرماں روا سامی نسل کے تھے اور انھیں تعمیری شان و شوکت کا کوئی خاص مذاق نہ تھا اور بجز اس صورت کے کہ ان کی حکومت کسی غیر نسل کے لوگوں پر ہو، انھوں نے فن کی بہت کم یادگاریں چھوڑی ہیں[2]۔

شمالی حملہ آوروں کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ یہ کم و بیش خالص تورانی نسل کے لوگ تھے اور جہاں پہونچے وہاں مساجد اور خاص کر مقابر ان کے جاہ و جلال کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ سامی فتوحات جن کا مرکز مکہ (معظمہ) تھا، وادی الکبیر سے لے کے وادی سندھ تک پھیلیں مگر فن عمارت میں بہت کم چیزیں انھوں نے یادگار چھوڑیں[3]۔ بخلاف اس کے، تورانی فتوحات بلخ و بخارا کے مرکزوں سے استنبول و کٹک تک وسیع ہوئیں اور اس تمام علاقے کو ہر قسم کے آثار سے معمور کر دیا۔ ان میں سے مغربی اور وسطی ممالک کی عمارات کا ذکر ترکی و ایران کے حال میں عرض کیا جا چکا ہے[4]۔ مشرقی شعبہ باقی ہے اور اسی کی یادگاریں ہمارے بیان کا موضوع ہیں۔

ہندوستان کے اسلامی معماروں نے یہاں بھی جہاں جا کر بسے وہاں کے ویسی

---

[1] سنہ ۱۲۵۰ء میں مملوک سلاطین کے بادشاہ ہونے تک، مصر نے حسن تعمیر کا بہت کم ذوق دکھایا اور ایران میں اسلامی فن عمارت کا آغاز ہی عملاً سلجوقیوں کے عہد (سنہ ۱۰۳۶ء) سے ہوتا ہے۔ [2] اس فقرہ کا مطلب صاف نہیں ہے۔ غالباً مصنف کا یہ کہنا تو صحیح ہو گا کہ دو تین ملکوں کے سوا غیر عربی ممالک میں عربی الاصل بادشاہوں نے تعمیر پر چنداں توجہ نہیں کی۔ ورنہ شام و فلسطین، مصر و عراق اور خود حجاز میں ان کے آثار صنادید تعداد یا شان و شوکت میں کچھ کم نہیں ہیں۔ (مترجم) [3] یہ قول تاریخ و تحقیق دونوں سے عاری ہے اور اس کی تکذیب میں صرف لیبان کی مشہور کتاب "تمدن عرب" کا حوالہ دینا کافی نظر آتا ہے۔ مترجم۔ [4] "ہسٹری اوف انشینٹ ۔۔۔ آرکی ٹیکچر" طبع سوم۔ جلد دوم، ص ۵۵۶۔

باشندوں کے طرز اخذ کرنے میں اسی صلاحیت کا ثبوت دیا جیسا کہ مذکورۂ بالا ممالک میں
دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں ہم اسلامی فن عمارت کے کم سے کم بارہ ۱۸۸
یا پندرہ طرز پاتے ہیں اور اگر زیادہ جامعیت سے نظر ڈالی جائے تو اور زیادہ قسمیں گنانی
پڑیں گی لیکن سردست ہمارے مقصد کے لئے غالباً ذیل کی تیرہ قسمیں کافی ہونگی :۔

۱۔ ان میں سب سے پہلا طرز غزنی کا ہے کہ گو صحیح معنی میں وہ ہندوستان میں داخل نہیں تاہم ہندوستان کے طرزہائے عمارت پر یقیناً اس کا بڑا اثر پڑا اور حقیقت میں مغربی طرز تعمیر کے ہندوستان تک پہنچانے میں اسی نے زینے کا کام دیا۔ بلکہ عرصہ دراز تک مغربی اور مشرقی دنیا کی عمارات کے درمیان وہ حلقۂ موصلہ بنا رہا۔ نظر بریں ہندوستان خاص کے ابتدائی طرز تعمیر کے سمجھنے میں اس غزنوی طرز سے بہت کچھ مدد مل سکتی ہے بشرطیکہ خود اسے ہم صحت و درستی کے ساتھ بیان کر سکیں لیکن اس کے لئے ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا پڑے گا کہ کوئی صاحب فن آدمی اس صوبے کی سیاحت کرے ؛

۲۔ اس کے بعد شمالی ہندوستان کا "پٹھان" یا (ترکی) طرز عمارت (از ۱۱۹۳ء تا ۱۵۵۴ء) ہے جس کی مدت زمانی ساڑھے تین سو برس اور احاطہ سارے بالائی ہندوستان پر وسیع ہے لیکن سلطان علاء الدین محمد شاہ اوّل[۱] کی وفات (۱۳۱۶ء) کے بعد مرکزی حکومت بعض اوقات اتنی کمزور ہو جاتی تھی کہ نومقبوضہ اور دوردست صوبے آزاد ہو بیٹھتے تھے اور جب یہ ہوتا تو سرکشی کرنے والے حکّام ہر ہر بات میں اپنی جداگانہ شخصیت کا اظہار کرتے اور فنِ تعمیر میں بھی جدّت دکھاتے جس میں مقامی خصوصیات جھلکتی تھیں ؛

۳۔ سب سے اوّل ایسی جدّت طرازی دکھانے والوں میں جونپور کا شرقی خاندان تھا جس کا عہد حکومت کم مگر نہایت درخشاں رہا (۱۳۹۴ء تا ۱۴۷۶ء) اور اس ایک صدی سے بھی کم کی مدّت میں اس نے اپنے پائے تخت اور دوسرے شہروں کو ساجد اور ایسے سلسلۂ عمارات سے مزین کر دیا جو شان و شوکت میں ہندوستان کے

---

[۱] مصنف کی مراد سلطان علاء الدین خلجی سے ہے ؛ ترجم

کسی دوسرے شہر یا علاقے کی عمارات سے شاید ہی کم تر ہوں گی اور اپنے نمایاں طرز خاص کے اعتبار سے تو یقیناً کسی سے گھٹی ہوئی نہیں ہیں ؛

۴ - شاہان گجرات کا طرز تعمیر جو انھوں نے اپنے خود مختاری کے زمانے (۱۳۹۶ء تا ۱۵۷۲ء) میں اختیار کیا۔ زیب و زینت اور تنوع میں جونپور سے بھی بڑھ کر ہے۔ لیکن اس میں اتنی جدت اور شان نہیں پائی جاتی۔ ان بادشاہوں نے صوری اور معنوی لحاظ سے اکثر اجزا ہندوؤں اور جینیوں کی عمارات سے مستعار لئے ہیں جن میں وہ رہتے سہتے تھے۔ بایں ہمہ انھوں نے جس قدر ہندوانی جزئیات اخذ کی ہیں، اسی مناسبت سے ان کے طرز تعمیر میں حسن و زیبائش بھی موجود ہے ؛

۵ - ملک مالوہ ۱۴۰۱ء میں آزاد ہوا اور ۱۵۶۹ء میں سلطنت مغلیہ میں جذب ہوگیا۔ اس دوران میں یہاں کے بادشاہوں نے اپنے دارالملک منڈو کو نہایت ۱۸۹
عالیشان قصور و مساجد سے زینت بخشی لیکن طرز تعمیر کے اعتبار سے جونپور و گجرات کی نسبت یہاں کی عمارتیں دہلی کے ماخذ اصلی سے زیادہ مشابہ تھیں لہٰذا ان میں اتنی مقامی خصوصیت اور شان امتیازی پیدا نہ ہوئی ؛

۶ - بنگالہ بہت پہلے یعنی ۱۲۰۳ء ہی میں مستقل سلطنت بن گیا تھا اور مرکزی حکومت سے ۱۵۷۶ء تک کم و بیش آزاد ہی رہا۔ اور اس عرصے میں اس کے پائے تخت گوڑ و مالدا نہایت پرشکوہ عمارات سے مزین ہوگئے۔ یہ عمارتیں عام طور پر اینٹ کی تھیں اور مرور زمانہ سے وہاں جنگلی درختوں کی ایسی کثرت ہوئی کہ یا تو وہ خراب و شکستہ ہوگئیں اور یا اب نظر نہیں آسکتیں۔ باوجود اس کے ان کا تنوع سب سے بڑھا ہوا ہے اور اسی کے ساتھ نہایت ممتاز اور واضح طور پر جداگانہ طرز تعمیر کے جملہ عناصر ان میں پائے جاتے ہیں ؛

نربدا کے شمال میں اسلامی طرز تعمیر کی یہ چھ قسمیں کر دینا، غالباً کافی ہے۔ مگر اس دریا کے جنوب میں واضح طور پر تین جداگانہ قسمیں الگ ہیں :-

۷ - پہلی قسم، خاندان بہمنی کی عمارتوں کی ہے جس نے اول گلبرگہ (۱۳۴۷ء) اور بعد میں بیدر (۱۴۲۶ء) کے پائے تخت کو شاندار عمارتوں سے آراستہ کیا۔ ان کا طرز بالکل علیحدہ اور ممتاز ہے اور یہ سلسلۂ تعمیر جاری رہا تا آنکہ ۱۵۲۵ء میں مغلوں کی

وسیع سلطنت میں یہ علاقے ضم ہوگئے[۵۱]۔

۸۔ اس کے بعد مگر خاندان بہمنی سے بھی زیادہ مشہور بیجاپور کا عادل شاہی خاندان ہے (۱۴۸۹ء تا ۱۶۶۰ء)[۵۲] اس کا طرز تعمیر مذکورہ بالا تمام قسموں سے جملہ خصوصیات میں الگ ہے اور علوئے خیال اور ہمت تعمیر میں ہندوستان بھر کی عمارتوں سے واضح امتیاز رکھتا ہے۔

۹۔ تیسرا جنوبی طرز گولکنڈے کے قطب شاہی خاندان (۱۵۱۲ء تا ۱۶۷۲ء)[۵۳] کا ہے۔ ان بادشاہوں کے مقبرے بڑے شاندار ہیں اور ہندوستان کے سب سے قابل دید مجموعوں میں داخل ہیں۔ بایں ہمہ ان میں انحطاط کی علامتیں موجود ہیں جو بے شبہ ان کے زمانۂ تعمیر میں فن پر مسلط ہوتا جاتا تھا۔

۱۰۔ یہ سب ممتاز خصوصیات یکے بعد دیگرے مغلوں کی وسیع و عظیم سلطنت میں ضم ہوگئیں جسے ۱۵۲۶ء میں بابر نے قائم کیا اور جو اورنگ زیب کی وفات کے وقت عملاً تباہ ہوتے جانے کے باوجود، کہہ سکتے ہیں کہ اٹھارویں صدی کے وسط یعنی ۱۷۵۰ء تک سلامت رہی۔ یہی خاندان ہے جس کی بدولت آگرہ و دہلی اور شمالی ہند کے اکثر شہروں کی سب سے شاندار عمارتیں معرض وجود میں آئیں۔

۱۱۔ اپنے مضمون کے اس شعبے کو ختم کرتے وقت سندھ کے اسلامی فن تعمیر کو شمار کر لینا مناسب ہوگا۔ وضع اور آراستگی میں یہ قریب قریب بالکل ایرانی ہے اور یقیناً بہت قدیم زمانے سے اس صوبے میں موجود ہوگا لیکن اس کی جس قدر مثالیں معلوم ہیں، وہ نسبتہً قریبی عہد کی ہیں اور لطیفہ یہ ہے کہ ان سے ہم پھر غزنی کی نواح میں پہنچ جاتے ہیں، جہاں سے یہ سلسلہ آغاز کیا تھا۔

۱۲۔ یہ تو وہ قسمیں تھیں جنہیں اسلامی طرز تعمیر کا صحیح نمونہ کہنا چاہئے مگر ان کے سوا دو طرز اور ہیں جنہیں دوغلا کہہ سکتے ہیں۔ ان میں سے پہلا اودھ کا ہے (۱۷۵۶ء تا ۱۹۰

---

[۵۱] ۱۵۲۵ء میں خاندان بہمنی کا خاتمہ تو ہوگیا تھا لیکن سلاطین مغلیہ کا دکن میں عمل دخل تقریباً ایک صدی کے بعد ہوا۔ مترجم

[۵۲] مصنف نے یہ سنہ بھی غلط لکھا ہے۔ بیجاپور کا الحاق ۱۶۸۶ء کی بات ہے۔ مترجم

[۵۳] قطب شاہی خاندان کا خاتمہ ۱۶۸۷ء میں ہوا نہ کہ ۱۶۷۲ء میں۔ مترجم

۱۸۴۷ء) جس کے پائے تخت میں عمارتوں کے ایسے سلسلے موجود ہیں جو وسعت و آراستگی میں مذکورہ بالا صدر مقامات کی عمارتوں کے ہم پلہ ہیں لیکن ان کے بانیوں کا ذوق اس درجہ گرا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس قوم سے منسوب کرنا بھی مشکل ہے جو تھوڑا ہی زمانہ پہلے ایسے عالی ہمتی کے کرشمے دکھا چکی تھی؛

۱۳) میسور کی چند روزہ بادشاہی (۱۷۶۱ء تا ۱۷۹۹ء) نے جو طرز اختیار کیا وہ یورپی بدذوقی کے اثرات سے ذرا زیادہ دور تھا اور وہ اتنا ذلیل نہیں ہے جتنا لکھنو کا طرز عمارت۔ بایں ہمہ پہلے نمونوں کے مقابلے میں یہ بہت ادنیٰ اور بدنما ہے؛

اس مضمون پر زیادہ جامع کتاب لکھی جائے تو غالباً احمد نگر، اور نگ آباد (۱۴۹۰ء تا ۱۷۰۷ء) اور بعض دوسرے کم درجے کے طرز ہائے عمارت بھی شمار کرنے ضروری ہوں گے لیکن یہ اس قدر ممتاز نہیں ہیں کہ انھیں جداگانہ طرز سمجھا جائے اور ہم اپنی اس کتاب میں جس حد تک تصاویر سے کام لے سکتے ہیں، وہ اتنی وسیع نہیں ہے کہ ان کم درجے کے نمونوں کا فرق اُن لوگوں کو محسوس ہو سکے جو ان عمارات سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہیں؛

یہی نہیں، بلکہ حق یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کی کتابوں کے سوا دوسرا ذریعہ معلومات نہیں رکھتے، خود زیر بحث طرزوں کے سب سے ممتاز اوصاف اور خصوصیات ان کے ذہن نشین نہیں کئے جا سکتے جب تک کہ اس کتاب کی نسبت کہیں زیادہ تصویریں مہیا نہ کی جائیں۔ ان تیرہ میں سے ہر طرز ایک جداگانہ کتاب چاہتا ہے لیکن بیجاپور[1]، احمد آباد[2]، جونپور[3] اور فتح پور سیکری[4] کے سوا اور کسی مقام کی عمارات پر ایسی

---

[1] "آرکیٹکچر اوف بیجاپور" از میڈوز ٹیلر، فرگسن وغیرہ۔ ۱۸۶۶ء۔

[2] " " احمد آباد" ہوپ، فرگسن وغیرہ۔ ۱۸۶۶ء؛ یہاں کی اور عام طور پر گجرات کی اسلامی عمارات کے تفصیلی حالات "آرکیولوجیکل سروے اوف ویسٹرن انڈیا" کی چھٹی اور نویں جلد میں بھی ملیں گے؛

[3] "دی شرقی آرکیٹکچر اوف جونپور" از اسمتھ وغیرہ ۱۸۸۹ء۔

[4] اسی اڈیشن میں اسمتھ کی شاندار مصور کتاب "مغل آرکیٹکچر اوف فتح پور سیکری" نظر انداز نہ ہونی چاہیے۔

کوئی کتاب نہیں لکھی گئی اور ان چار مقامات پر بھی جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ تمام ضروری معلومات اور مواد کا جامع نہیں ہے مگر ہمیں امید رکھنی چاہئے کہ ان کی کمی پوری کردی جائے گی اور دوسرے مقامات پر بھی قبل اس کے کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے، کتابیں تیار کرلی جائیں گی کیونکہ مرور زمانہ اور موسم کے تاراج کن ہاتھوں یہ آثار قدیمہ جلد جلد برباد و محو ہوتے جاتے ہیں اور ان سب سے بڑھکر، ہندوستان کی حکومت مقتدر، بیہودہ مداخلت اور نقصان رساں سرکاری اغراض کے لئے انھیں خراب بے نشان کئے ڈالتی ہے ؛

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ - اس کی چار جلدیں (طبع ۱۸۹۴ء تا ۱۸۹۶ء) اور ان میں ۲۱۰ پلیٹ کی تصویریں ہیں اس میں صرف اسی مقام کے طرز عمارت پر جامع بحث کی ہے۔ اور اس کی دوسری کتاب "مغل کلر ڈیکوریشن اوف آگرہ" (۱۹۰۳ء) بھی بعض عمارتوں کے نہایت عمدہ نقشے پیش کرتی ہے ؛

۱۹۱

باب دوم

غزنی

مقبرۂ سلطان محمود۔ سومنات کے کواڑ۔ میدان کے مینار

سنین

سبکتگین	بانی سلطنت ۹۷۵ء
سلطان محمود	جلوس ۹۹۷ء
سلطان مسعود	۱۰۳۱ء
سلطان عبدالرشید	۱۰۴۹ء
سلطان ابراہیم	۱۰۵۹ء
سلطان شہاب الدین (خاندان غوری)	۱۲۰۳ء

نویں صدی عیسوی کے آخری حصے میں خلفائے بغداد کی قوت بسرعت انحطاط کی ان منازل تک پہونچ رہی تھی جو عام طور پر ایشیا کے شاہی خاندانوں کے نصیب میں آتی ہیں۔ المعتمد کے عہد (۸۷۰ء تا ۸۹۱ء) میں مصر آزاد ہوگیا اور شمال میں بخارا کے والی نے، جسے خلیفہ نصر احمد نے مقرر کیا تھا، بغداد کا طوقِ اطاعت اتار کر پھینک دیا۔ یہ والی ایک تاتاری سردار، سامان نامی کا پوتا تھا جس نے خودمختاری کا اعلان کیا اور سامانی خاندان کی بادشاہی کی بنیاد ڈالی۔ اس خاندان کی حکومت کو تقریباً سو برس ہوئے تھے، جب کہ ایک سامانی سپہ سالار کے ترکی غلام سبکتگین نے بھی اپنے آقا سے انحراف کیا اور غزنی میں جہاں وہ صوبہ دار تھا، شہرۂ آفاق غزنوی سلطنت قائم کرلی۔ اس کا جانشین بیٹا محمود ہندوستان کی تاریخ کے سب سے نامور بادشاہوں میں ہے جس کا سبب ایک تو اس کے پیہم حملے تھے۔ دوسرے سومنات کے مندر کو توڑنا خصوصیت سے اس کی شہرت کا باعث ہوا۔

فرشتہ کا بیان ہے کہ اپنے ایک حملے سے جس میں سلطان محمود نے شہر متھرا کو تاراج کیا تھا واپس غزنی آ کے اُس نے سنگِ سماق و مرمر کی ایک عالیشان مسجد بنانے کا حکم دیا جو بعد میں عروسِ فلک کے نام سے مشہور ہوئی۔ اسی کے متصل سلطان نے ایک مدرسہ قائم کیا۔ امرائے غزنی کو اپنے بادشاہ کا ذوق عمارت دیکھکر تحریک ہوئی اور وہ اپنے محلات و قصور نیز رفاہ عام کی عمارات میں رفعت و شان کے اعتبار سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے لگے۔ اسی طرح، بقول مورخ، تھوڑے ہی دن میں یہ دارالسلطنت مساجد و محلات، چاہ و تالاب، حوض و نہر کی کثرت اور خوشنمائی سے ایشیا کے سب شہروں پر بازی لے گیا ۞



۱۹۲

غزنی کا مینار

شہر غزنی کے میدان میں اس شان و زیبائش کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ اور چونکہ اس عہد کے ایرانی فنون و صناعات کی نسبت ہماری معلومات نہایت تشنہ ہے، لہذا غزنی کے آثار باقیہ کا حال اور بھی زیادہ دلچسپ اور بیش قیمت چیز ہوگا۔ لیکن ان کھنڈروں کا ابھی تک نہ معائنہ ہوا نہ کسی نے ان کی کیفیت قلمبند کی ہے حتیٰ کہ نام کے سوا ہمیں محمود اعظم تک کی قبر کا ٹھیک ٹھیک حال معلوم نہیں[1]۔ حالانکہ اس ملک پر برطانی لشکر کی تباہی خیز مہم کے اخیر میں اسی مقبرے کے پھاٹک اکھاڑ کر ہندوستان لائے گئے تھے۔

یہ پھاٹک دیودار[2] کے ہیں اور ان پر جو نقوش کندہ ہیں، وہ قاہرہ کی مسجد ابن طولون اور وہیں کی دوسری ہمعصر عمارتوں کے کام سے اس قدر مشابہ ہیں کہ نہ صرف
۱۹۳ ان کی ہمزمانی ثابت ہوتی ہے، بلکہ



سلطان محمود کی قبر غزنی کی نقاشی کے نمونے

[1] بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ انگریزی فوجیں غزنی گئیں اور کئی کئی بار وہاں سے گزریں مگر ان میں کوئی ایک بھی سروار ایسا نہ تھا جس میں اتنی قابلیت یا دلچسپی ہوتی کہ وہ یہاں کے آثار قدیمہ کا معائنہ کرتا امید ہے کہ آئندہ ایسا موقع آیا تو ان کی فنی اہمیت نظر انداز نہ کی جائیگی۔ [2] مسٹر وین نے اپنے "ٹریولز ان افغانستان"

یہ بھی کہ دنیائے اسلام کے اتنے بعید اقطاع میں ان دنوں نقاشی کے کس قدر یکساں طرز مقبول و مروج تھے ؛

اسی کے ساتھ ان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اس زمانے یا کسی زمانے کی بھی ہندوانی نقاشی سے ذرا بھی مشابہت رکھتی ہو۔ درحقیقت اس میں شبہ کرنے کی مطلق گنجائش نہیں ہے، کہ یہ کام اسی مقام پر ہوا تھا، جہاں سے یہ کواڑ ہاتھ آئے ہیں؎۱۔ مقبرے کے دوسرے حصوں میں بھی اسی قسم کے نقش و نگار ہوں تو ان کی تصویریں کمال دلچسپی کا موجب ہوں گی لیکن گمان غالب یہ ہے کہ اس عہد کے فنون کا بہترین مرقع جامع غزنی سے دستیاب ہوگا بشرطیکہ کوئی اس مسجد کو تفصیل سے جانچنے کی تکلیف گوارا کرے ؛

شہر کے باہر میدان میں ابھی تک دو خوشنما مینار موجود ہیں کہ غزنی کے آثار قدیمہ میں اگر سب سے زیادہ عجیب نہیں، تو کم سے کم سب سے ممتاز ضرور ہیں۔ یہ کسی مسجد کے مینار نہ تھے بلکہ حقیقت میں فتح و ظفر کی یادگاریں ہیں جیسے چتوڑ وغیرہ ہندوستان کے دوسرے مقامات میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور جن کا ایسے ملک میں ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے جہاں کچھ مدت پہلے بدھ مت کا عرصے سے رواج رہا تھا۔ ان میں سے ایک خود محمود نے بنوایا اور دوسرے کی بنا یا تکمیل اس کے قریبی جانشین مسعود کے زمانے میں ہوئی؎۲ ؛

؎۱ بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ میں اس مقبرے کا جو نقشہ دیا ہے وہ محدود یک رخا، اور غالباً زمانہ حال کی تعمیر کا ہے جس سے قدیم فن کا تفصیلی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں صرف دور کی محرابیں قدیم اور قیاساً گیارھویں صدی ہی کی بنی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ؛ ؎۳ یہ روایت کہ یہ کواڑ صندل کے بنے ہوئے اور سومنات کے مندر سے لائے گئے تھے، قطعی طور پر بے اصل و غلط ہے کیونکہ ان کی لکڑی مقامی دیودار کی اور طرز نقاشی ہندی نقاشی سے بالکل مختلف ہے ؛

؎۱ کرنل یول کی مطبوعہ "مارکوپولو ٹریولز" (جلد دوم ۳۹۰) میں ان کواڑوں کا بہت اچھا نقشہ دیا ہے ؛

؎۲ ان میناروں کے کتبات کے لئے دیکھو رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ جلد ۱۲ ۱۸۴۳ء صفحہ ۷۷، ۷۸۔

ان میناروں کا نچلا حصہ ستارے کی شکل کا ہے جسے غالباً ایک مربع پر دوسرا مربع آڑا رکھکے بنایا ہے اور اوپر کا حصہ جو زمین سے ۴۰ فیٹ اونچا ہے گولائی دے کے تعمیر کیا ہے۔ دونوں اینٹ کے ہیں مگر چونے گچ کے صندلے پر ایسی عمدہ اور اعلیٰ اوج کی پچی کاری کی ہے کہ آج تک نقش ونگار کے کنارے تک نہیں بگڑے ہیں ؛

اسی قسم کے مینار آگے مغربی ممالک میں، کوہ قفقاز کے دامنوں تک ملتے ہیں[1] جو فتحمندوں نے جنگ کے میدانوں میں فتح کی یادگار رہنے کے لئے تعمیر کرائے تھے۔ مگر اپنی موجودہ حالت میں تو کوئی بھی حسن تعمیر کے لحاظ سے غزنی کے میناروں کے برابر نہیں ہے اگرچہ یہ ممکن ہے کہ ان مغربی میناروں پر لپسے ہوئے پتھر یا اور کسی ناپائدار مصالحے کا صندلا کیا گیا ہو جو اب اڑگیا اور ان کا صرف ڈھانچا باقی رہ گیا جس سے ان کی اصلی حالت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا ؛

سلطان محمود کے اخلاف کی کمزوری نے اہل ہند کو ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصے تک چین سے رہنے دیا۔ ایشیائی خاندانوں کے معمول کے مطابق غزنوی بادشاہ بھی بتدریج انحطاط کے زینے طے کر رہے تھے کہ ان میں سے ایک بادشاہ کی بدعنوانیوں نے اور بھی جلد اس حکومت کا خاتمہ کرادیا اور علاء الدین حسن نے اس کے جرائم کی سزا میں سلطنت اور پائے تخت غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ خاندان غزنوی کی جگہ آخر کار غوری بادشاہوں نے لی اور سنہ ۱۱۸۶ء میں شہاب الدین محمد ابن سام اس ملک کا فرمانروا ہوگیا ؛

ہرچند خاندان غزنوی کے بعد سے اب تک افغانستان میں صدیوں بدنظمی کا دور دورہ رہا ہے لیکن یہ مشکل سے یقین آتا ہے کہ ان کی شان وشوکت کی سبھی یادگاریں محو وبے نشان ہوچکی ہونگی۔ بایں ہمہ جب تک ان کے شہروں کے معائنے اور عکسی تصاویر کا کام کوئی ایسا صاحب فن نہ کرے جو نیک وبد اور جدید وقدیم میں امتیاز کرسکتا ہو اس وقت تک ہم سوائے اس کے کچھ نہیں کرسکتے کہ اس طرز تعمیر کی اہمیت کا اظہار کردیں اور اس باب کا لکھنا اس وقت پر ملتوی کردیں جب کہ کافی

[1] دو کے نقشے " Voyage Autour du Concase " میں دیئے گئے ہیں ؛

معلومات بہم پہنچ جائے گی۔ سردست یہ علم بھی کچھ کم اطمینان بخش نہیں ہے کہ دریائے سندھ و ہرات کے درمیان ابھی تک ایسے آثار سلامت ہیں جن سے مغرب یا مشرق کے طرز ہائے عمارت میں تعلق و اتصال قائم کیا جا سکتا ہے۔ بعض سیاحوں نے سرسری طور پر ان کی کیفیت قلم بند کی ہے لیکن یہ ہمارے مقاصد کے لئے پوری نہیں ہے اور ملک کی ناستقل حالت دیکھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ غالباً ان کی تفصیلی کیفیت لکھی جانے میں ابھی ایک عرصہ درکار ہوگا۔

باب سوم

(ترک و) پٹھان بادشاہ

پرانی دہلی کی مسجد۔ قطب مینار۔ علاء الدین کا مقبرہ۔ پٹھان بادشاہوں کے مقبرے۔ ان کی تزئین۔

سنین

شہاب الدین غوری	سنہ ۱۱۹۳ء
قطب الدین ایبک	سنہ ۱۲۰۶ء
شمس الدین التمش	سنہ ۱۲۱۰ء
علاء الدین خلجی	سنہ ۱۲۹۶ء
ناصر الدین خسرو	سنہ ۱۳۲۰ء
تغلق شاہ اوّل	سنہ ۱۳۲۱ء
خضر خاں (زیر سیادت امیر تیمور گورگان)	سنہ ۱۴۱۴ء
بہلول لودھی	سنہ ۱۴۵۱
شیر شاہ سوری	سنہ ۱۵۴۰
سکندر شاہ سوری	سنہ ۱۵۵۵

غوریوں میں ایک نوخیز نسل کی قوت و ہمت موجود تھی جب کہ انھوں نے ہندوستان کی فتح کا کام از سر نو ہاتھ میں لیا۔ سنہ ۱۱۹۱ میں ایک بار شکست کھا کے سلطان شہاب الدین دوبارہ سنہ ۱۱۹۲ میں ہندوستان آیا اور اجمیر کے پرتھوی راج کو شکست دی۔

اس فتح کے بعد ۱۱۹۳ء میں قنوج مسخر ہوا اور شمالی ہندوستان کی ان سب سے بڑی سلطنتوں کی راج دھانیوں کو مسخر کر لینے کے معنی یہ تھے کہ یہ سارا علاقہ سلطان شہاب الدین کی شہادت سے قبل جو ۱۲۰۶ء میں واقع ہوئی، اس بادشاہ کے زیر نگیں آگیا تھا۔ لیکن اس کے بعد غوریوں کی وسیع سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور ملک ہندوستان قطب الدین ایبک کے حصّے میں آیا۔ یہ بادشاہ اصل میں ایک ترک غلام تھا جو ترقی کر کے شہاب الدین کا ایک سپہ سالار ہو گیا اور اپنی لیاقت اور جنگی ہنرمندی سے اپنے آقا کی ہندوستانی فتوحات میں اس کا شریک و معاون رہا کیونکہ ۱۱۹۲ء میں شہاب الدین اسی کو اپنا نائب بنا گیا تھا۔

جدید فتوحات کا کام جو اس شان سے شروع ہوا تھا، قطب الدین کے جانشین التمش نے اولوالعزمی کے ساتھ جاری رکھا اور اس کے انتقال ۱۲۳۵ء سے پہلے شمالی ہندوستان کی حکومت مستقل طور پر ہندوؤں کے ہاتھ سے نکل کے مسلمان فاتحین کے قبضے میں آگئی۔

ان فتوحات کے بعد ڈیڑھ صدی تک ترک سلاطین کے ماتحت جنھیں انگریزی تاریخوں میں عموماً پٹھان کے نام سے یاد کرتے ہیں، متحد رہی ان بادشاہوں نے مسلسل جیسی مستعدی اور قوت کا ثبوت دیا، وہ ایشیا میں بہت غیر معمولی چیز ہے۔ انہوں نے سلطنت کو قائم اور مستحکم ہی نہ کیا بلکہ اہل ہند پر پیہم فتوحات سے اسلامی سلطنت ۱۹۷
کی حدود میں اضافہ کرتے رہے اور اس عہد میں اس وسیع سلطنت کا پائے تخت عملاً دہلی ہی رہا۔ لیکن چودھویں صدی کے آخری نصف میں انتشار و انحطاط کی علامتیں نظر آنے لگیں اور یکے بعد دیگرے صوبے کے والی سرکشی کا علم بند کرنے لگے۔ انھیں کامیابی ہوئی اور ان کی جداگانہ مستقل سلطنتیں قائم ہو گئیں جن کی قوت و اقتدار اپنی قدیم اور پہلی حکومت سے اور پائے تخت خود دار السلطنت دہلی سے ہمسری کا دعویٰ کرتے تھے۔ بایں ہمہ ان ہم اصل حکومتوں کا سرگروہ رسمی طور پر شہر دہلی ہی رہا تا آنکہ تیمور کی چھٹی پشت میں، بابر بادشاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا (۱۵۲۶ء) اور پٹھانوں کا خاتمہ کر کے آخر کار سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس شہرۂ آفاق خاندان نے ۶ پشت میں تمام ممالک ہند کی واحد اسلامی سلطنت کی صورت میں شیرازہ بندی کی۔ یہ ۶ بادشاہ (۱۵۲۶ء تا

۱۲۹۰ء) تقریباً دو صدی کی غیر معمولی مدت تک فرمانروائی کرتے رہے اور ان کے عہد میں سلطنت نے وہ شوکت و اقتدار حاصل کیا جو ممالک مشرق میں قریب قریب بے مثال تھا؛

ترک سلاطین کی تعمیری تاریخ کا آغاز جس طرح شان و شوکت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، اسی طرح ان کی قومی خصائص کا بھی بہترین مرقع ہے۔ جونہی انھیں اپنی فتوحات کی طرف سے ذرا اطمینان ہوا، اسی وقت انھوں نے اپنے دو صدر مقاموں یعنی اجمیر و دہلی میں دو وسیع مسجدوں کی بنا ڈالی جن کی عظمت و شان سے ان کے دین کا جاہ و جلال ظاہر ہو اور وہ بت پرستوں پر اُن کے غلبہ و ظفر مندی کا نشان ہوں۔ یہ لوگ سب سپاہی پیشہ اور صرف ملک فتح کرنے آئے تھے اور ظاہر ہے کہ اپنے ہمراہ صناع اور معمار نہیں لائے تھے لیکن تاتاری نسل کی دوسری قوموں کی مثل تعمیر کا فطری اور قومی شوق موجود تھا اور چونکہ اپنا طرز خاص بھی رکھتے تھے، لہذا یہ قرینہ نہ تھا کہ وہ جو عمارت بنانی چاہیں گے اس میں خطا کھائیں گے۔ دوسرے انھیں اپنی نئی رعایا میں بے شمار کاریگر ایسے مل گئے جو کہیے کے مطابق ہر قسم کے نقشے پر عمارت بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے؛

سب سے اوّل تو ان بادشاہوں کو جتنی مندروں کے دالان دار صحنوں میں ایک بنی بنائی مسجد کا قریب قریب پورا لازمہ مل گیا اور صرف اتنی اصلاح کی ضرورت رہ گئی کہ بیچ کا بُت خانہ ہٹا کر مغرب کی جانب دیوار اٹھا دی جائے اور اس میں محراب بنا دی جائے کہ حسب احکام قرآنی، مسلمان قبلہ رُو ہو کر نماز ادا کر سکیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے کبھی ہندوستان میں اتنی سی ترمیم پر اکتفا نہیں کیا۔ اور جن دو مسجدوں کا ہم ذکر کر رہے ہیں، کم سے کم، ان میں تو بانیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ پرانے ستون کے سامنے ایک اور سلسلہ کمانوں کا تیار کیا جائے جس کی زیب و زینت اور کندہ کاری میں ہندوستانی صنعت کا پورا کمال صرف کر دیا جائے۔ اور حق یہ ہے کہ اس میں انھیں بڑی کامیابی ہوئی۔ اسلامی کمانوں کے صاف اور سادہ خط سے جو عظمت و جلال برستا ہے اس نے مندر کے چھوٹے چھوٹے حصّوں کو ماند کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ گو نقش و نگار کی اتنی کثرت ہے کہ کسی دوسرے نمونے میں جہاں تک

۱۹۸

علم ہوسکا اتنے نقش و نگار نہیں ہیں، تاہم انھیں اتنا چپٹا رکھا ہے کہ تعمیر کے صاف خطوط میں کہیں خلل یا انقطاع واقع نہیں ہوتا۔ باہر کے رُخ تو ممکن ہے کہ اتنا تفصیلی کام دوسری جگہ بھی ہو لیکن مشکل سے اس پیمانے پر کیا گیا ہوگا۔ مسجد ایا صوفیہ استنبول کے بعض اندرونی حصّوں میں اسی قدر خوشنما کام کیا ہے[۱] لیکن وہ صرف چند مربع گز میں ہے۔ قصر ماشتا اگر مکمل ہو جاتا[۲] تو اس کی ٹکر کا ہوتا لیکن وہ محض ایک ناتمام حصّہ ہے اور گو خسرو پرویز اور ہارون الرشید کے عہد کے مابین، ایران میں بے شک ایسی عمارتیں ہونگی جو اس کے ہم پلہ ہوں، اگر وہ منہدم ہو چکیں یا کم سے کم ہمارے علم میں نہیں ہیں۔ دوسرے طرز عمارت کے لحاظ سے وہ ان ہندوستانی مسجدوں جیسی نہ ہو سکتی تھیں۔ ان میں فن کی بعض بہترین اصناف سے عجیب و غریب طریق پر کام لیا ہے جیساکہ پہلے ہندو صناع کیا کرتے تھے اور بعد میں مسلمان فاتحوں نے ان کو استعمال کیا۔

دہلی

پرانی دہلی اور اجمیر کی مذکورۂ بالا دو مسجدوں میں دہلی والی مُقدم ہے کہ اجمیر کی مسجد سے سات آٹھ سال قبل اس کی تعمیر شروع ہوئی اور وسعت میں بھی پہلی ہی زیادہ بڑی ہے[۳]۔ دوسرے اس کا قطب مینار اور اس عہد کے بعض خوبصورت ترین مقبروں سے تعلق ہے اور یہ سب مل کر ایسا مجموعہ بناتے ہیں کہ اجمیر میں

---

[۱] "ہسٹری۔۔۔۔ آرکی ٹیکچر"، اول، ۴۴۰ و مابعدہا

[۲] ایضاً ،، ۴۰۱ ،،

[۳] جنرل کننگ ہیم کی "آرکیولوجیکل رپورٹس" جلد دوم، ۲۶۰۔ گو مسجد قوت الاسلام دہلی کا اندرونی صحن ہی پہلے مسجد کا کل رقبہ تھا لیکن ان دونوں کے اصلی بانی، سلطان شمس الدین التمش کی زندگی ہی میں دہلی کے دالانوں کو اجمیر کے دو سو فیٹ طویل دالانوں کی نسبت بڑھا کر، ۳۸۰ فیٹ کر دیا گیا تھا۔ دونوں مسجدوں کا صحن پھر بھی یکساں رہا۔ البتہ کل رقبہ اجمیر میں ۷۲ ہزار اور دہلی میں ایک لاکھ ۲۵ ہزار فیٹ ہو گیا۔

اس کے مقابلے کی کوئی چیز موجود نہیں۔ مزید برآں دہلی کے کھنڈروں کو محل وقوع
ایسا خوش نما ملا ہے کہ نظیر نہیں رکھتا کیونکہ یہ پہاڑی کے ایک خفیف سے تدریجی
ڈھلان پر واقع ہیں جس کے نیچے ایک میدان پھیلا ہوا ہے جو بظاہر کسی زمانے میں
جھیل ہوگا لیکن بعد میں ایشیا کے تین دارالسلطنتوں کا مقام بنا۔ سامنے کے رخ تغلق آباد
یعنی ایک قدیم پٹھان سردار کا شکستہ قلعہ واقع ہے اور اس سے بھی آگے شمال
کی طرف آخری پٹھان اور پہلے مغل بادشاہوں کے پائے تخت، یعنی فیروز آباد اور
اندرپت کے کھنڈر دور تک چلے گئے ہیں۔ اس کے پار، قدیم دہلی سے تقریباً دس میل
کے فاصلے پر نئے پائے تخت شاہجہاں آباد کے بروج و مینار نظر آتے ہیں جہاں 199
۱۸۵۷ء تک مغلوں کی برائے نام بادشاہی کا مستقر تھا۔ اور آگے شمال میں بڑھیں
تو انگریز عہدہ داروں کا محلہ اور قدیم انگریزی چھاؤنیوں کے شکستہ آثار ہیں۔ خوش قسمتی
سے یہاں انگریز عہدہ داروں نے پرانے کھنڈروں میں سکونت اختیار نہیں کی جس طرح
آگرے میں ہوا، ورنہ دہلی کے آثار قدیمہ بھی سلامت نہ رہتے اور بلاشبہ ان کے سنگ مرمر
کے ستون تو ضرور اڑائے جاتے اور انھیں بلا لحاظ موزونیت کے جہاں ضرورت ہوتی ہا
لگا دیا جاتا اور ان قدیم آثار کے قیام و بقا کی مطلق پروا نہ کی جاتی۔ کھنڈروں سے
انگریزوں کے دور رہنے اور ان کے بچ جانے کے باوجود بھی مشہور و معروف
شالامار باغ کی ابنیہ کہ انگریزی محلے کے قریب یہی قدیم عمارات کچھ خصوصیت اور وقعت
رکھتی تھیں، مدت ہوئی کہ بے نشان ہوگئی ہیں۔[1]

خاص خاص کھنڈروں کا محل وقوع ذیل کے خاکے سے سمجھ میں آسکے گا جو
نہایت احتیاط سے تیار کیا گیا ہے اگرچہ اس کا پیمانہ اتنا چھوٹا رکھنا پڑا کہ اس کی تمام
خصوصیات نمایاں نہیں ہو سکتیں۔ بہر حال اصل خاکہ پیش کرنے سے قبل بڑی بڑی
عمارتوں کا موقع مختصر طور پر بیان کر دینا مناسب ہے:۔ مغرب کی جانب خاکے میں

۱۔ نئی دہلی کی عمارتیں قطب اور شاہجہاں آباد کے درمیان اسی رقبے میں بن رہی ہیں جس کے محفوظ رہنے پر
مصنف اس قدر خوشی کا اظہار کرتا ہے لیکن غنیمت ہے کہ آج کل آثار قدیمہ کے ساتھ ایسی بیدردی روا نہیں
رکھی جاتی جس کا مصنف نے جا بجا رونا رویا ہے۔ مترجم

اندر جو صحن دکھایا ہے وہ قطب الدین کی اصلی اور پہلی مسجد ہے جس کا رقبہ، دالان چھوڑ کر، ۱۴۲ × ۱۰۸ فیٹ ہے اور اس کے غربی پہلو کے وسط میں لوہے کی لاٹھ استادہ ہے۔ بڑا دروازہ ایک گنبد کے نیچے ہے جس کا قطر جانب مشرق ۲۰ فیٹ کے قریب ہے اور اس کے برابر ستونوں کی چوہری قطار دے کے مسقف بنایا ہے۔ آخری قطار عقبی دیوار سے ملی ہوئی چلی جاتی ہے۔ شمال اور جنوب کے سروں پر بمنزلہ بارہ دریاں بنی ہوئی ہیں۔ پہلو کے مسقفوں میں ستونوں کی تین قطاریں دی ہیں اور سروں پر خالی راستہ چھوڑ دیا ہے اگرچہ اس مسقف کا مغربی حصّہ اور بڑا دروازہ اب ٹوٹ پھوٹ کے غائب ہو چکا ہے۔ بمشرقی نصف کی بھی صرف ۲۰ گز کے قریب دیوار اور دالان کا ایک حصّہ سلامت ہے۔ جس کے ستون دوسرے پہلوؤں کی نسبت بہت سادہ ہیں۔[1] صحن کے غربی سرے پر حجابی دیوار آٹھ فیٹ آثار کی ہے جس میں عظیم الشان کمانیں بنائی ہیں اور یہ اصل مسجد کے در ہیں جو ۱۳۵ فیٹ لمبی اور ۳۲ فیٹ چوڑی تھی مگر اب بالکل منہدم ہو چکی ہے اور سوائے بیس بائیس ستونوں کے جن پر چھت قائم تھی، اور کچھ باقی نہیں رہا۔ صحن مسجد کے جنوب مشرقی گوشے پر قطب مینار بنا ہوا ہے جو اسی مسجد کے ساتھ کی تعمیر ہے۔[2]

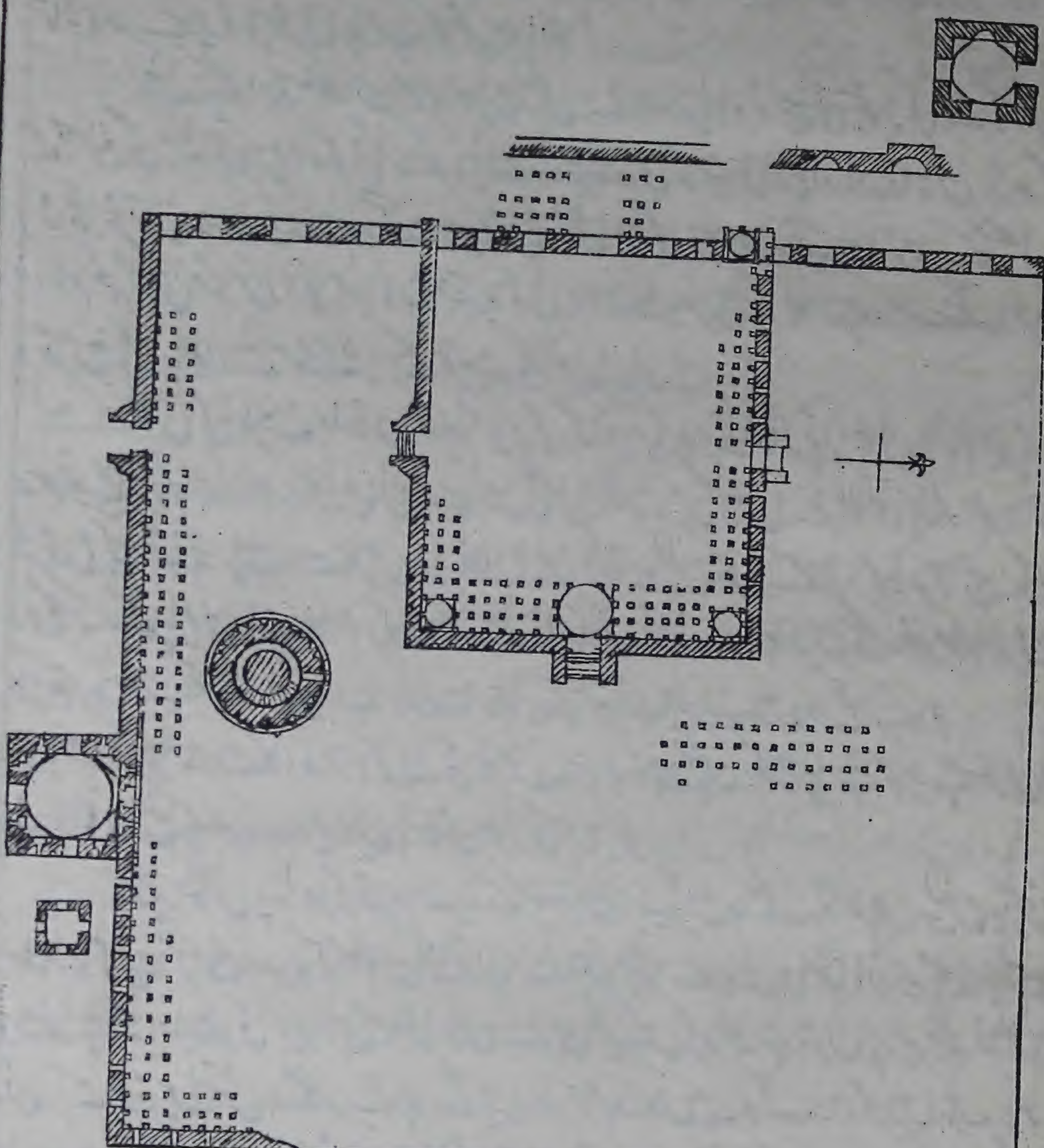
۲۰۰ سلطان شمس الدین التمش نے ۱۲۲۵ء کے قریب، بڑی دیوار کو شمال و جنوب دونوں طرف ۱۱۹ فیٹ بڑھا کے پانچ پانچ کمانوں کا اور اضافہ کر دیا تھا جو قطب الدین کی کمانوں سے عرض و ارتفاع میں مختلف ہیں اور نقاشی بھی ان پر دوسری طرح کی

---

[1] کار اسٹیفن "آرکیولوجی اوف ڈلہی" میں (صفحہ ۴، حاشیہ) لکھتا ہے کہ گزشتہ صدی کے اوائل میں میجر اسمتھ، اگزیکیٹو انجنیر نے اسی دالان اور اس کی عقبی دیوار کو "حیرت انگیز بے احتیاطی کے ساتھ دوبارہ بنایا اور مسجد کے مشرقی دروازے کے سامنے التمش کے توسیع کئے ہوئے حصّے کے ستون اس کام کے لئے استعمال کئے۔" اسی کے ساتھ اس "ترتیب جدید" کے سلسلے میں، قطب الدین کے بنوائے ہوئے دریچے تک کھنبہ نہیں رہنے دیئے۔

[2] صحن مسجد کے مشرقی دروازے کے کتبے میں سنہ بنا ۱۱۹۱ء (یا ۱۱۹۳ء) درج ہے لیکن شمالی دروازے کے کتبے میں لکھا ہے کہ اس عمارت کا آغاز ۱۱۹۶ء میں ہوا۔ کننگ ہیم۔ رپورٹس۔ اوّل، ۱۸۵ و ۱۸۶۔

کی گئی ہے۔ اصل میں یہ صدر دالان کے دونوں پہلوؤں پر جو جدید عمارت بنی اس کی روکاریں



تصویر ۳۶۹ ۔ خاکہ آثار قدیمہ دہلی قدیم

ہیں۔ ان میں سے شمالی توسیع کی عقبی دیوار اور وسطی اور پہلو کی ایک محراب کی جگہ ابھی تک باقی ہے۔ اسی طرح توسیع کردہ صحن کی جنوبی دیوار مع اپنے مسقف کے قائم ہے؛ مگر مشرقی مسقف کے صرف چند ستون رہ گئے ہیں جن سے اتنا ضرور معلوم

ہو جاتا ہے کہ جدید صحن اپنے دالانوں سمیت شمالاً جنوباً ۳۷۰ اور شرقاً غرباً ۲۲۰ فیٹ تھا، اور اس کے اندر قطب مینار بھی آگیا تھا۔ التمش کا مقبرہ اسی توسیع کردہ مسجد کے شمالی سرے پر ذرا مغربی جانب کو تعمیر ہوا ؎

اس کے بعد سلطان علاء الدین خلجی نے اور زیادہ توسیع کی تجویز کی اور التمش کے صحن کی مشرقی دیوار کوئی ۱۵۰ فیٹ اور ہٹادی کہ جنوبی دیوار اور دالان بڑھ کر (شرقاً غرباً) ۳۸۵ فیٹ ہو گئے۔ اسی رُخ خوشنما علائی دروازہ تعمیر ہوا جس کے متصل "امام محمد علی ضامن" کا چھوٹا سا مقبرہ کوئی ۲۴ فیٹ مربع بنا ہوا ہے۔ سنگ مرمر و سُرخ کی یہ عمارت ۱۳۲۵ء کے قریب کی تعمیر ہے ؎

شمال کی طرف سلطان قدیم صحن کو دگنا کردینا چاہتا تھا کہ پورا طول (شمالاً جنوباً) ،سو فیٹ ہو جائے اور اسی خیال سے اس شمالی نصف میں اس نے علائی مینار بنوانا شروع کیا تھا جو پہلے سے عرض و ارتفاع میں دگنا ہو لیکن اس کے اور مجوزہ توسیع کی روکار کے پایوں کے سوا اور کوئی عمارت غالباً اس شمالی رُخ پر نہ بن سکی۔ خود علاء الدین کا مقبرہ جواب کھنڈر ہو گیا ہے، اس احاطے کے جنوب مغرب میں واقع ہے ؎

طرز عمارت کا اندازہ کرنے کی غرض سے یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ سب ستون، ہندوانی وضع کے اور سب دیواریں اسلامی طرز کی ہیں ؎

شاید سوال پیدا ہو کہ قدیم مندر کے ستون اب کس حد تک قائم ہیں لیکن یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کو مسلمان فاتحوں نے اپنی جگہ سے بدل دیا تھا اور یہ بھی بدیہی بات ہے کہ احاطے کی دیواریں مسلمانوں نے ہی تعمیر کیں کیونکہ بندشوں پر ہر جگہ خاص اُن کے طرز میں نقش و نگار بنے ہوئے ہیں اور تمام دروں میں نوک دار محرابیں ہیں جو ہندوؤں نے کبھی نہیں بنائیں۔ غرض مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ساری عمارت اس شکل میں مسلمانوں ہی کی بنائی ہوئی ہے جس میں اب ہم اسے دیکھتے ہیں۔ قنوج کی مشہور مسجد بھی اصل میں ہندو یا جینی مندر تھی جس کو مسلمانوں نے بالکل قدیم قاہرہ کی مسجد عمرو کے نقشے پر از سر نو مرتب کیا؎ اس کے گنبد اور چھتیں سب جینی طرز کی ہیں۔

؎ ہسٹری... ارکی ٹیکچر" دوم صفحہ ۵۲۹ شکل ۷۷–۹۷۱ ۔

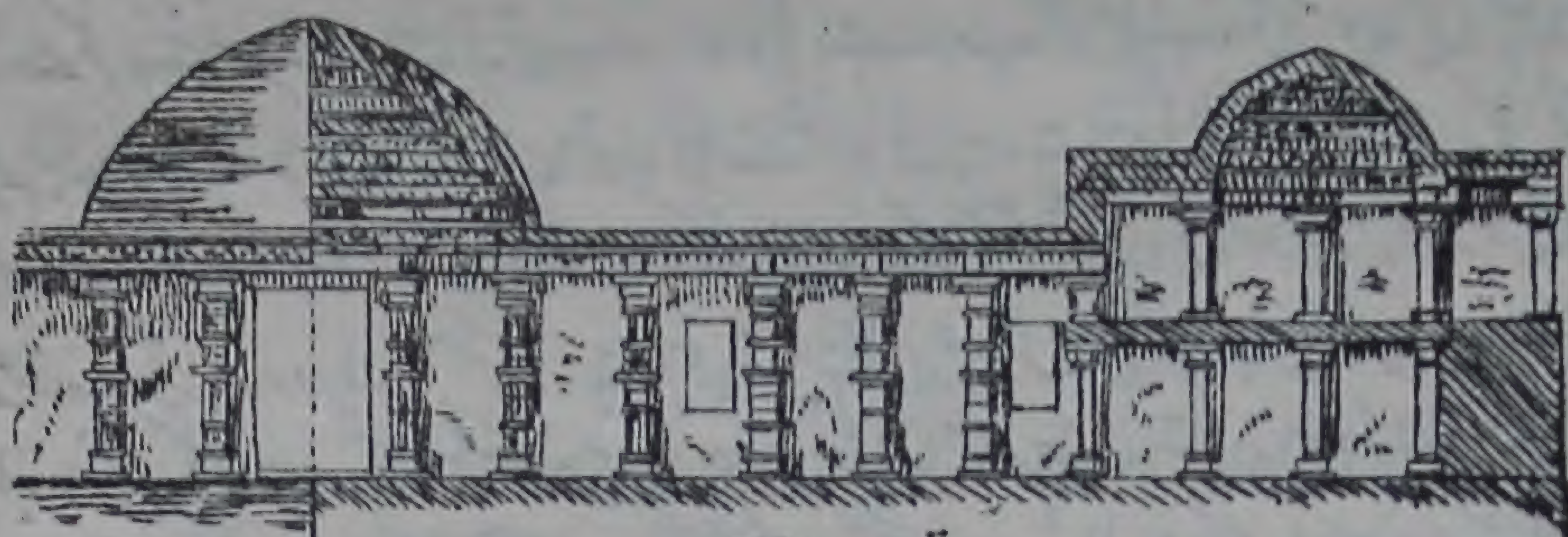
اور اندر اسلامی طرز کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی لیکن باہر کے رُخ طرز تعمیر خالص
اسلامی ہے۔ منڈو کے قریب دھار میں بھی ایک مسجد قریب زمانے کی تعمیر ہے اور
کچھ شک نہیں کہ اسے کسی قدیم ہندو یا جینی مندر کو از سر نو ترتیب دے کے بنایا ہے،
اسی طرح جونپور اور احمد آباد وغیرہ مقامات پر ایسی مسجدیں موجود ہیں جن میں پہلے مصالح
کو لے کر نئے سرے سے ترتیب دے دیا ہے۔ اب اگر قطب کی مسجد میں پہلے ستون
قدیم جگہ پر رہنے دیئے گئے ہیں، تو یہ ایک استثنائی صورت ہوگی[1] لیکن اس کا قرینہ ۲۰۲
نہ ہونے کے باوجود، میں یہ گمان کئے بغیر نہ رہ سکا کہ گوشوں کی دو منزلہ اور حجابی دیوار
کے عقب کی بارہ دریاں، ممکن ہے اپنی قدیم جگہ پر چھوڑ دی گئی ہوں لیکن اس مسئلے پر ہم
دوبارہ اجمیر کی مسجد کے سلسلے میں (جہاں غالباً تمام ہندو ستون اپنی پُرانی جگہ سے
ہٹا کے از سر نو نصب کئے گئے ہیں) گفتگو کریں گے۔ بہر حال، اتنی بات ضرور یقینی ہے
کہ قطب کی مسجد میں بعض ستون غیر مصالحے کے ہیں اور یہ کہ مسجد بنانے والوں نے
انھیں جہاں نصب کیا تھا، اب تک وہ اسی جگہ قائم ہیں۔ اس مقام پر یہ تصریح
غالباً ضروری ہے کہ ان عمارتوں کو اپنی پرانی جگہ سے ہٹانے اور دوسری جگہ بنانے میں
کچھ دشواری پیش نہیں آسکتی۔ کیونکہ ستونوں کے جوڑ ایسی صحت کے ساتھ بٹھائے ہیں،
کہ ہندوؤں کا صبر و استقلال ہی اس کام کو انجام دے سکتا تھا۔ پھر چھت کا ہر ٹکڑا
نو نو سلوں سے بنایا ہے جس میں چار مستطیل نما، چار زاویہ دار اور ایک وسطی تختی ہے
(جیسا کہ پہلی جلد کی شکل ۱۷۴ میں ہم بیان کر آئے ہیں) اور یہ سب بغیر گچ یا مصالحے
کے اس طرح جمائی ہیں کہ آسانی سے نکال کر دوسری جگہ جمائی جا سکتی ہے۔ برجیوں کا بھی

---

[1] جنرل کننگ ہیم کو دیوار پر ایک کتبہ ملا جس میں تحریر تھا کہ اس ایک مسجد کے واسطے ہندوؤں کے ستائیس مندر منہدم کئے گئے۔ (رپورٹس۔ اول۔ ۱۷۶) لیکن جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ جو مندر توڑے گئے وہ کس قسم کے تھے، اس وقت اتنی بات سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ مثلاً گھنٹے کو چھوڑ کر کھجراہو کے ستائیس مندر بھی کافی نہیں ہو سکتے کہ اس مسجد کے آدھے ستون بھی بہم پہنچا دیں۔ بخلاف اس کے سادری کے قریب رتن پور کا ایک ہی مندر پوری مسجد کے لئے قریب قریب کافی سامان فراہم کر سکتا ہے، اور گو یہ مندر قریب زمانے کا بنا ہوا ہے لیکن یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل ایسے مندر موجود نہ تھے۔

حال یہی ہے اور ان کے جوڑ ایسے صحیح اور الگ الگ ہیں کہ ہٹانے اور دوبارہ عمارت بنانے میں کوئی وقت یا خرابی نہیں ہوسکتی ہو

بڑے دالان کے نصف حصے کی تصویر ذیل سے اس کی صورت کا بخوبی اندازہ ہوسکے گا۔ یہ دالان



تصویر ۳۹۔

بڑی کمانوں کے مقابل بنا ہوا ہے اور ترتیب کے لحاظ سے اس قدر خالص جینی ہے کہ شاید ہم کو جینی طرز عمارت کے ذکر میں اس کا بھی حوالہ دینا چاہئے تھا لیکن ہندوستان کی سب سے پہلی مسجد میں ہونے کے باعث زیادہ بہتر یہی ہے کہ اس جگہ اس کا ذکر آئے۔ دالان کے ستون اسی درجے کے ہیں جیسے کوہ آبو کے مندر میں استعمال کئے گئے ہیں لیکن ان دہلی والوں پر بہت زیادہ اور باریک نقوش ہیں۔ ان میں سے اکثر غالبا گیارہویں، بارہویں صدی عیسوی کے ہیں اور ہندوستان کے اُن چند نمونوں میں، جن پر حد سے زیادہ نقش ونگار بنے ہوئے ملے ہیں، ان کا بھی شمار ہے۔ گردنے سے لے کے بنیاد تک ایک انچ بھی جگہ نقوش سے خالی نہیں ہے سوائے ان ستونوں کے جو جالی دیوار کے عقب میں ہیں یا چند اور کے، جو ممکن ہے زیادہ پرانی عمارتوں سے لائے گئے ہوں۔ بایں ہم نقش ونگار کو ایسی صفائی اور چابکدستی سے تراشا ہے، اور اس شکستگی وکہنگی کے باوجود وہ ایسے قابل دید اور خوشنما ہیں کہ ان کی عیب جوئی کرنا سخت گراں گزرتا ہے۔ بعض صورتوں میں وہ تصویریں اڑادی گئی ہیں جو وسط ستون میں کندہ تھیں، اور مسلمانوں کو تصادیر کے بارے میں جو تشدد

ہے اس سے آشتی نہ رکھتی تھیں لیکن چھت اور دوسرے الگ ہٹے ہوئے حصوں میں جینی
مذہب کی چار زانو تصاویر اور اس مذہب کے دوسرے نشانات کندہ کئے ہوئے،
ابھی تک دکھائی دے جاتے ہیں ؎

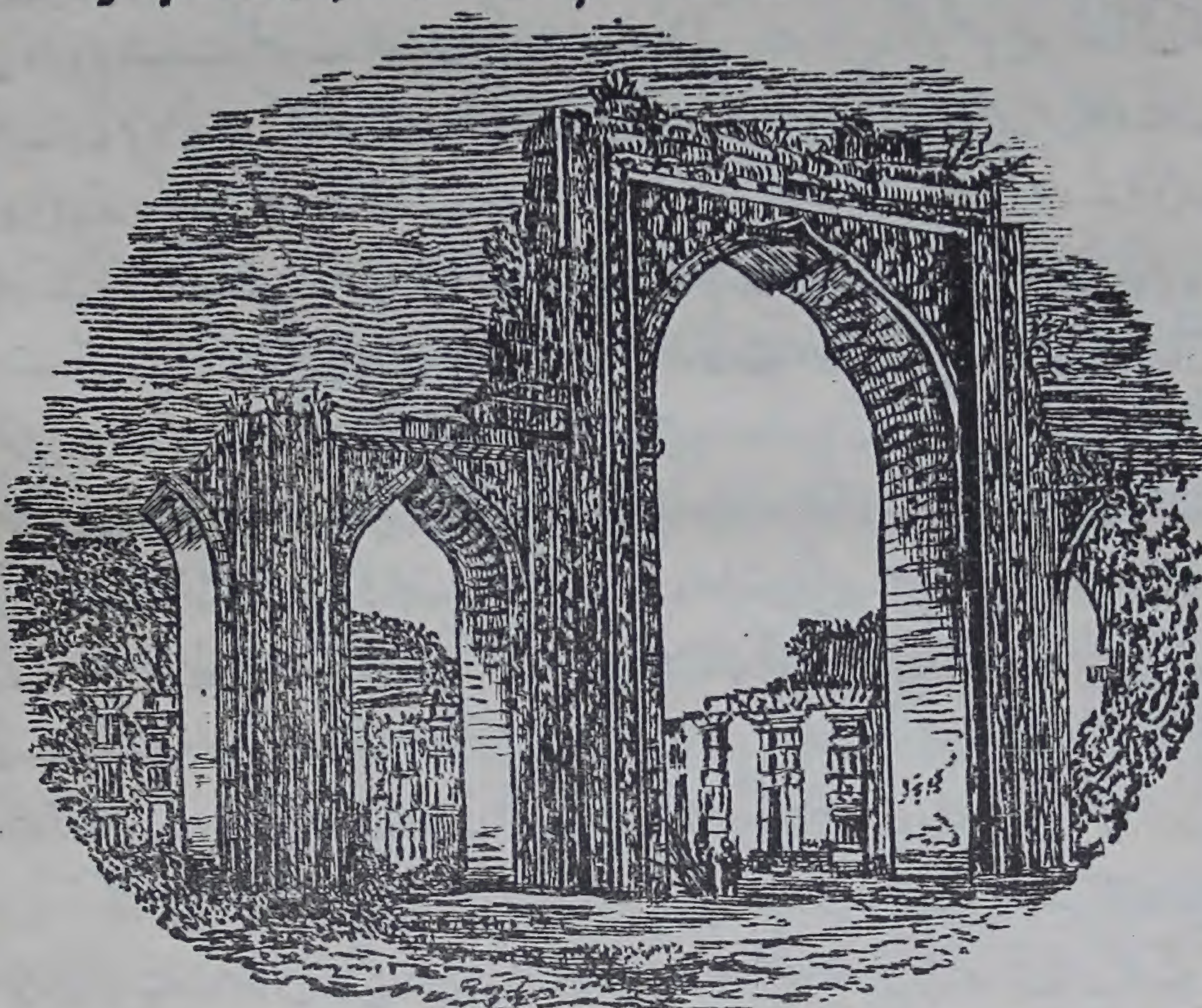
لیکن مسجد کی شان و خوبی ان ہندوانی آثار سے نہیں ہے بلکہ مغرب کی ۲۰۳
طرف محرابوں کے وسیع سلسلے سے ہے جو ۳۸۵ فیٹ تک شمالاً جنوباً چلی گئی ہیں۔
اور جن میں تین بڑی اور آٹھ چھوٹی کمانیں ہیں۔ وسطی ۲۲ فیٹ چوڑی اور ۵۲ فیٹ اونچی
ہے۔ پہلو کی بڑی کمانوں کا عرض $24\frac{1}{2}$ فیٹ اور بلندی، وسطی کمان کے قریب ہے۔
چھوٹی کمانوں کا عرض وارتفاع نصف کے قریب ہے اور افسوس ہے کہ یہ بہت شکستہ
ہو گئی ہیں۔ (ملاحظہ ہو آیندہ تصویر) بیان کرتے ہیں کہ اس سلسلے کا وسطی حصہ جو طول
میں ۱۴۷ فیٹ ہے، قطب الدین ایبک نے غزنی سے واپس آکر تعمیر کیا تھا۔ اس کے
عقب میں، ۳۲ فیٹ کے فاصلے سے مسجد کی پشت کی دیوار کے آثار ہیں جس کا ارتفاع
شاید اسی قدر رکھنا منظور تھا کہ ان ہندو ستونوں کی چھت تک پہونچ جائے جو اس
دیوار کے اندر آ گئے ہیں۔ قرینہ کہتا ہے کہ ۱۱۹۶ء میں صرف ان ہندو ستونوں پر
چھت ڈالنے کی تجویز تھی جو ان دو حجابی دیواروں کے درمیان ہیں کیونکہ ان میں سے
بعض بڑی کمانوں کے عقبی حصے میں بنے ہوئے ہیں اور ان کے اوپر کا سرا بالکل صاف
اور چکنا ہے اور ان کے اوپر کسی قسم کی چھت یا لداؤ ڈالنے کا ارادہ نہیں پایا جاتا۔ حقیقت
میں مسجد کے لئے چھت کا ہونا لازمی نہیں ہے۔ صرف ایک دیوار قبلہ رُو درکار
ہوتی ہے اور ہندوستان میں اکثر مسجدیں ایسی ہی بنائی گئی ہیں اگرچہ نماز میں خلل
نہ پڑنے کے خیال سے اکثر احاطہ کھینچ دیا جاتا ہے[1] مسقف دالان ظاہر ہے کہ سہولت
اور خوشنمائی کے لئے بنا دیئے جاتے ہیں ورنہ یہ ناگزیر ہرگز نہیں ہیں ؎

اس مسجد کی تعمیر ہی اس کی جو تاریخ سناتی ہے وہ کچھ کم قابل تعجب نہیں ہے
معلوم ہوتا ہے، افغان فاتح اس بات کا تو خاصا واضح تصور رکھتے تھے کہ نو کدار

---

[1] مصنف کا مطلب عیدگاہوں سے ہوگا، ورنہ پختہ مسجدیں بغیر مسقف کے کہیں نہیں بنائی جاتیں۔
مترجم۔

محرابیں عمارت کے درون کی سب سے صحیح صورت ہیں لیکن اس صورت کو تیار کرنے کا طریقہ انھوں نے ہندو راج معماروں پر چھوڑ دیا جنھیں اس کام کے واسطے رکھا گیا تھا۔ ہندوؤں نے اس وقت تک محرابیں کبھی نہ بنائی تھیں اور نہ آیندہ صدیوں بعد تک بنائیں۔ لہٰذا انھوں نے نوکدار کمانوں کو اسی اصول پر تعمیر کیا جس پر اپنے ہاں کے گنبد بنایا کرتے تھے یعنی جہاں تک سیدھا لے جا سکتے تھے وہاں تک سیدھا لے گئے اور پھر بڑی بڑی سل کی پٹیاں رکھ کر انھیں سرے پر ملا دیا۔ اور یہ وہ طرز ہے جو قطب کولم[۲] کی بدر روکی کمان میں استعمال کیا گیا ہے۔ کمانوں کے سامنے کے رخ نقش و نگار بنانے کی خدمت بھی انھی معماروں کے سپرد ہوئی اور انھوں نے اس طرح انجام دی کہ مقابل میں صحن کے دوسری طرف جو حاشئے اور ستونوں کے نقش بنے ہوئے تھے انھی کی نقل و تکرار سے پوری کمان کو نہایت باریک



۲۰۴

[۱] "افغان فاتح" سے یہاں ابتدائی ترک سلاطین مراد ہیں۔ مصنف کا یہ مفروضہ بھی کہ مسلمان فاتح اپنے ساتھ راج معمار نہیں لائے تھے صحیح نہیں اور قدیم تاریخوں سے اس کے خلاف شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مترجم نمبر (۲) بر صفحہ دیگر

اور نازک قیتوں کی کندہ کاری سے معمور کردیا کہ سوائے اجمیر کی مسجد کے اور کہیں ایسا کام نہ پہلے بنا تھا نہ بعد میں بنایا گیا۔ اور گو اس پیمانے پر نقاشی کرنا بڑی حد تک اسے ضائع کرنے کے مرادف ہے، تاہم اس قسم کی صناعی میں اس کی نظیر، بلا استثنا ۲۰۵ کہیں نہیں ملتی۔ چونکہ یہ پتھر خاص طور پر سخت اور عمدہ تھا، اس کے نقوش کی تازگی آج تک باقی رہی۔ البتہ کمانوں کے اوپر کے نقوش خراب ہوگئے۔ جہاں ہندوؤں کی ناقص تعمیر نے اسے وقت سے پہلے بگاڑنے کا سامان بہم پہنچا دیا تھا۔

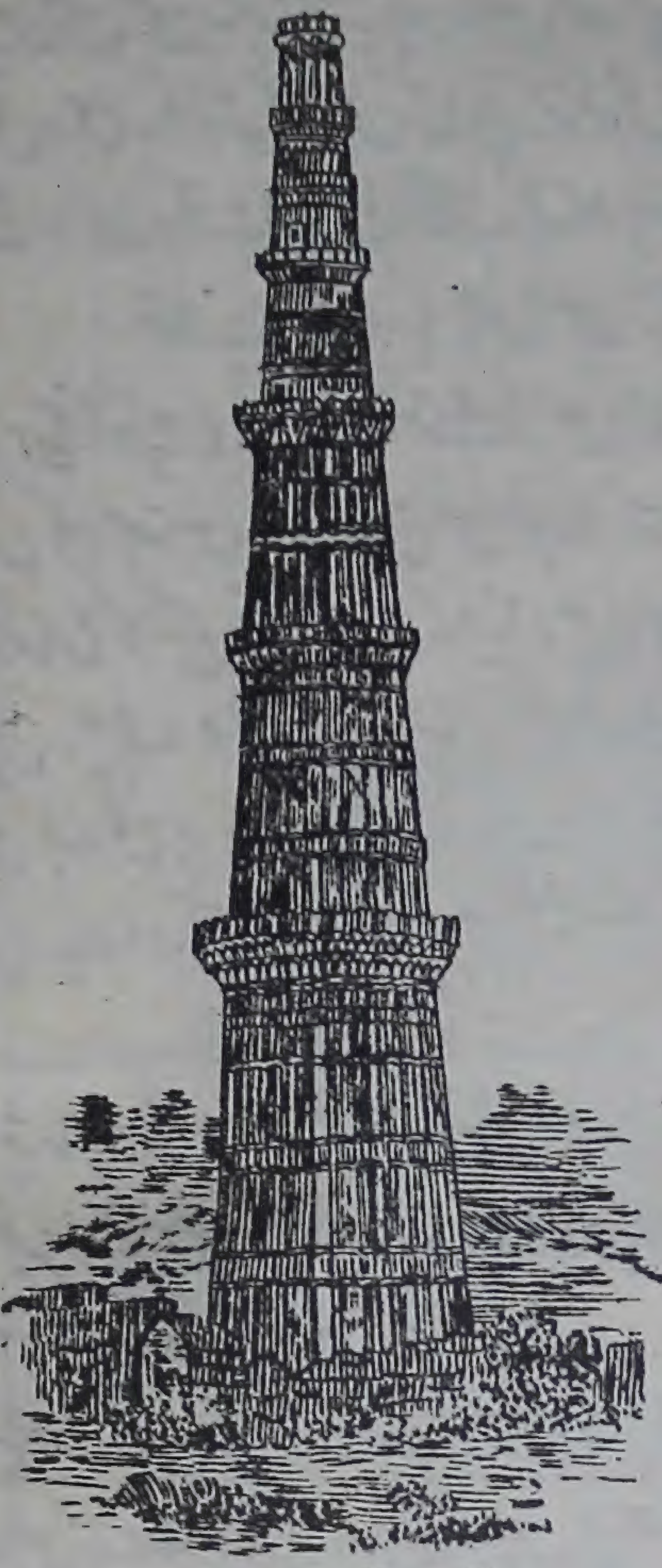
قطب مینار، یا پہلی مسجد کے جنوب مشرقی گوشے کا مینار، نیچے، ۴۷ فیٹ ۴ انچ قطر میں ہے اور ۱۷۹۴ء میں ناپا گیا تو بلندی ۲۴۲ فیٹ تھی[۱]۔ اس وقت بھی اس کی چھتری ٹوٹ چکی تھی لہذا دس یا بیس فیٹ اور جمع کرنے چاہئیں کہ اس کے اصلی ارتفاع کا صحیح اندازہ ہو۔ مینار میں چار خوب آگے بڑھے ہوئے چھجے یا جھروکے ہیں۔ پہلا، ۹۰ فیٹ دوسرا ۱۴۸ فیٹ تیسرا ۱۸۰ فیٹ اور چوتھا زمین سے ۲۱۴ فیٹ کی بلندی پر ہے اور ان کے درمیان ابھری ہوئی پٹیوں پر بہت گنجان سنگ تراشی کی ہے اور کتبات کندہ ہیں[۲]۔ نیچے کے درجے کے چوبیس بل (یا پنج) گولائی کو

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ [۲] جیسا کہ "ہسٹری... ارکی ٹکچر" جلد اول (ص ۳۰۱) میں صراحت کی گئی ہے، یہ طریق تعمیر صرف اس وقت مناسب ہوتا ہے جب کہ ان پٹیوں سے جیسی یہاں لگائی گئی ہیں، زیادہ بڑے پتھر استعمال کئے جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں نے اس کمان کو دیکھا اور نقشہ لیا تو وہ سخت شکستہ حالت میں تھی۔ حکومت نے بعد میں اسے احتیاط سے دوبارہ قائم کرا دیا ہے لیکن پہلو کی دو کمانیں یا تو مکمل ہی نہ ہوئی تھیں اور یا اسی فاسد طرز تعمیر کے باعث گر پڑیں۔

[۱] ایشیاٹک ریسرچز۔ پنجم، ۲۱۳۔ جنرل کننگ ہیم کے بقول (اوپر کی جدید چھتری کو چھوڑ کر) اس کی بلندی ۲۳۸ فیٹ ایک انچ ہے۔ رپورٹس اول ۱۹۶۔

[۲] پہلے درجے میں کتبات کی چھ پٹیاں ہیں۔ نیچے کی پٹی پر قطب الدین ایبک کے نام اور القاب، دوسری پر سلطان محمد ابن سام کے القاب و اوصاف، تیسری پر قرآن شریف کی ایک آیت اسی طرح پانچویں پٹی پر آیات کریمہ اور پانچویں پر سلطان محمد ابن سام کی توصیف کندہ ہے۔ اذان دوسرے درجے پر چڑھ کر دی جاتی تھی۔ دیکھو ارکیولوجی آف دہلی صفحہ ۵۰ وغیرہ۔

پورا کرتے ہیں۔ جن میں ایک کمر کی اور دوسرا مدور ہے۔ دوسرے درجے میں سب مدور
اور تیسرے میں سب کمر کی ہیں اور باقی حصہ مینار کا سپاٹ اور بیشتر سنگ مرمر
کا ہے جس کے بیچ میں اسی سنگ سرخ کی پٹیاں جس سے نیچے کے تین درجے
بنائے ہیں، آجاتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو تصویر)



تصویر قطب مینار

یہ ٹھیک معلوم نہیں کہ یہ کمر کی بل (یا
ابھری ہوئی پٹیاں) خراسان یا آگے کے مغربی
ممالک کے میناروں سے نقل کئے گئے ہیں یا جینیوں
کے مندروں کی وضع دیکھکر انھیں ایجاد کیا ہے۔
غزنی کے میناروں کی بنیادیں دیکھ کر تو پہلے ۲۰۶
قیاس کی تائید ہوتی ہے لیکن میسور وغیرہ علاقوں
کے بہت سے اور خصوصاً جینی مندروں کی ستارہ نما
شکل یہ خیال دلاتی ہے کہ ممکن ہے اس وضع کا
ماخذ ہندوانی ہو۔ لیکن شمالی ہند میں ابتک
اس طرز کی عمارت نہیں ملی اور نہ گزشتہ انہدام
وشکستگی کے باعث آیندہ ملنے کی امید ہو سکتی ہے۔
بہر نوع مجموعی طور پر یہ کہنا غالباً مبالغہ نہو گا کہ
قطب مینار اس طرز کی عمارتوں میں سب سے
خوبصورت ہے۔ اکثر حضرات کو فوراً فلورینس کی
لاٹھ کا خیال آئے گا جو گیوٹو نے بنائی اور قطب مینار
کی حریف ہو سکتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ
۳۰ فیٹ زیادہ اونچی ہے لیکن اول تو برابر میں گرجا
کے ڈھگو نے اس کا حسن خاک میں ملا دیا دوسرے
خوشنمائی کے باوجود اس کے نقشے میں وہ نازک خیالی اور نقش و نگار میں وہ کامل صناعی
کہاں جو قطب مینار کے ایک ایک بل میں نظر آتی ہے اس کے پہلوؤں کا زاویہ
ذرا اونچا رہتا تو غالباً خوشنمائی بڑھ جاتی مگر یہ بات صرف دور کے دیکھنے سے ذہن میں

گزرتی ہے۔ ورنہ صحنِ مسجد سے کھڑے ہوکر دیکھئے تو اس کی ساخت کامل ہے اور اپنے اطالوی حریف کی چوکور چارخانہ دار بناوٹ سے بہرصورت بہتر ہے۔

قطب مینار سے، جہاں تک معلوم ہے، مسلمانوں کی بنائی ہوئی صرف ایک عمارت بلندی میں زیادہ ہے یعنی قاہرہ کی مسجد حسن کا مینار[1] لیکن پرانی دہلی کا یہ مینار ایک مستقل اور بالکل جداگانہ عمارت کا مرتبہ رکھتا ہے اور صورت ظاہری میں کہیں زیادہ خوشنما اور بہ اعتبار اپنی تکمیل و ساخت کے نہ صرف اِس مصری حریف سے کہیں بہتر بلکہ جہاں تک میرا علم ہے دنیا بھر میں اس قسم کی عمارات میں سب سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ واضح رہے کہ قطب مینار صرف اس غرض سے نہیں بنایا گیا تھا جس غرض سے مسجدوں کے ساتھ کے مینار یا مأذنے عموماً تعمیر کئے جاتے ہیں۔ اور گو اس کے پہلے درجے پر چڑھ کر اذان دی جاتی تھی اور غالباً ایک مقصد اس کی تعمیر کا یہی ہوگا، تاہم دراصل یہ ایک فتح کی یادگار اور مسلمانوں کے غلبے کا نشان تھا جسے ہندو بخوبی سمجھ سکتے تھے[2]۔

اس مینار کے ۴۰۰ فیٹ شمال میں علاء الدین خلجی نے ایک دوسرا مینار ۱۳۱۱ء میں بنوانا شروع کیا جس کا محیط ۲۵۴ فیٹ اور پہلے سے دُگنا تھا۔ لیکن کرسی کے اوپر یہ صرف ۷۵ فیٹ اونچا بن سکا اور پھر ناتمام چھوڑ دیا گیا جس کی وجہ بظاہر یہی تھی کہ بانی کا ۱۳۱۶ء میں انتقال ہوگیا۔

ان سب عمارتوں کا سنہ بنا کافی صحت کے ساتھ ان کتبات سے معلوم ہوجاتا ہے جو ان پر کندہ ہیں[3]۔

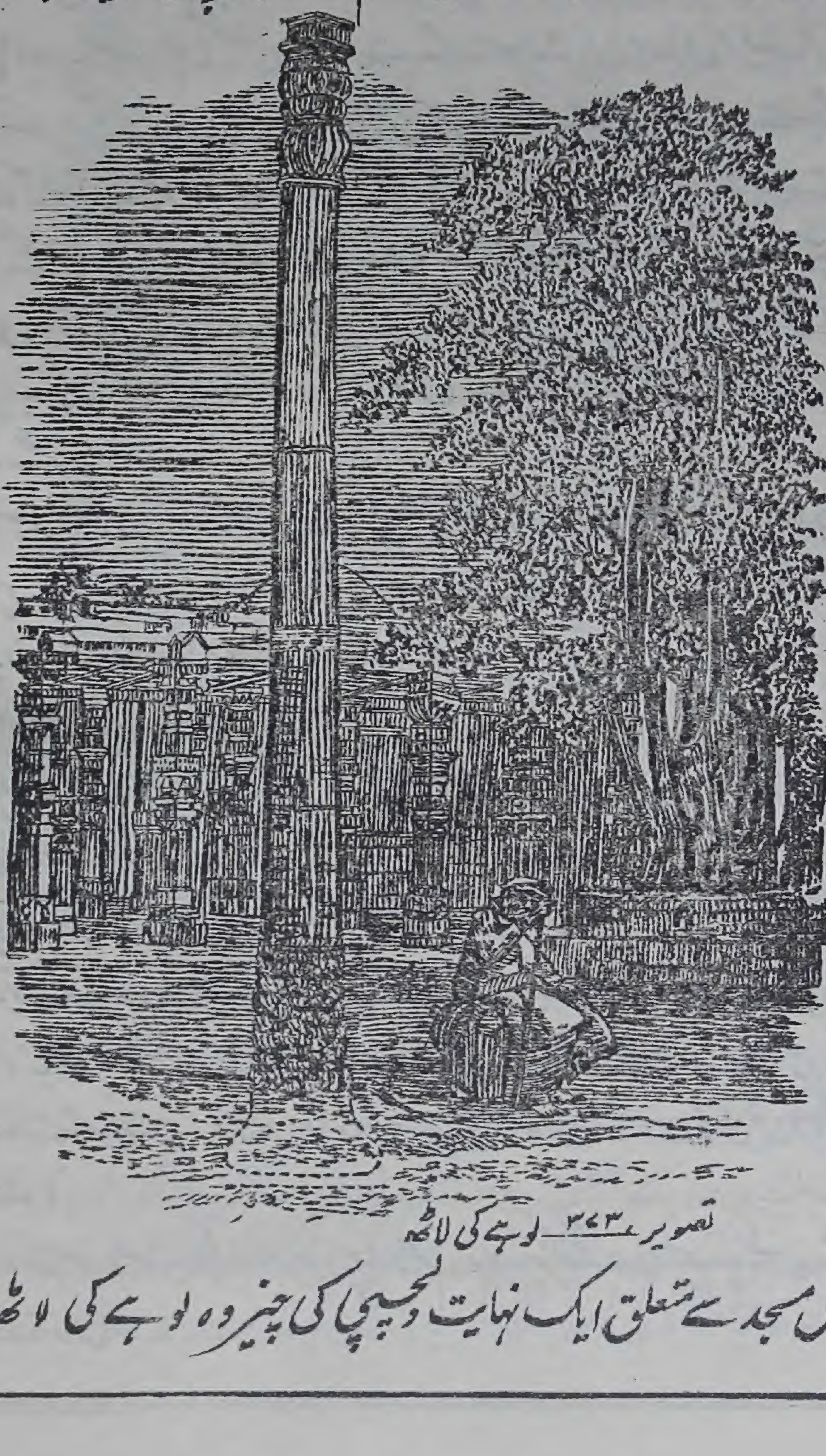
---

[1] ہسٹری ۔۔۔ ارکی ٹیکچر" دوم، ۵۲۲۔

[2] ایک قیاس یہ بھی کیا گیا ہے کہ یہ مینار خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار میں تعمیر کیا گیا تھا جو مسلمانوں میں ایک مشہور ولی گزرے ہیں اور ۱۲۳۵ء میں واصل بحق ہوئے (دیکھو راورٹی کے حواشی طبقات ناصری صفحہ ۶۲۱) خواجہ صاحب کی درگاہ مینار سے کوئی تین فرلانگ جنوب مغرب میں واقع ہے۔

[3] ترجمہ و آلٹرایور، ایشیاٹک رسرچز، چہاردہم، ۴۸۰۔ نیز کننگہم ریورٹس اوّل، ۱۳۲ وما یلیہا۔

اور انہی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اندرونی صحن کی چار دیواری سلطان شہاب الدین محمد
ابن سام نے بنوائی تھی۔ وسطی کمانوں کا سلسلہ قطب الدین ایبک نے، اور پہلو کے دالان شمس الدین
التمش نے تعمیر کئے، جس کا مقبرہ شمالی سلسلے کے عقب میں ہے اور قطب مینار کو بھی اسی بادشاہ نے
بنوایا یا مکمل کیا تھا۔ اس طرح تعمیر کا سلسلہ ۱۱۹۶ء سے ۱۲۳۵ء تک پھیلتا ہے جس کے بعد
وہ غالباً التمش کی وفات کے باعث اسی ناتمام حالت میں پڑی رہ گئیں ۔ ۲۰۷



تصویر ۲۷۳ — لوہے کی لاٹھ

اس مسجد سے متعلق ایک نہایت دلچسپ چیز وہ لوہے کی لاٹھ ہے جو ۲۰۸

اس کے صحن میں استادہ ہے (دیکھو تصویر بالا) زمین کے اوپر اس کی بلندی ۲۲ فیٹ ہے اور اب تحقیق ہو گیا ہے کہ زمین کے اندر صرف ۲۰ انچ دبی ہوئی ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس لاٹھ کا کل طول ۲۳ فیٹ ۸ انچ ہے[1] نیچے اس کا قطر ۱۶،۴ انچ اور اوپر سرے کا ۱۲،۰۵ انچ ہے۔ سر مینار $2\frac{1}{2}$ فیٹ اونچا ہے اور صاف و تراشیدہ صورت میں ایرانی وضع سے ملتا ہے جس سے لاٹھ اس عہد سے پہلے کی معلوم ہوتی ہے جس عہد میں فی الواقع تیار ہوئی تھی۔ دوسرے اسی سرے کو شلجمی وضع پر ڈھالا ہے جو کافی قدامت کا پتہ دیتی ہے لیکن یہ ٹھیک ٹھیک ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکا کہ اس کا اصلی زمانہ بنا کیا ہے۔ اس پر کتبہ کندہ ہے مگر تاریخ نہیں لکھی۔ پرنسپ نے حروف کی وضع دیکھ کر قیاس کیا تھا کہ یہ تیسری یا چوتھی صدی عیسوی کی ہے[2] اور اسی شہادت کی بناء پر بھاؤ داجی نے اسے پانچویں صدی کے اخیر یا چھٹی کے آغاز کی ساخت قیاس کیا[3] میرا اپنا عقیدہ

---

[1] اس کی پیمائش بھی ایک عجیب مثال ہے کہ ہندوستان میں بعض اوقات صحیح اطلاع ملنے میں کتنی دشواری پیش آتی ہے چنانچہ جب جنرل کننگ ہیم نے اپنی رپورٹس ۱۸۷۱ء میں شائع کیں تو بظاہر دہلی کے ڈپٹی کمشنر مسٹر کوپر کے بیان پر لکھ دیا کہ لاٹھ کی جڑ ۲۶ فیٹ نیچے تک کھودی گئی مگر اس کا سرا نہیں ملا" مگر جو شخص اس کام پر مقرر تھا۔ اس نے کننگ ہیم کو یقین دلایا کہ کھدائی ۳۵ فیٹ تک ہوئی تھی" (جلد اول ۹۶) جس کی بناء پر کننگ ہیم نے اس کا پورا ۶۰ فیٹ تخمینہ کیا مگر خوش قسمتی سے حکم دیا کہ دوبارہ کھدائی کی جائے اور ارادہ کر لیا کہ جڑ تک کھدوائے بغیر نہ رہوں گا۔ اس وقت حقیقت کھلی کہ سطح زمین سے صرف بیس انچ نیچے سرا موجود ہے (جلد پنجم ۲۸) سنگین فرش سے چند ہی انچ نیچے یہ لٹو کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور اس کا قطر ۲ فیٹ ۴ انچ ہو گیا ہے۔ یہ جڑ آہنی سلاخوں کے ایک پنجرے پر ٹکی ہوئی ہے اور سلاخوں اور فرش کے پتھروں کو سیسے سے جوڑ دیا ہے۔

[2] رسالہ ایشیاٹک سو، جلد ہفتم، ۶۲۹۔

[3] رسالہ شعبہ بمبئی رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ جلد ہم ۲۲۳۔ ڈاکٹر فلیٹ اپنی کتاب "انس کرپشنز اوف دی ارلی گپتاز" (حاشیہ صفحہ ۱۳۹) میں پہلے قول کی تصحیح کرتے ہیں کہ یہ کسی چندر راجہ کی بعد وفات فتوحات کی یادگار ہے مگر اس راجہ کا خاندان اور زمانہ کتبے میں کہیں درج نہیں۔

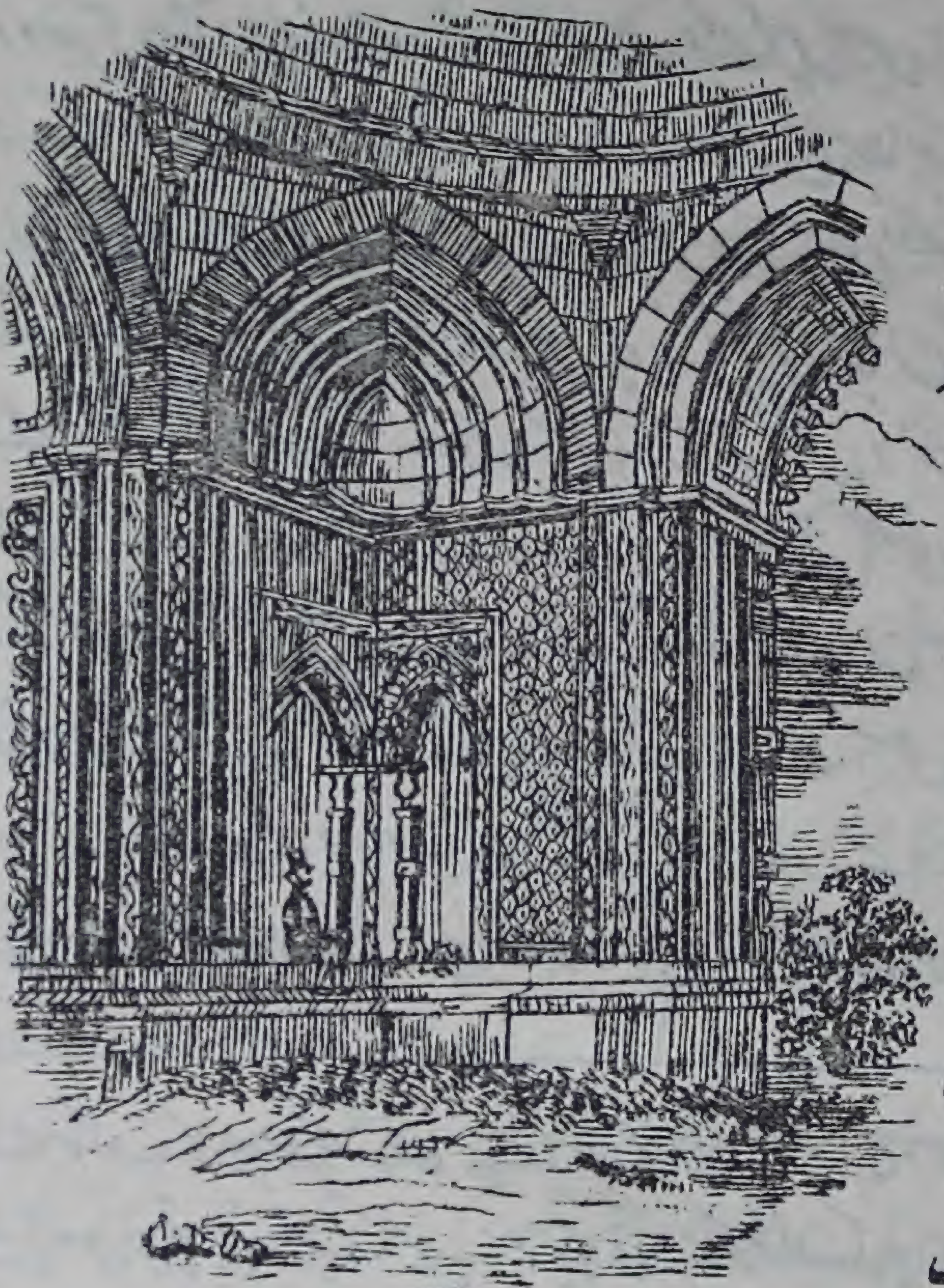
یہ ہے کہ یہ گپت خاندان کے چندر نامی کسی راجہ نے بنائی ہے اور اس حساب سے سنہ ۳۳۰ء یا سنہ ۴۱۵ء کے قریب کی بنی ہوئی ہے۔ سنہ ۴۰۰ء کو بین بین تاریخ سمجھ کر، جو حقیقت میں صداقت سے زیادہ بعید نہیں ہے، ہمیں اس حیرت انگیز کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس قدیم زمانے میں اہل ہند اتنی بڑی لوہے کی لاٹھ ڈھالنے کی قابلیت رکھتے تھے کہ زمانۂ قریب تک یورپ میں بھی اتنی بڑی لاٹھ نہیں ڈھل سکی تھی اور اب بھی عام طور پر نہیں ڈھلتی۔ پھر کنارک کے مندر کے پیش پر ہم انھیں کئی صدی بعد اسی قسم کی لاٹھوں سے چھت پاٹتے دیکھتے ہیں۔ تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس دھات سے ان کی واقفیت جس قدر پہلے تھی، بعد میں اتنی نہیں رہی۔ قریب قریب اسی درجہ حیرت انگیز یہ امر ہے کہ چودہ صدی تک باد و باراں کے تھپیڑے کھانے کے باوجود اس پر زنگ نہیں آیا اور سر مینار و کتبہ آج بھی ایسے ہی صاف اور ترشے ترشائے ہیں جیسے چودہ سو سال پہلے لاٹھ نصب کرنے کے وقت تھے[1]۔

جیساکہ کتبے سے معلوم ہوتا ہے یہ لاٹھ وشنو کی نذر کی گئی تھی اور اس میں شبہ کی گنجائش کم پائی جاتی ہے کہ اس کی چوٹی پر گروڑا کی مورت ہوگی جسے ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے ہٹوا دیا ہوگا۔ لیکن اس کا اصل مقصد، وشنو دیوتا کا جھنڈا نصب کرنا تھا کہ "واہلیکاوں[2] کو سندھو (دریا) کے ساتوں دہانوں کے پار شکست دینے کی یادگار رہے"۔ یہ کہنا عبارت آرائی میں داخل نہ ہوگا کہ یہ بھی
۲۰۹ عجیب اتفاق ہے کہ اسی ملک باختر کے لوگوں نے، جن کے اسلاف کو اہل ہند نے شکست دے کے اپنے ملک سے نکالا اور اس کی یادگار میں یہ لوہے کی لاٹھ نصب کی تھی، آٹھ سو برس بعد اہل ہند پر فتح پائی اور یادگار میں ہندی لاٹھ

[1] اس لاٹھ کے خالص لوہا ہونے میں کوئی شک نہیں۔ کننگ ہیم نے اس کے ایک ٹکڑے کی ہندوستان میں اور پھر ڈاکٹر پرسی نے ولایت میں تحلیل کی تو اسے خالص اور بے غش لوہا پایا۔

[2] کیا یہ واہلیکا وہی سیتھی لوگ تھے جنھیں شکست دے کر گپتا خاندان عروج حاصل کر سکا تھا؟ سنسکرت کتابوں میں واہلیکا سے عام طور پر بلخ یا باختر کے باشندے مراد ہوتے ہیں۔

دس گنا بلند مینار اسی صحن میں تعمیر کیا جہاں یہ پہلی لاٹھ نصب تھی!
مسجد کے شمال مغربی گوشے کے عقب میں ملا ہوا، بانی مسجد سلطان شمس الدین التمش کا مقبرہ ہے اس کے اندر صرف ۲۹ فیٹ ۶ انچ مربع کا حجرہ ڈھائی گز چوڑی چار دیواری اور چاروں رُخ دروازے ہیں۔ ہر چند یہ چھوٹی سی عمارت ہے لیکن پرانی دہلی میں ہندی صناعی سے اسلامی اغراض کیلئے جو کام لئے گئے ان میں اس سے بڑھکر پر تجمل نمونے کم ہوں گے۔ اور اگرچہ معماروں نے نئے مقاصد میں فن کی جزئیات سے کام لینے میں کسی قدر اناڑی پن دکھایا ہے، تاہم یہ بہت خوبصورت عمارت ہے بہت عرصے سے اس کی چھت برباد ہوگئی ہے اس لئے جیسی چاہیے شان باقی نہیں رہی لیکن حسن صنعت کی مثال ہونے کے علاوہ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جہاں تک معلوم ہوسکا یہ ہندوستان کا سب سے قدیم مقبرہ ہے۔ سلطان کا انتقال ۱۲۳۵ء میں ہوا ۱؎۔



تصویر نمبر ۳۲

اس سے بھی زیادہ خوبصورت نمونہ علائی دروازہ ہے جسے علاءالدین خلجی نے بنوایا اور اس کے کتبات میں سنہ بنا ۱۳۱۰ء مذکور ہے۔ گویا یہاں کی دوسری

۱؎ اسٹیفنز "آرکیولوجی اوف دہلی" ۷۴ و ۷۵۔ فن شاکی "دہلی پاسٹ اینڈ پریزنٹ" ۲۶۹ و ۲۷۰ ۔

عمارتوں سے یہ تقریباً سو برس بعد کا ہے۔ اور نام نہاد "پٹھان" طرز کے عہد عروج کی یادگار ہے جب کہ ہندی معمار بیرونی آقاؤں کی ضروریات کے مطابق اپنی اعلیٰ صناعی سے کام لینا سیکھ گئے تھے[1]۔ اس کی دیواروں پر اندر کے رُخ ایک قسم کا مشجر کندہ کیا ہے کہ حسن و خوبی میں جواب نہیں رکھتا۔ اس میں مربع بل کھا کے جس طرح مثمن بن جاتا ہے اور اس میں جو صوفیانہ حسن پایا جاتا ہے اس کی دوسری مثال ہندوستان بھر میں مجھے کہیں نہیں ملی۔ چاروں رخ نوک دار مفصل دے کے جو آویزے بنائے ہیں وہ باہم کمال مطابقت رکھتے ہیں اور ہر اعتبار سے ان کی جوابی ترتیب مناسب ہے[2]۔ بے شبہ بعض نقص پائے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ عمارت کے حصۂ زیریں میں اندر اور باہر کے رُخ جیسی گنجان گلکاری کی ہے ان کے لحاظ سے یہ نقش بالکل سادہ نظر آتے ہیں لیکن اُن میں نقش و نگار بڑھا دینے کچھ مشکل نہ تھے۔ لہذا ان کی سادگی خود گنبد کی سادگی کے مطابق سمجھنی چاہئے جو فی الواقع نیچے کی عمارت کے جوڑ کا بنا ہوا نہیں ہے۔ اس میں روشندان نہیں ہیں اور معلوم ہوتا ہے کاریگر نے یہہ فرض کر لیا تھا کہ اندھیرا رہنے کے باعث اس سادگی پر کسی کی نظر نہ جائے گی۔

یہ عمارت جو باہر سے نقشے کے اعتبار سے ۵۶ فیٹ ۹ اور اندر صرف ۳۴ فیٹ ۶ مربع ہے، مختصر ہونے کے باوجود دہلی میں پٹھانی طرز کا منتہائے کمال پیش کرتی ہے۔

[1] مؤلف کا یہہ مفروضہ غلط ہے کہ ان عمارتوں کے صنّاع و معمار لازماً ہندی تھے جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس موقع پر یہہ تنبیہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مؤلف کی پوری تحریر اس نظریہ پر مبنی ہے کہ اسلامی عمارتوں پر ابتدا ہی سے ہندی اثرات پڑ رہے تھے۔ حالانکہ یہہ خیال تاریخ اور درایت دونوں کے خلاف ہے۔ تازہ وارد مسلمانوں کے دل میں طبعاً اہل ہند کی اول اول کوئی وقعت نہ تھی اور ان کی ابتدائی تہذیب و معاشرت ہندی اثرات سے بالکل آزاد رہی۔ اس زمانہ میں انھوں نے جو عمارتیں بنائیں وہ بھی خالص اسلامی طرز کی اور وسعت و استحکام کے اعتبار سے نہایت ممتاز ہیں۔ البتہ آگے چل کے جس نسبت سے ہندی اثرات بڑھتے گئے۔ عمارتوں میں خالی نمائشی خوبی اور کمزوری نمایاں ہونے لگی۔ مترجم

[2] آویزوں کی یہ شکل مذکورۂ بالا عہد سے نو صدی پہلے سرستان میں بھی ملی ہے (دیکھو ہسٹری.... ارکی ٹیکچر" طبع سوم۔ جلد اول ۲۹۶۔ وغیرہ۔

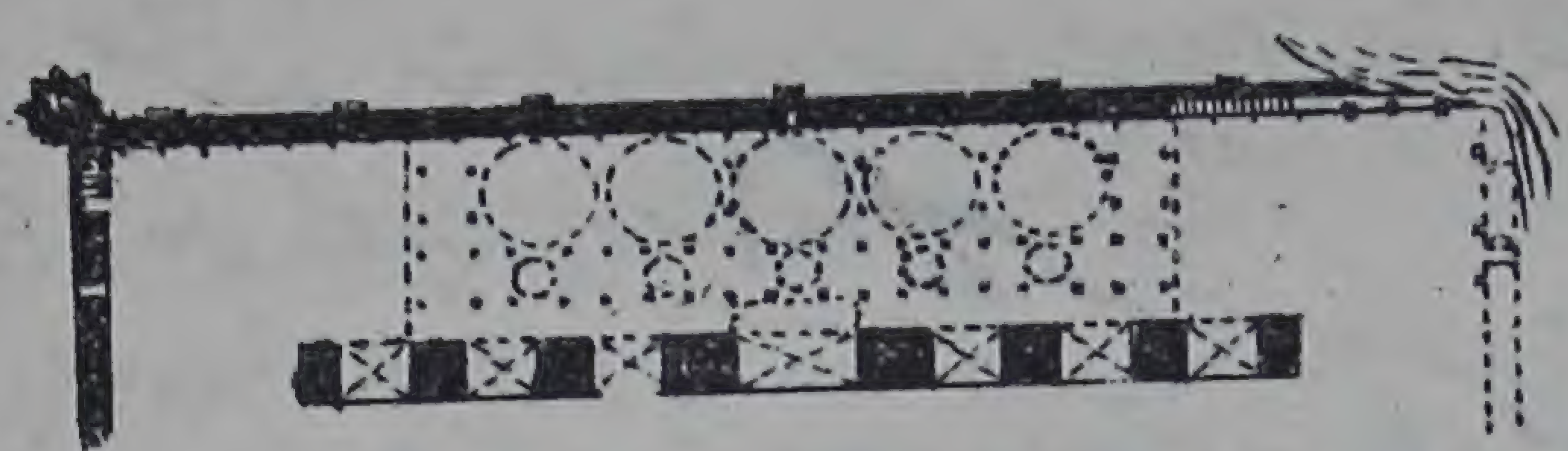
اتنی کامل چیز پہلے تیار نہ ہوئی تھی اور نہ اس کے بعد انھوں نے اس قدر مزین عمارت بنانے کا ارادہ کیا۔ باہری صوبوں میں اس عہد اور مغلیہ فتوحات کے مابین عجائب عمارتیں تیار ہوئیں مگر خود پائے تخت کی عمارات میں تزئین یا فنِ تعمیر کی اعلیٰ ندرتوں کی بجائے عریانی اور افسردہ متانت نمایاں ہے۔ علائی دروازہ باہر سے بہت کچھ خراب ہوگیا ہے لیکن اس کا اثر ابھی تک ویسا ہی ہے جیسا ہندوستان میں اس قسم کی کسی دوسری عمارت کا ہوگا۔ سکندر لودھی کے زمانہ (۱۴۹۴ء) میں صفدر خاں کے مقبرے کے قریب موضع خیر پور کی خوبصورت مسجد کا نفیس دروازہ کچھ ردّ و بدل کے ساتھ اسی علائی دروازے کے نمونے پر تعمیر کیا گیا تھا۔

اجمیر

اجمیر کی مسجد کی تعمیر بظاہر ۱۲۰۰ء میں شروع ہوئی اور تکمیل تو یقینی طور پر التمش کے عہد (۱۲۱۱ء تا ۱۲۳۵ء) میں ہوئی[5]۔ روایت یہہ ہے کہ ساری مسجد ڈھائی دن میں بن گئی تھی اور اسی لئے عام طور پر "اڑھائی دن کا جھونپڑا" کہلاتی ہے جس کے اگر کچھ معنی ہوسکتے ہیں، تو صرف یہہ کہ اتنے عرصہ میں ہندو مندروں اور مورتیوں کو صاف کرکے مصالحہ جمع کیا گیا ہوگا کہ فاتحان بت شکن اور دین اسلام کی عظمت و جلال کے مناسب ایک عالیشان مسجد تعمیر کی جائے۔ یہ مسجد تاراگڑھ کی پہاڑی کے دامن میں شہر کی حد پر واقع ہے اور پرانی دہلی کی مسجد کی طرح اس کا پورا نقشہ اسلامی ہے لیکن ستون اور چھتیں ہندو مندروں سے غنیمت میں لی گئی ہیں۔ پہلی نظر میں ہر طرف دالان اور بیچ میں صحن دیکھ کر یہ جینی مندروں کے مشابہ معلوم ہوتی ہے اور چھتوں کے نیچے ستونوں کی ہشت پہلو ترتیب سے بھی اس

۵ کننگ ہیم: رپورٹس، دوم، ۲۶۱ ؛

خیال کی تائید نکلتی ہے[1] لیکن اکثر دوسری مسجدوں کی مثل، یہ دالان بطور چار دیواری کے بنائے گئے ہیں جن کا رقبہ باہر سے تقریباً ۲۶۲ فیٹ مربع ہے[2] اور کونوں پر مینار بنا کے ان کے تین طرف کھلے ہوئے حجروں کا سلسلہ تیار کر دیا ہے۔ ان حجروں یا برآمدوں کو ہندو ستونوں پر قائم کیا گیا تھا جو اب بالکل شکستہ ہو چکے ہیں۔ صدر دروازہ حسب توقع مشرق کیجانب ہے۔ لیکن جنوبی رُخ بھی ایک سائبان دار دروازہ تھا۔ شمالی پہلو پہاڑی کی مقدس چٹان کے متصل بنا ہوا ہے اور اندر کا صحن قریب قریب ۲۰۰ فیٹ لمبا اور مغرب کے دالان تک ۱۷۵ فیٹ چوڑا ہے۔ یہی مغربی حصہ ابھی تک سلامت رہ گیا جس کا نقشہ حسب ذیل ہے:۔



نقشہ نمبر ۳۷

شمال مغربی گوشے پر غالباً کوئی رُخ نہ تھا اور جنوب مغربی گوشے پر ایک چھوٹا سا دیول تھا جس کا ٹھاٹھ منہدم کر دیا گیا۔ لیکن صحن کے مشرقی کونوں پر جو برجیاں ہیں وہ اسلامی اور اسی وضع کی ہیں جیسی کہ صدر دالان کے وسطی پایوں کے اوپر کنگورے بنے ہوئے ہیں۔ مشرقی جانب کے مسقف کو دوبارہ بنایا گیا ہے لیکن

---

[1] چنانچہ ٹاڈ نے اسے محض جینی مندر سمجھ لیا ہے اور سوائے بعض اضافوں کے اصل عمارت میں مسلمانوں کی کسی ترمیم تک کا امکان نہیں بیان کیا۔ (جلد اوّل، ۹۷۔ نیز ملاحظہ ہو اس کا خاکہ جو بالکل درست ہے)

[2] کننگ ہیم کی پیمائش اور خاکے میں اختلاف پایا جاتا ہے اس نے شمال سے جنوب تک کی بیرونی لمبائی ۲۷۲ فیٹ لکھکر پھر دوسرے ہی صفحے پر مسجد کی لمبائی (باہر سے) ۲۵۹ فیٹ لکھی ہے اور خاکے میں چاروں پہلوؤں کا طول مساوی تحریر کیا ہے حالانکہ شرقاً غرباً اس کی پیمائش ۲۶۴ فیٹ ۶ انچ ہے۔

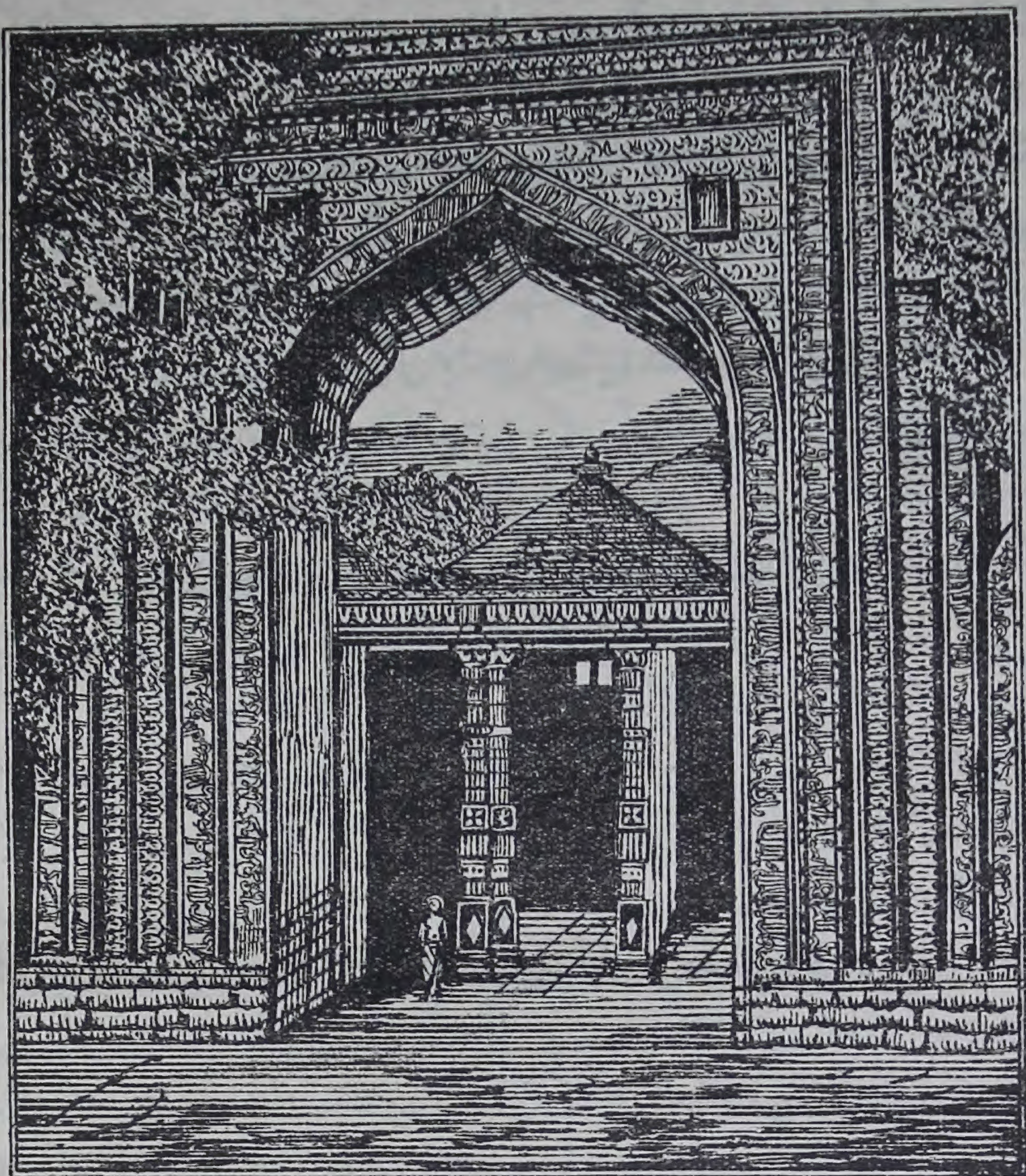
یہ پہلے نقشے کی نسبت بہت کم چوڑا ہے۔ شمالی مسقف کا کوئی اثر آثار نہیں رہا اور جنوبی کی صرف دیوار باقی ہے۔ بہر حال جو کچھ باقی ہے وہ بھی یہ دکھانے کے لئے کافی ہے کہ بحالت تکمیل یہ در اصل ہندوستان کی قدیم مسجد کا نہایت خاص اور پر شکوہ نمونہ ہوگی، جو پوری چھت صرف ۶ پایوں پر قائم کی ہے جس کا کل طول ۱۴۱ فیٹ کے قریب ہے اور اس کے آگے دونوں سرے کھلے ہوئے بلکہ نیچے فرش بنائے بغیر چھوڑ دیئے ہیں۔ پایوں کے عقب میں اصل مسجد کا عرض ۴۰ فیٹ ۸ انچ ہے۔ پوری چھت بلند سنگین ستونوں کی چار اور حصدلے کے ستونوں کی جو عقبی دیوار میں ملے ہوئے ہیں ایک قطار پر قائم ہے۔ ان کی کل تعداد ستّر ہے اور ان میں ہر ایک تین تین ہندی کھمبوں کو ملا کر تیار کیا گیا ہے۔ پوری چھت پانچ گنبدوں یا مخروطی قبوں پر مشتمل ہے اور ہر ایک کے نیچے قدیم جینی یا ہندو مندروں کی ترتیب کے مطابق آٹھ آٹھ ستون استادہ ہیں۔ یہی پانچ مخروطی قبے ہیں جو ابتک سلامت رہے ہیں[1]۔

لیکن قطب کی مسجد کی طرح اس مسجد کی بھی اصلی شان سات کمانوں کی اُس حجابی دیوار سے ہے جس سے التمش نے صحن کو مزین کیا تھا۔ اس کے عرض طول بھی اپنی مثیل مسجد کے مساوی ہیں یعنی وسطی کمان ۲۲ فیٹ ۲، دو دو بغلی کمانیں ۱۳½ فیٹ اور آخری سرے کی ۱۲ فیٹ ۸ انچ چوڑی ہیں۔ ہر کمان پر تین تین سطریں کندہ ہیں۔ پہلی سطر کوفی اور باقی دو عربی خط میں ہیں اور ان کے درمیان جدولیں بنائے نہایت صاف اور ابھرے ہوئے عربی نقش و نگار بنا دیئے ہیں جن کی تراش خراش آج بھی ایسی ہے جیسی کندہ کرنے کے وقت تھی۔

(تصویر بر صفحۂ دیگر)

---

[1] ان قدیم قبوں کی شکل نیچے کے مخروطی عمارت کے مطابق تھی جنھیں بدنما سمجھ لیا گیا اور خمیدہ سالہا ہوئے آرکیولوجی کی سروے میں انھیں ہٹا کے "بہتر شکل کے نیم کروی قبے" بنا دیئے گئے۔



تصویر نمبر ۱۲ ''مسجد اجمیر کی بڑی کمان''

بعظیمہ یہ جالی دیوار ۵۶ فیٹ کی بلندی تک پہنچتی ہے اور اس پر دو میناروں کے آثار موجود ہیں جن کا قطر ۱۰½ فیٹ ہے اور جنہیں قطب مینار کے نچلے درجے کی طرح یکے بعد دیگرے مدوّر اور مثلثی بل بنا کے مزین کیا گیا تھا معلوم نہیں اس قسم کے مینار دہلی میں بھی تھے یا نہیں۔ لیکن قیاس چاہتا ہے کہ وہاں نہ ہونگے اور بڑا مینار ہی اسی غرض کیلئے کافی سمجھ لیا گیا ہوگا۔ خود اس جگہ ان کی تعمیر بعد کا خیال

معلوم ہوتی ہے جیسے کسی کم مشق کاریگر نے اجنبی طرز میں تعمیر کیا ہو۔ بعد میں جہاں کہیں یہ مینار بنائے گئے، ان کی تیاری بنیاد ہی سے شروع ہوئی اور زمین تک ان کے خطوط لائے گئے ہیں جیسا کہ بقاعدۂ فن ہونا چاہئے۔ مسجد اجمیر کے معاملے میں یہ نرالی بات بظاہر اس لئے ہوئی کہ راج معمار ہندو اور اس طرز سے ناواقف تھے۔ کمانوں کے عمودی اصول پر بنانے کی بھی وجہ یہی ہے۔ صحیح معنی میں کوئی کمان یا قوس اس مسجد میں نہیں ہے لیکن چونکہ یہاں دہلی کی نسبت بڑے پتھر میسّر تھے لہٰذا کمانیں شکستہ نہ ہوئیں اور مرمت ہونے تک قائم تھیں۔

لیکن اس حجابی دیوار کی کمانوں کا عرض یا ارتفاع انھیں ہندوستان کی سب سے قابل دید عمارات میں شمار کرانے کا باعث نہیں ہے بلکہ اس کا سبب ان کا طرز تزئین ہے جس حسنِ ذوق کے ساتھ کوفی اور طغرائی خطوں کو خالص تعمیری نقش و نگار سے ملا کے کندہ کیا ہے، اور جس طریق پر عمارت کے خطوط ترکیبی سے تعارض و تخالف ہوئے بغیر ان سے پوری تعمیر میں جان ڈالی اور تنوّع پیدا کیا گیا ہے، اس سے بہتر ہو نہیں سکتا جیسا کہ پہلے رائے ظاہر کی جا چکی ہے، غالباً التمش کی دہلی اور اجمیر کی ان مسجدوں کے دیواری نقش و نگار کی کہیں نظیر نہ ملیگی۔ جملہ باریکیوں کے اعتبار سے قاہرہ یا ایران میں کوئی چیز اتنی کامل احسن نہیں ہے اور اسپین و شام کی کسی دیوار کی نقاشی ان کو نہیں پہنچتی۔ دوسرے ان میں طرفگی یہ ہے کہ اس طریق سے اور اس حد تک مسلمانوں کی وسعت تصوّر اور ہندوؤں کی باریک صنّاعی کی آمیزش اور کہیں نہ مل سکے گی[1] ان خصوصیات میں یہ اور اضافہ کیجے کہ یہ ہندوستان کی سب سے پہلی مسجدیں ہونے کے اعتبار سے تاریخی قدر و وقعت رکھتی ہیں اور دو مختلف نسلوں کی ممتاز خصائص کو ایسے واضح اور نمایاں طریق پر پیش کرتی ہیں کہ انھیں ایک نسلیاتی وقعت حاصل ہو گئی ہے۔

[1] یہ فاضل مولف کی کمال دیدہ دلیری یا محض مسلمانوں سے مفرط تعصب کی دلیل ہے کہ وہ نقاشی اور کندہ کاری کی اس خالص اسلامی صنعت کو ہندی ثابت کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ عبارات کو مختلف خطوں میں کندہ کرنا تمام اسلامی ممالک میں عام ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کے سوا اور کسی قوم میں اس کا رواج نہیں پایا جاتا۔ مترجم

غرض یہ سب باتیں مل کر انہیں یقیناً حکومت کی حفاظت و توجہ کا سب سے زیادہ مستحق بناتی ہیں۔ ان میں سے ایک مسجد پر خاص طرح توجہ بھی کی گئی ہے لیکن دوسری سے زمانۂ قریب تک شرمناک بے اعتنائی برتی گئی اور نہایت وحشیانہ سلوک کیا گیا ہے[۱۵]

بعد کا "پٹھان" طرز

علاءالدین خلجی کی وفات (۱۳۱۶ء) کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ عہد تغلق و سادات کے معماروں کی طبائع میں تبدیلی واقع ہوئی، اور شیر شاہ افغان کے زمانے (۱۵۳۹ء) تک کی عمارتوں سے نقشے کی انتہائی سادگی ٹپکتی ہے جو ابتدائی اہتمام تزئین کے مقابلے میں بہت نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہ ٹھیک معلوم نہیں کہ یہ قدیم نمونوں کی نیم ہندوانی وضع سے کسی مذہبی رجعت کا اثر ہے یا ایسے سیاسی اسباب سے جن کے نتائج کا اب پتہ چلانا دشوار ہے، یہ کیفیت پیدا ہوئی۔ بہر نوع، اتنا مسلّم ہے کہ جس وقت خشک مزاج کہن سال جنگ جو تغلق شاہ نے ۱۳۲۱ء میں ایک اور دلی بسائی جو اب تک اس کے نام سے منسوب، یعنی تغلق آباد کہلاتی ہے تو اسلاف کی عمارتوں کے خلاف اس کی ہر تعمیر میں شدید سادگی سے کام لیا گیا حالانکہ قدیم پائے تخت قریب ہی موجود تھا اور وہاں سے وہ میدان زیر قدم نظر آتا تھا جس میں تغلق کا نیا قلعہ تیار ہوا۔ اس کا مقبرہ بھی، جس کی بنا نہیں تو تکمیل یقیناً اس کے جانشین کے ہاتھوں ہوئی، بجائے کسی باغ میں ہونے کے جیسا کہ معمول تھا، ایک علیحدہ اور مضبوط قلعے کے اندر تعمیر کیا گیا جس کے چاروں طرف تالاب کھود دیا ہے۔ اس مقبرے کی سلامی دار دیواریں قریب قریب مصری آثار کی سی پختگی، گرد کی فصیل اور دمدموں میں آگے نکلے ہوئے زبردست

۱۵ اجمیر کی مسجد کا جو حصّہ مسلمانوں نے تعمیر کیا وہ بہتر و وسیع تر مصالح سے بنا تھا، لہٰذا وہ اتنی شکستہ حالت میں نہیں جیسی کہ قطب کی مسجد مرمت سے (جسے ۲۵ برس ہوئے) قبل تھی لیکن جہاں تک میں رائے قائم کر سکا ہندوستان میں کوئی عمارت اس اجمیر کی مسجد سے زیادہ حکومت کی توجہ کے قابل نہیں ہے۔

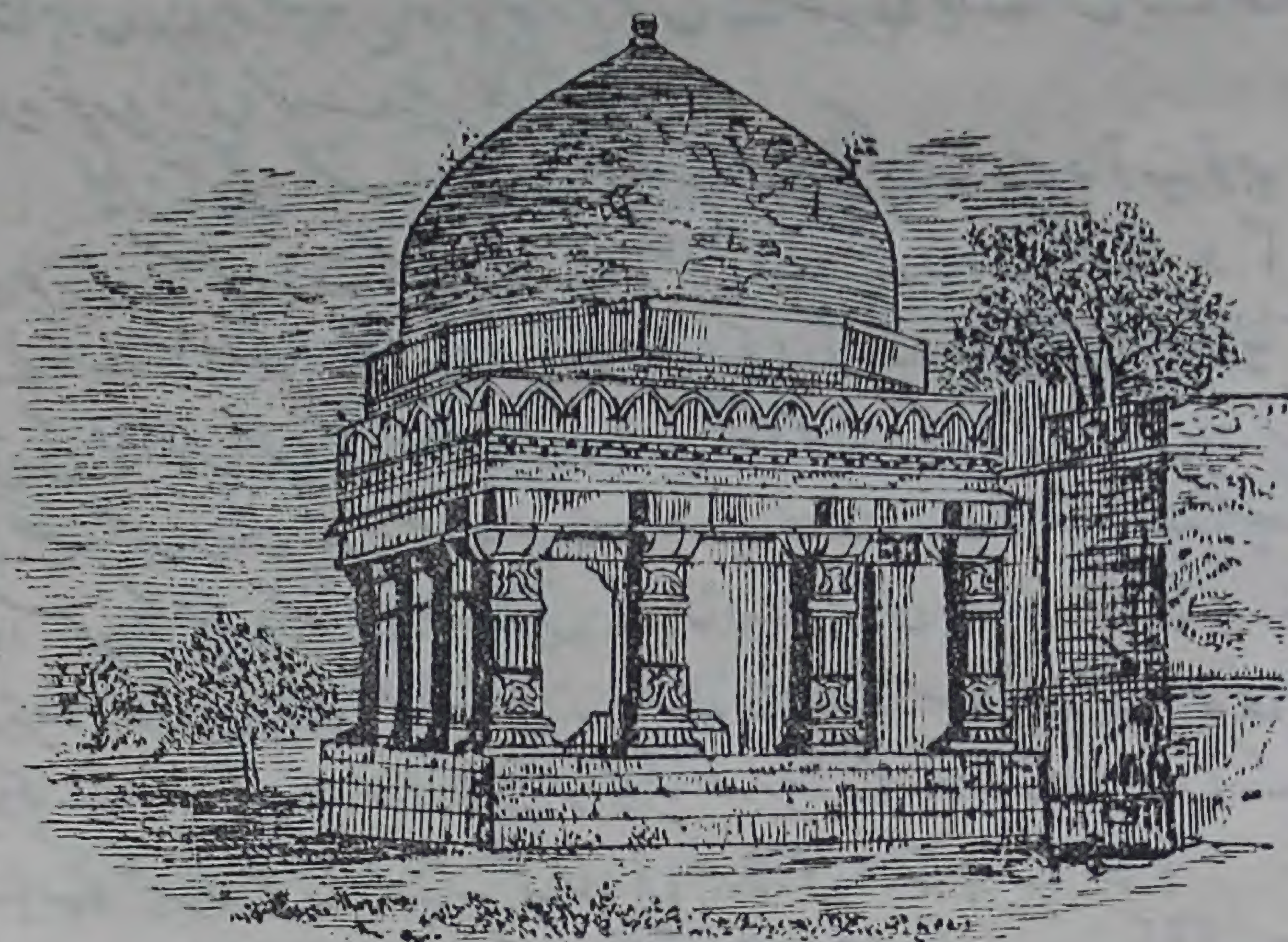
برج ہا یہ سب مل کر ایک غازی کے مقبرہ کا ایسا نمونہ مرتب کرتے ہیں، جس کی نظیر ملنی دشوار ہے اور زیادہ امن پسند یا توطن گزیں خاندان کے آئندہ بادشاہوں نے جو نفیس اور پُر بہار باغوں کے مقبرے بنوائے، ان کے مقابلے میں یہ مقبرہ بالکل مختلف چیز نظر آتا ہے۔

لیکن تاریخی اعتبار سے یہ تعمیر سب سے بڑھ کر اس لیئے جاذب توجہ ہے کہ یہ طرز تعمیر اس بات کا ثبوت ہے کہ تغلق شاہ کے وارث تخت و تاج ہونے تک مسلمانوں نے اپنے آپ کو ہندی اثرات سے بالکل آزاد کر لیا تھا۔ تغلق کی عمارتوں میں جتنی محرابیں ہیں وہ سب صحیح محرابیں (یا قوسیں) ہیں اور جزئیات میں تقلید نہیں کی گئی بلکہ ہر مقام کے مناسب جدت سے کام لیا ہے حقیقت میں اس کا مقبرہ جمنا کی بجائے نیل کے کنارے پر بھی ایسا ہی بلکہ سچ یہ ہے کہ کچھ زیادہ موزوں ہوتا۔ بالفاظ دیگر اس وقت سے ہندوستان میں اسلامی طرز تعمیر بجائے خود ایک جدید اور کامل طرز ہو گیا اور دنیا کے دوسرے حصوں کے سچے طرز ہائے تعمیر کی طرح اس میں بھی قدرتی اور لازمی ارتقا ہونے لگا۔

بایں ہمہ یہ درست ہے کہ اپنے مقابر و مساجد میں مسلمانوں نے اکثر محنت سے بچنے کے لیئے ہندی مصالحے سے جہاں کہیں میسر آیا، کام لیا اور بارہا ایک تازہ خوش نمائی پیدا کر دی۔ ایسی مرکب عمارتوں میں بہت سی صرف چار کھمبوں کی ہیں جن پر چھوٹے چھوٹے گنبد بنا دیئے ہیں مگر اکثر اوقات جلیبی ستونوں کی طرح ان کی بارہ دری کی ترتیب بھی اختیار کر لی گئی ہے جو ہشت پہلو عمارتوں میں دیئے جاتے تھے اور جن پر گول آثار دے کر گنبد بنانا سہل تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، ی لاسا کے مقبرے کی ترتیب یہی ہے اور علی ہذا جینی اور شمالی ہند کی عمارتوں کے نقشے کی ساری خوشنمائی بھی اسی ندرت کا نتیجہ سمجھنی چاہیے۔

ان عمارتوں کی کیفیت ظاہر کرنے کے لیئے صرف ایک مثال پیش کرنی کافی ہوگی۔ یہ گوالیار کے جنوب مغرب میں ستر میل پر سیپری کی عمارت ہے پہلی نظر میں گنبد نیچے کی عمارت کے مقابل زیادہ بھاری معلوم ہوتا ہے مگر مجموعی طور پر اس کی نظر فریبی نکتہ چینی کی زبان بند کر دیتی ہے۔

اگر جملہ اجزائے ترکیبی



تصویر نمبر ۲۷ ”دسیپری کا مقبرہ“

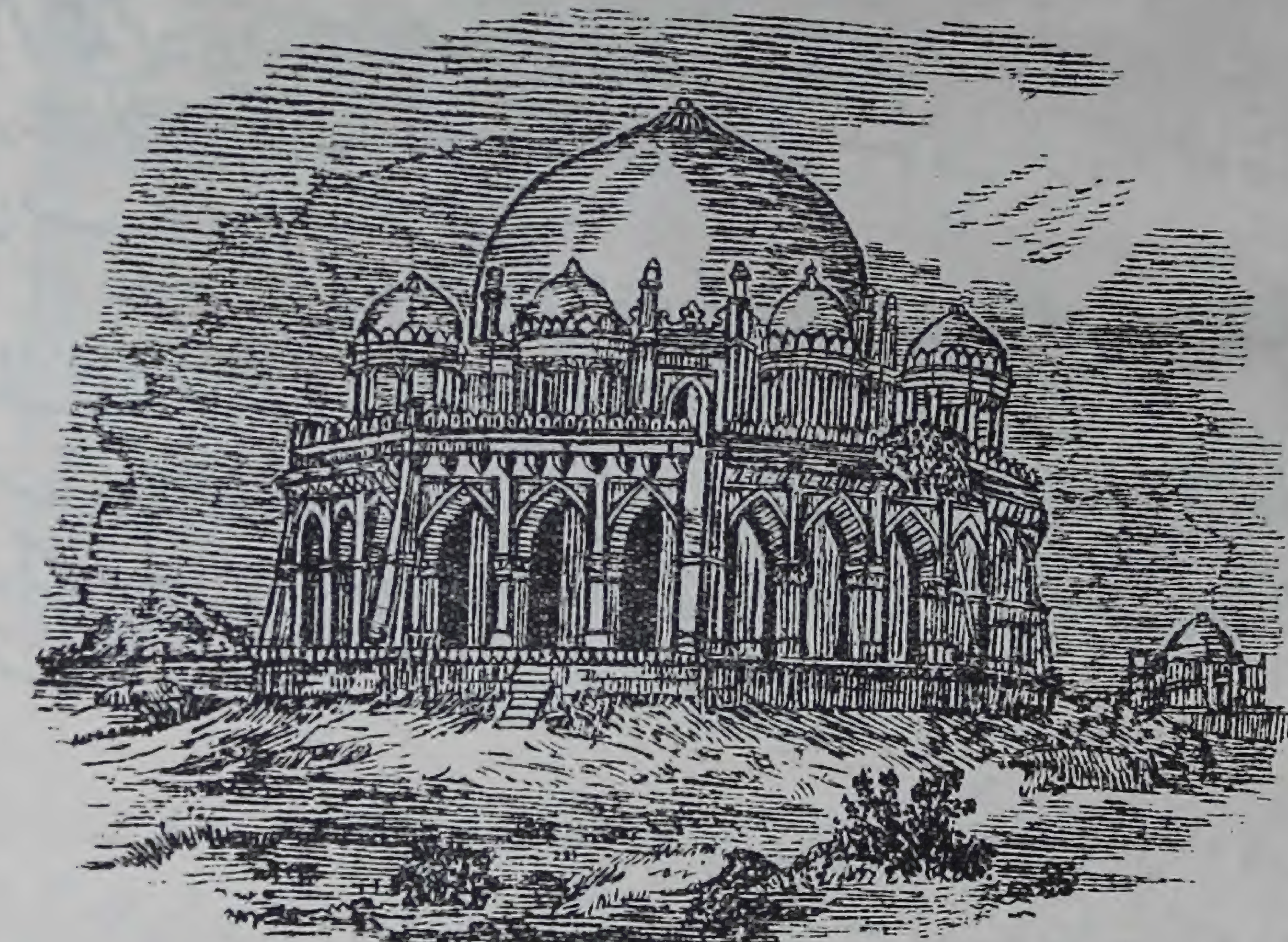
اجتہادی ہوتے تو اعتراض کی گنجائش تھی لیکن جب کہ اس کا ایک حصّہ صریحاً مستعار لیا گیا ہے، تو دوسرے اجزا سے اُس کا خفیف سا عدم تناسب نظر انداز کرنے کے قابل ہے ؎

بنارس میں بکریا کنڈ پر بھی اس نمونے کے کئی مقبرے موجود ہیں جنھیں بظاہر پرانے ملبے سے تیار کیا گیا تھا[1] بلکہ جہاں کہیں مسلمان ایسے مقام پر جو پہلے ہندو، جینی یا بودھ مت والوں کی بستیاں تھیں، اچھی طرح آباد ہوگئے تھے، وہاں ایسے مرکب نمونے جا بہ جا ملتے ہیں۔ مگر واضح رہے کہ اسلامی اجزا کو ہندی طرز میں مدغم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی اگرچہ اُس ہندی طرز کو اختیار کر لیا گیا ہو۔

[1] رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، جلد سی و چہارم، از صفحہ (۱)

یہ عمارتیں جس زمانے میں بنیں اسی کی یادگار ہیں اور جو شخص اس طرز سے واقف ہے وہ بلا دقت ان کا زمانہ معلوم کر سکتا ہے۔

پٹھان مقبرے کی عام صورت ذیل کی تصویر سے بخوبی ذہن نشیں ہو جائے گی۔ یہ اُن صدہا مقابر میں سے جو ابھی تک پرانی دہلی کے میدانوں میں بکھرے ہوئے ہیں، ایک نامعلوم الاسم کا مقبرہ ہے[1] اور دہلی کے جنوب میں اجمیری دروازے سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر موضع خیر پور میں مسجد کے جنوب مغرب کی طرف بنا ہوا ہے۔ اس میں ایک ہشت پہلو



تصویر نمبر ۳۷ "خیر پور کا مقبرہ - پرانی دہلی"

کمرہ ہے جس کا اندرونی وتر ۳۱ فیٹ ۱۰ انچ ہے اس کے گرد اسی شکل کا برآمدہ

لے کننگ ہم کہتا ہے کہ اسے مبارک خاں پٹھان سے منسوب کرتے ہیں (رپورٹس جلد ۱، ۱۵۰) فن شناس اسے محمد شاہ چہارم (متوفی ۱۴۴۳ء) کا مقبرہ بتاتا ہے (ڈلہی۔ ۲۴۴) اگر سید احمد خاں نے مسجد کے

دیا ہے اور کل عمارت کا عمود ۲۷ فیٹ ۲ ہے۔ ہر پہلو میں پٹھان، یا زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ خاندانِ سادات کے عام طرزِ عمارت کے مثل لمبے ستون اور نکیلی قوس کی تین تین محرابیں بنائی ہیں جن کے ستون چوکور ہیں اور ستون کی یہ وضع بھی ان کی محرابوں کی طرح ہر جگہ مروج ہے، یہ وضع بظاہر جینیوں کے چوکور پایوں سے لی گئی ہے لیکن اسے اتنا بدلا اور سادہ کر دیا ہے کہ جدید ترکیب میں اس کی اصلیت شناخت کرنی خاصی دقیقہ رسی کی محتاج ہے۔

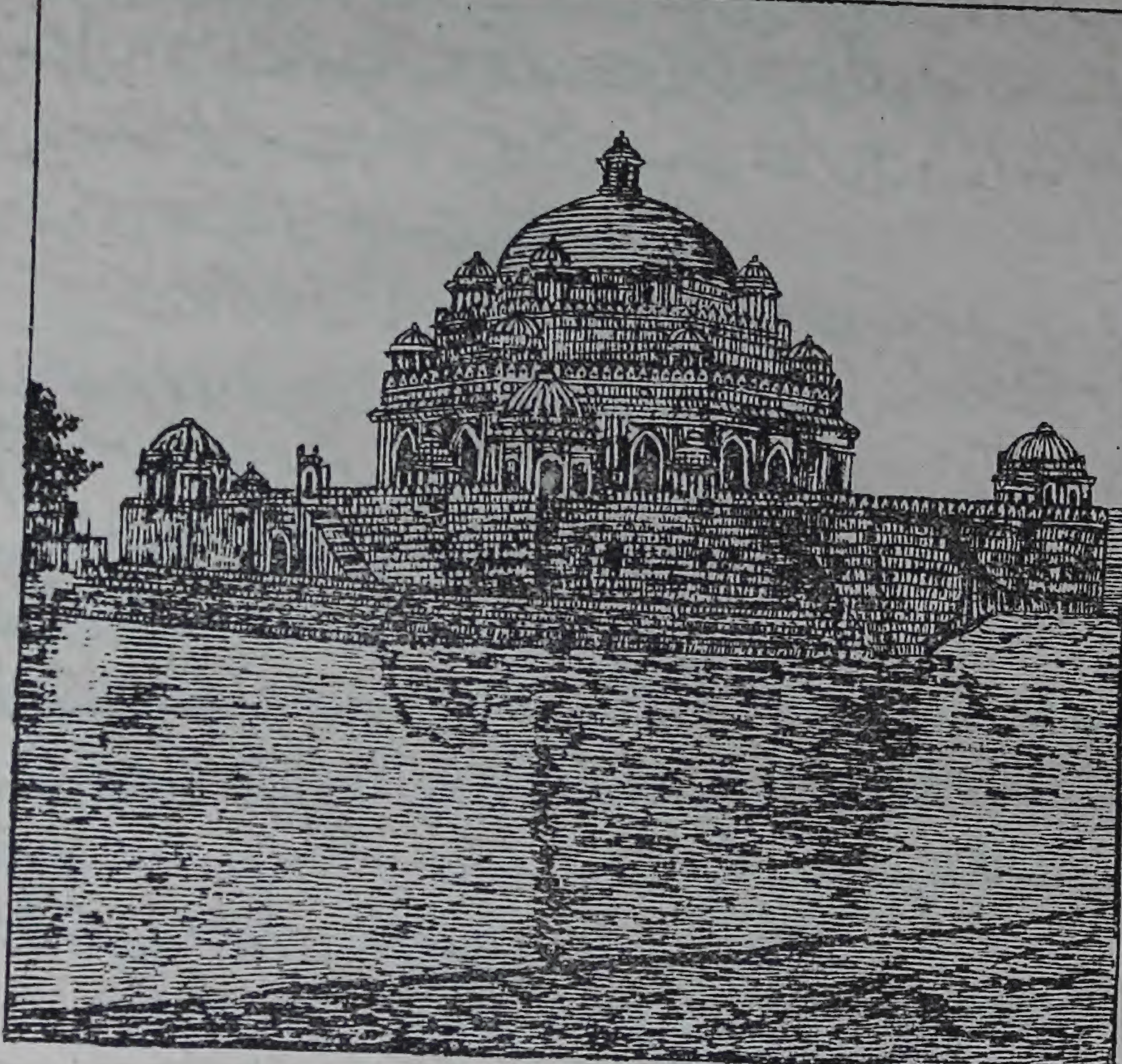
مسجد کے شمال مشرق میں ایک اور مثمن مقبرہ اسی طرز میں اور قریب قریب اسی عرض و طول کا بنا ہوا ہے۔ مبارک شاہ ثانی (مقتول سنہ ۱۴۳۴ء) کا مقبرہ جو مبارک پور یا کوٹلے میں خیر پور سے جانب جنوب تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع ہے اس کا نمونہ اور عرض و طول بھی ایسا ہی ہے اور یہ متاخرین سلاطین دہلی کے "پٹھان" طرز کی سب سے قدیم عمارت ہے[لہ]

مقبروں کے اس سلسلے کی آخری کڑی شیر شاہ (عہد بادشاہی سنہ ۱۵۳۹ تا سنہ ۱۵۴۵ء) کا مقبرہ ہے جو نسل افاغنہ میں سب سے نامور بادشاہ تھا۔ یہ ۱۰۴ فیٹ اونچی اور ۳۰۰ مربع فیٹ وسیع کرسی پر سہسرام (ضلع شاہ آباد) کے قریب ایک بڑے تالاب کے وسط میں بنا ہوا ہے اور محل وقوع اور وضع کے اعتبار سے اب نہایت عجیب اور خوشنما چیز ہے۔

تصویر بر صفحۂ دیگر

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ شمال مشرق کے ایک دوسرے خشت پہلو مقبرے کو اس بادشاہ کا مقبرہ بتایا ہے کہ

لہ کننگ ہیم نے اس کا خاکہ دیا ہے۔ رپورٹس اسٹم، لوح نمبر (۲۵)



تصویر نمبر ۳۸ "شیر شاہ کا مقبرہ سہسرام میں"

اس کا عرض و طول بھی کچھ کم نہیں ہشت پہلو قاعدے کا ہر پہلو ۷۶ فیٹ اور عمود ۲۵۰ فیٹ کا ہے۔ بیچ کے ایوان کے گرد ۱۰ فیٹ ۱۲ انچ چوڑی غلام گردش بنا کے اس کے اوپر ایک عظیم الشان گنبد تعمیر کیا ہے جس کا قطر ۷۱ فیٹ ہے اور اسی کے نیچے بانی کی قبر اور اس کے بعض رفقائے جنگ آسودہ ہیں ۔

باہر کے رخ کرسی کے گوشوں کی خوب ابھری ہوئی برجیوں سے زینت بڑھائی ہے جو بڑے گنبد کی نہایت خوبی سے معاونت کرتی ہیں اور ان کے درمیان کی چھوٹی چھوٹی چھتریاں خط تعمیر میں ایسا انقطاع پیدا کر دیتی ہیں جس سے منظر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح خود گنبد کے ڈھولنے کے ارد گرد جو گمندیاں تعمیر کی ہیں

اُن سے اور خود گنبد سے ظاہری متانت و استحکام میں فرق پڑے بغیر پوری عمارت میں تنوع آگیا ہے۔ غرض مجموعی طور پر دوسرے درجے کے شاہی مقبروں میں ہندوستان کا کوئی مقبرہ نقشے کی صفائی یا اجزا کے تناسب کے لحاظ سے اسے نہیں پہنچتا۔ ابتدا میں خشکی سے اس تک پہنچنے کے لئے پل بنا ہوا تھا لیکن غنیمت ہوا کہ انگریزی بڑی سڑک بننے سے قبل ہی یہ پل ٹوٹ گیا تھا ورنہ یہ مقبرہ کبھی کا سرکاری مصرف میں آچکا ہوتا۱؎

ان سلاطین دہلی کی مساجد کی بھی شان یہی ہے جو ان کے مقبروں کی۔ کلاں یا کالی مسجد جو موجودہ شہر دہلی میں موجود ہے اور دیوار کے ایک کتبے کی رو سے سنہ ۱۳۸۷ء میں تکمیل کو پہنچی، اس کی طرز تعمیر بھی خیر پور والے مقبرے جیسی ہے۔ اگرچہ اس کے آثار زیادہ چوڑے ہیں اور سامان زینت مقبرے کے برابر بھی نہیں پایا جاتا۔ یہی خشک متانت جو دھویں صدی کے آخری حصے کا امتیازی وصف بن گئی تھی اور ممکن ہے کہ یہ ہندوانی تکلفات کی افراط کے خلاف جو تیرہویں اور چودھویں صدی کی خصوصیت تھی اسلام کی سادگی پسندی کا مظاہرہ ہو۔ بہرحال یہ سادگی قائم نہ رہی اور سلطنت دہلی کا بعد کا طرز تعمیر ایسے قدیم طرز سے (جس کا نمونہ قطب کی عمارتیں ہیں) کچھ کم پر تجمل نہ رہا بلکہ اپنے مقاصد تعمیر کے واسطے تو ان قدیم عمارتوں سے بھی کہیں زیادہ موزوں تھا۔

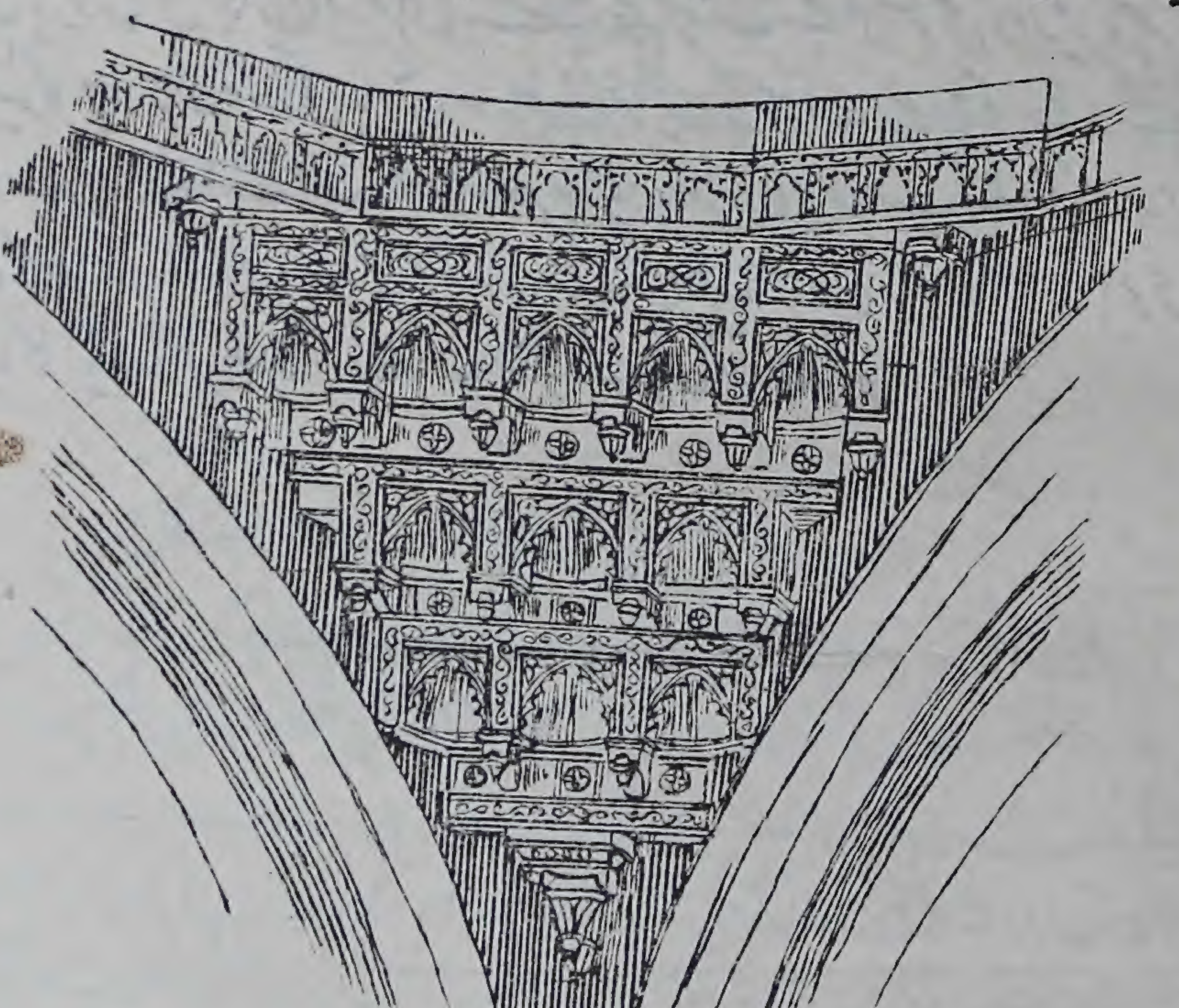
اس کا سب سے بڑا سبب عہد شیر شاہی کے غیر معمولی تزک و احتشام کو سمجھنا چاہیئے لیکن یہ ابتدائی مغل بادشاہوں کے طرز سے اس طرح رل مل گیا ہے کہ ان میں باہم امتیاز کرنا دشوار ہے۔ ہرچند سنہ ۱۵۲۶ء میں بابر نے ہندوستان فتح کر لیا تھا مگر اس کے جانشین کو شیر شاہ نے شکست دے کے ملک بدر کر دیا اور پھر سنہ ۱۵۵۵ء میں سلطنت مغلیہ دوبارہ مستقل طور پر دہلی میں قائم ہوگئی اسی لئے سولھویں صدی کے پہلے نصف کے طرز کو پٹھانوں کے آخری سنبھالے یا سلاطین مغلیہ کے ابتدائی عروج کسی سے بھی منسوب کیا جا سکتا ہے اور حق یہ ہے کہ وہ دونوں میں سے ہر ایک کے شایان شان ہے۔

اس عہد میں مسجدوں کی روکاریں زیادہ آراستہ بننے لگیں ان میں اکثر سنگ مرمر کی پچی ہونے لگی اور سنگتراشی کی خوشنما اور پر تجمل وضع سے انہیں بلا استثنا مزین کیا جانے لگا۔ عمارتوں کے گوشوں

۱؎ رسالہ انڈین آرٹ اینڈ انڈسٹری جلد پنجم صفحہ ۴۹ و ۵۰ اور الواح ۵۰ تا ۶۲ میں ای ڈبلیو اسمتھ نے کالپی کے ایک شکستہ مقبرے کا احتیاط سے با تصویر حال تحریر کیا ہے یہ "چوراسی گنبد" کہلاتا ہے اور ۱۱۵ فیٹ مربع ہے۔ وسطی حجرہ ۴۰ فیٹ مربع اور اس کے گرد دوہرا سقف دے کے چالیس گوشے بنائے ہیں اور بڑے بڑے آثار کے پایوں پہ چھتیں قائم کی ہیں۔

پربھی برجیوں سے تنوع پیدا کرتے تھے جن کے نیچے چار مرغولہ دار ستون ہوتے لیکن مینار کبھی نہیں بنائے جاتے اور جہاں تک مجھے علم ہے یہ اس نام نہاد "پٹھانی عہد" میں مسجد کا جزو نہیں تھے! اذان چھت پر سے دیجاتی تھی اور سوائے اجمیر کی مسجد میں پہلی اور ایک بے ڈھنگی سی کوشش کئے اور کسی جگہ اس زمانہ میں مجھے ایسے مینار کی مثال نہیں ملی جو محض اذان کی غرض سے بنایا گیا ہو حالانکہ مصر اور دوسرے ملکوں میں وہ اس عہد سے بہت پہلے سے عام طور پر بنائے جانے لگے تھے اور تھوڑے ہی دن بعد عہد مغلیہ کی مساجد کا بھی لازمی جزو سمجھے جانے لگے۔ مگر معلوم ہوتا ہے ہندوستان کے پہلے مسلمان بادشاہ مینار کو اسی نظر سے دیکھتے تھے جیسے اطالوی کمپانیل کو یعنی عبادت گاہ کا جزو ہونے کی بجائے اسے فتح و قوت کا نشان سمجھتے تھے۔

مسجدوں کی صدر عمارت علی العموم ایک مستطیل ایوان کی شکل کی ہوتی جس کے وسط میں بڑا گنبد اور بازوؤں میں اسیقدر چھوٹے لیکن کم بلند دو گنبد بناتے تھے۔ ان کو وسطی گنبد سے ایک عریض و رفیع کمان جدا کرتی تھی جس کے حاشئے اور نقش و نگار عمارت کے سب سے ممتاز لوازم آرائش ہوتے تھے۔ باریک نقاشی کے اعتبار سے وسطی آویزے کمانوں سے بھی زیادہ قابل دید بنائے جاتے تھے مگر ان کی



تصویر نمبر ۳۸۲ - "پرانی دہلی کی مسجد کا آویزہ"

اوضاع اسقدر مختلف ہیں کہ ان کی قسم بندی یا کیفیت بیان کرنی محال ہوگی۔ شاید سب سے عام وضع وہ ہے جس کی اوپر تصویر دیگئی ہے اور جس میں زیج کے فصل کو گڑیا گھر یا چھوٹی چھوٹی کمانیں بناکے معمور کر دیا ہے اور ہر کمان مرغولے کے ساتھ دوسری سے مل گئی ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ اس قسم کی تزئین، اندلس کے عربوں کی قرص نما کمان کے نمونے پر رائج ہوئی، لیکن یہاں کے آویزے عربی عمارتوں کے آویزوں سے جو قوسی ہوتے تھے مختلف ہیں۔ اس لئے کہ یہ محض کونے کی دیوار گیریاں ہیں۔

اگر سلاطین مغلیہ کی، جو انہی پایۂ تختوں میں ترک وافاغنہ کے جانشین ہوئے، بعد کی شان وشوکت ان قدیم عمارتوں کو بالکل ماند نہ کر دیتی، تو ان کے طرز عمارت پر یقیناً زیادہ توجہ کی جاتی اور ان کی جداگانہ کیفیت بھی ایسی ہی دلچسپ اور سبق آموز ہوتی جیسی ہندوستان کے کسی دوسرے اسلامی طرز تعمیر کی۔ مختصر طور پر بیان کیا جائے تو اس طرز کے ابتدائی زمانے میں وہ سب باریکیاں موجود ہیں جو ہندی صناعی پیدا کر سکتی تھی۔ دوسرے دور میں اس کی خصوصیت سادگی اور عظمت ہے جو ہمارے خیالات کے مطابق بانیوں کی طبائع اور مزاج سے زیادہ ہم آہنگ ہے مگر آخری دور میں ہم اس طرز تعمیر کو پھر پہلے دور کی باریکی اور جزئی تزئین کی طرف رجوع کرتے دیکھتے ہیں۔ اگرچہ اب ہر جزو اپنے مقصد اور مقام پر زیادہ موزوں ومناسب نظر آتا ہے۔ سوائے نازک کام کے اور کہیں ہندی صنعت کا گمان تک نہیں گزرتا اور اس آخری ارتقا میں دنیا کا ایک مکمل طرز تعمیر ہمارے مشاہدے میں آتا ہے۔

باب چہارم

جونپور

جامع مسجد اور لال دروازہ

سنین

خواجہ جہاں کا جونپور میں خود مختار ہوجانا .... سنہ ۱۳۹۴ء
مبارک (خواجہ جہاں کا پسر خواندہ) .... سنہ ۱۳۹۹ء
شمس الدین ابراہیم شاہ شرقی .... سنہ ۱۴۰۱ء
محمود شاہ شرقی .... سنہ ۱۴۴۰ء
حسین شاہ .... سنہ ۱۴۵۲ء
معزولی اور گور میں پناہ گزینی .... سنہ ۱۴۷۹ء

مسلمانوں کے ہندوستان فتح کرنے کے ٹھیک دو صدی بعد خواجہ جہاں نے اپنی آزاد سلطنت کی بنا ڈالی۔ وہ اس صوبے کا والی تھا جس میں جونپور واقع ہے

سلہ جونپور، بنارس کے شمال مغرب میں تقریباً ۳۴ میل کے فاصلے سے واقع ہے۔ یہاں کی عمارات پر "دی شرقی آرکی ٹیکچر آف جونپور" میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے (مطبوعہ سنہ ۱۸۸۹ء) اور ڈاکٹر منڈ اسمتھ عہدہ دار آرکیولوجیکل سروے کے نقشوں سے ۷۴ تصویریں کتاب میں شامل کی ہیں۔

اس کا خاندان شاہی ۱۳۹۴ء سے تقریباً ۱۴۷۹ء یعنی کچھ کم ایک صدی تک آزاد حکمراں رہا اور سنہ مذکور میں فرمانروائے دہلی سے مغلوب ہو جانے کے باوجود بھی کچھ عرصے نیم آزادانہ سی حکومت کرتا رہا تاآنکہ اکبر اعظم نے اسے دولت مغلیہ میں ہمیشہ کے لئے ضم کر لیا۔ لیکن اسی آزادی کے زمانے میں جونپور میں کئی عالیشان مسجدیں شہر کی زینت کا موجب ہوئیں جن میں سے تین اب تک خاصی طرح پوری کی پوری سلامت ہیں ان کے علاوہ قلعے اور پل سے قطع نظر، جو بجائے خود ہندوستان کی اس قسم کی ممتاز ترین عمارات میں داخل ہیں، ایک معقول تعداد مقابر، محلات اور دوسری عمارتوں کی تیار ہوگئی ہے۔

ہرچند علاء الدین و تغلق شاہ کے عہد میں دار السلطنت کا طرز تعمیر ایک حد تک تکمیل کو پہونچ چکا تھا لیکن تعجب ہے کہ ان سے ایک عرصے بعد بھی جونپور میں جو بڑی عمارتیں اوّل اوّل بنیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبوں میں اس وقت تک یہ عمل کس قدر ناقص تھا۔ مسجد کے بڑے بڑے حصے، جیسے دروازے، صدر دالان اور عموماً سب مغربی عمارتیں کامل مقوس ((Arcuate)) طرز میں ہیں اور جہاں کہیں کشادہ دریا اندرونی کھلے ہوئے فصل درکار تھے، وہاں کمانیں، گنبد یا گردی قبے استعمال کئے گئے ہیں اور ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو انھیں دار السلطنت کے طرز تعمیر سے ممتاز کرتی ہو لیکن صحنوں کے گرد جو صحنچیاں اور اندر جو غلام گردشیں بنائی ہیں ان میں چھوٹے چھوٹے مربع ستون، خمیدہ سر ستون، سیدھے گردنے اور چپٹی پٹیوں کی چھتیں جا بجا موجود ہیں جیسی ہندو اور جینی مندروں میں بلا استثنا پائی جاتی ہیں۔ ایک دوسرے سے مخلوط ہو جانے کی بجائے جیسا کہ آئندہ ہوا، یہاں مسلمانوں کا طرز مقوس ہندوؤں کے ستوی (Trabeate) طرز کے پہلو بہ پہلو اور مقابلے میں اس طرح نمایاں ہے کہ بعض مصنفوں کو یہ گمان ہو گیا کہ ستون دار حصے قدیم جینی یا بدھی آثار کے ہیں، جن پر مسلمانوں نے قبضہ کر کے اپنے حسب منشا کام لے لیا ہے[1]۔ مگر اصلیت یہ معلوم

[1] سب سے پہلے یہ خیال بیرن ہیگل نے دلایا اور پھر ٹھورن اور اسکیرنگ نے اسکو اختیار کر لیا۔ ممکن ہے کہ تیرہویں یا چودھویں صدی عیسوی میں جونپور میں بعض ہندو یا جینی عمارتیں موجود ہوں جن سے مسلمانوں نے کام لیا لیکن کم سے کم نوے فیصدی ستون ان مسجدوں کے اسی وقت بنائے گئے تھے جب کہ انکی جہاں موجود ہیں وہاں نصب کرنیکی ضرورت پیش آئی ہے۔

ہوتی ہے کہ جس زمانے میں یہ مسجد بنی ہے، اس وقت تک یہاں کی اسلامی آبادی میں زیادہ تعداد نومسلم ہندوؤں کی تھی جو اپنی قدیم رسموں کی، جہاں تک کہ وہ نئے دین کے معارض نہ ہوں، پابندی کئے جاتے تھے۔ اور یہ قریب قریب یقینی ہے کہ یہاں کے معماروں کی قدیم عادت و ذوق کا تقاضا یہی تھا کہ وہ نئے قوسی طرز کی بجائے اپنی پہلی عمودی اشکال کی طرف زیادہ مائل ہوں ؛

ہم آئندہ مطالعہ کریں گے کہ گور میں معماروں کے پاس سوائے اینٹ کے دوسرا مسالا نہ تھا اور بغیر محراب بنائے بڑے دروازے تیار نہ ہو سکتے تھے، لہٰذا وہاں تو شروع سے مقوس طرز رائج رہا لیکن اس کے برخلاف احمد آباد میں جو لازماً ایک صنعتی علاقہ تھا، اور وہاں پتھر کی کچھ کمی نہ تھی، ستون کی اوضاع اسی عمومیت کے ساتھ کام میں لائی گئیں جس طرح جونپور میں بلکہ بہت مدت بعد تک یہی عملدرآمد رہا حتیٰ کہ اس ملک (گجرات) کے سلطنت مغلیہ میں ضم ہونے سے پیشتر ہی مقوس اور عمودی طرز عمارت پوری طرح ایک دوسرے سے گھل مل چکے تھے ؛

جونپور میں سب سے قدیم مسجد قلعے کے اندر، فیروز شاہ تغلق کے سپہ سالار ابراہیم نائب باربک کی تعمیر کردہ ہے جس کی تکمیل، جیسا کہ ایک کتبے میں تحریر ہے، ۷۷۸ھ ۱۳۷۷ء میں ہوئی تھی[۱]۔ یہ شمالاً جنوباً ۱۳۰ فیٹ اور کچھ بڑی مسجد نہیں ہے اور اس کے وسط میں صرف ایک عمارت ہے جس کی بڑی محراب، اس عہد کے عام اسلامی طرز کے مطابق، اور دونوں طرف پانچ پانچ در ستونوں کے درمیان بنائے ہیں۔ ستونوں کے سامنے کی قطار دوہری ہے اور ان میں سے باہر کے رُخ کے ستون چوکور اور اندر کے گول ہیں جن پر بڑے تکلف کے نقش و نگار ہیں۔ بظاہر یہ کسی مندر سے جو مسلمانوں کے قبضے سے قبل یہاں یا نواح میں تھا، لئے گئے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایسے کل ستون یہیں کام میں آگئے اور یہ ذخیرہ ختم ہو گیا کیونکہ بعد میں جو مساجد تعمیر ہوئیں ان میں ایسے ستون کہیں نہیں پائے جاتے[۲]۔

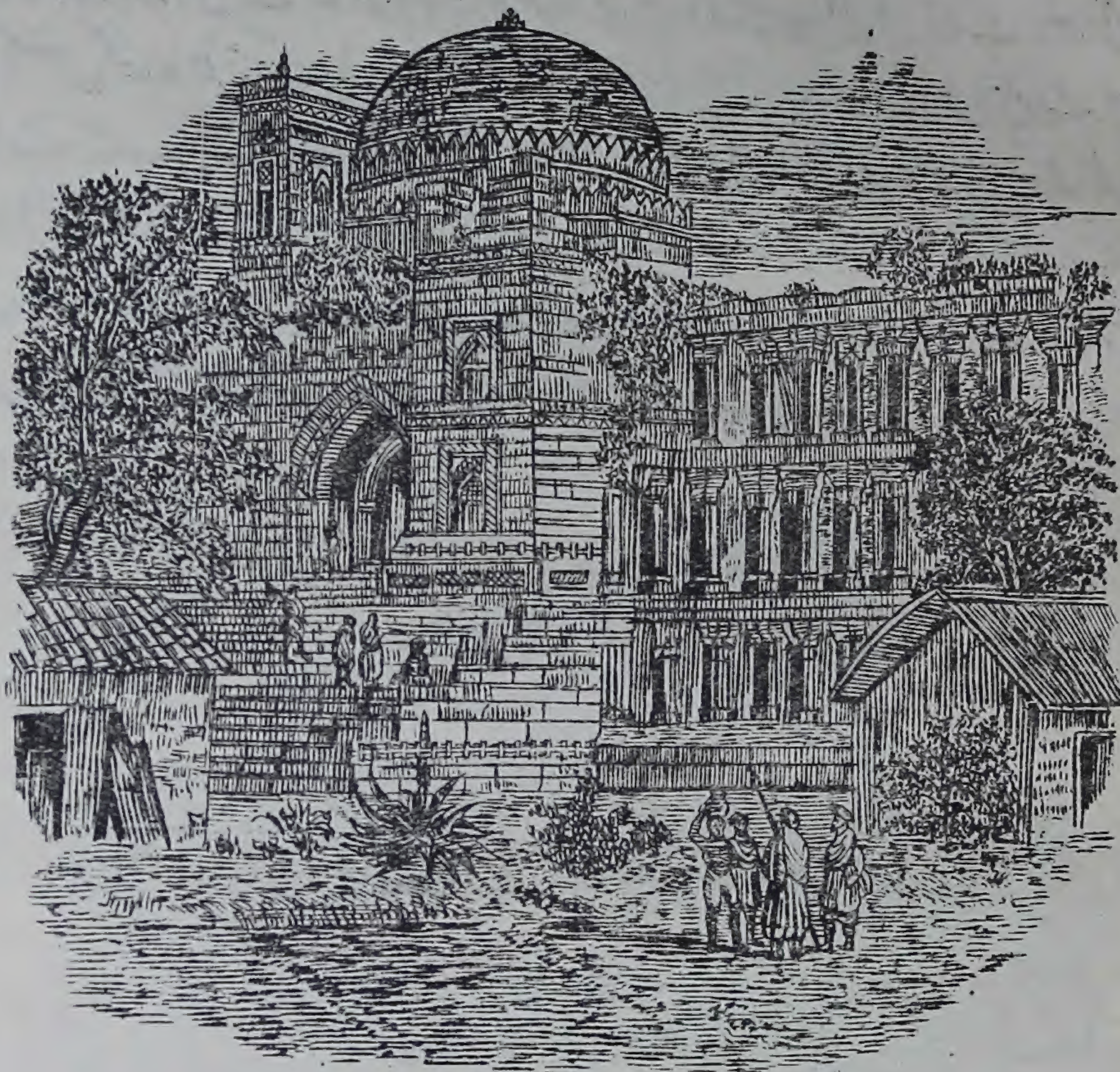
---

[۱] بلوخ مین نے یہ تاریخ ۷۷۸ھ پڑھی (روداد ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۷۵ء صفحہ ۱۸۱) اور خیر الدین نے اپنی تاریخ جونپور میں جس کا ڈگ سن نے ترجمہ کیا ہے (صفحہ ۴۱) اسے ۷۹۸ھ بتایا ہے جو ۱۳۹۶ء کے مطابق ہوا۔ [۲] اس مسجد کی ایک تصویر کٹو کی "انڈین آرکی ٹیکچر" میں اور نقشہ کننگھم کی رپورٹس

شہر میں اب تک تین بڑی مسجدیں سلامت ہیں ان میں سب سے عالیشان جامع مسجد ہے۔ جسے ابراہیم شاہ نے سنہ ۱۴۳۸ء میں شروع کیا مگر تکمیل حسین شاہ شرقی کے عہد (۱۴۵۲ء تا ۱۴۷۸ء) سے قبل نہ ہوئی۔ اسے سطح زمین سے ۱۶ تا ۲۰ فیٹ کی بلند کرسی دے کر تعمیر کیا ہے۔ اندر ۲۱۴ فیٹ ۴ × ۲۱۱ فیٹ ۶ کا صحن ہے اور مغرب کی طرف مسجد کی صدر عمارت کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ وسط کے رقبے پر ۳۹ فیٹ ۸ کے قطر کا ایک گنبد بنایا ہے جس کے سامنے قریب قریب مصری آثار اور نقشے کا ایک مخروطی دروازہ ۸۴ فیٹ بلند ہے۔ اس برج نما دروازے کی بلندی نے مأذنے کی ضرورت پوری کر دی ہے اور یوں بھی اذان کے لئے مینار کا ہونا جونپور میں اسی قدر کم متداول ہے جس قدر کہ اسی زمانے میں دار السلطنت دہلی میں اس کا رواج کم تھا یا نہ تھا۔ گنبد کے دونوں طرف ۴۲ فیٹ ۷ × ۲۵ فیٹ ۴ کے کمرے نکالے ہیں اور ستونوں پر پتھر کا فرش بنا کے انہیں دو منزلوں میں تقسیم کر دیا ہے اس کے آگے دونوں طرف پھر ۳۹ فیٹ ۷ × ۴۹ فیٹ ۳ کے کمرے ہیں جن پر جھکی ہوئی قبہ نما چھت اس طرح بنا دی ہے کہ اس کا بالائی حصّہ عمارت کی بیرونی سطح بن گیا ہے حالانکہ غوطی (Gothic) قبوں میں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ ان قبوں کی محرابیں نوکدار ہیں اور ان میں ٹیکے بنائے ہیں۔ ہر کمرے کی عقبی دیوار میں تین تین محرابیں ہیں یعنی نیچے کے درجے میں کل پندرہ اور اوپر کے کمروں میں دو دو محرابیں ہیں۔ صحن کے تینوں رُخ دہرے دالان بنے ہوئے تھے، جن کی دو منزلیں صحن کی سطح کے اوپر اور ایک منزل نیچے تھی۔ ہر ایک میں خوشنما در نکالے تھے جن میں سے جنوبی کی تصویر ذیل میں طرز عمارت کا خاصا اچھا اندازہ پیش کرتی ہے:

تصویر بر صفحۂ دیگر

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ (جلد یازدہم (لوح ۳۱) میں ملے گا۔



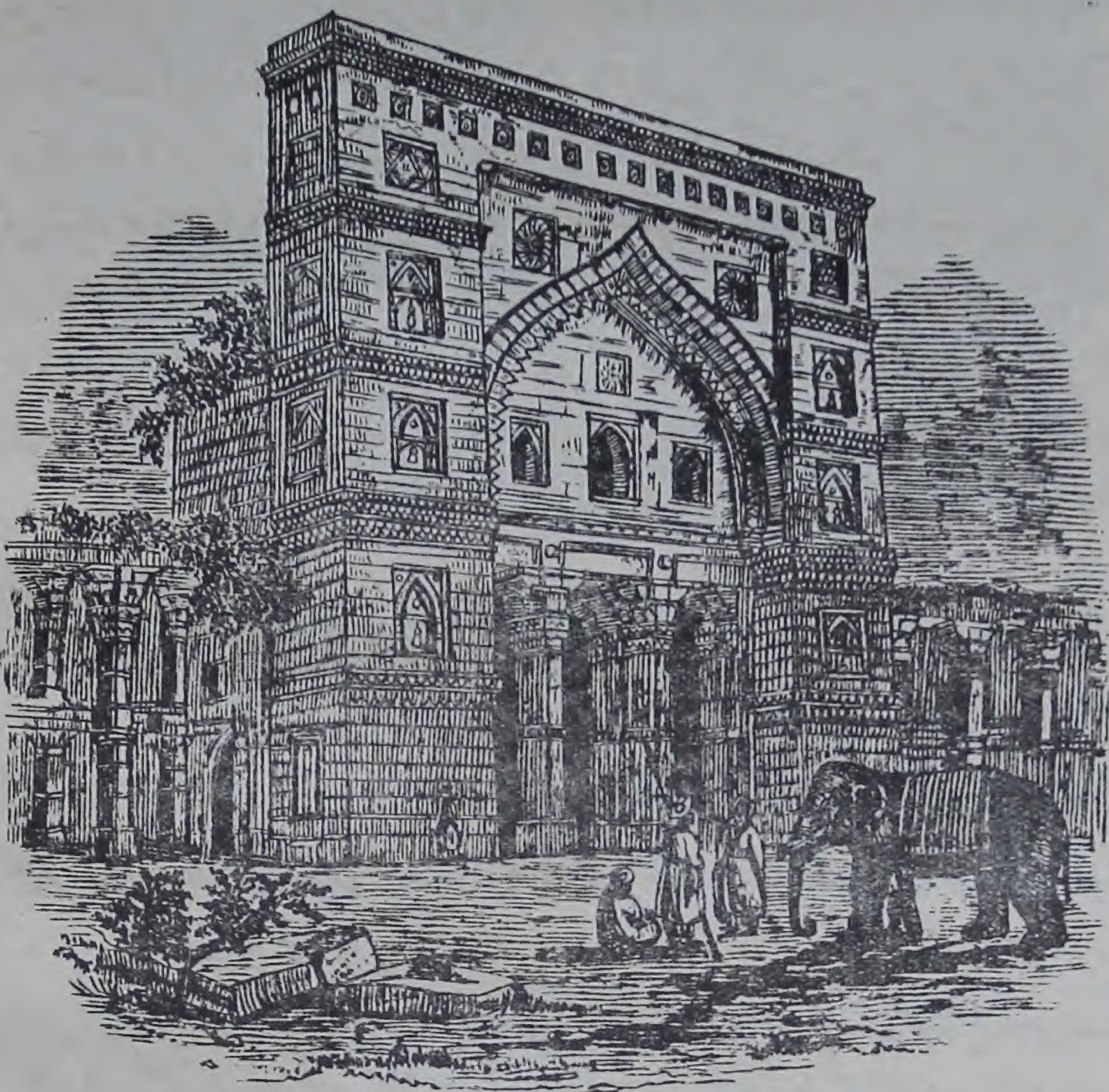
تصویر نمبر ۴۸ جامع مسجد جونپور کا جنوبی (بغلی) دروازہ

صحن کی مشرقی عمارات، اس طرف کا دروازہ اور دوسرے کمانچوں کی بالائی منزلوں کی نسبت مشہور ہے کہ سلطان سکندر لودھی نے حسین (۱۴۹۹ء تا ۱۵۱۰ء) کی کافر نعمتی سے بگڑ کر انھیں منہدم کرا دیا تھا اگرچہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ بہت عرصے بعد اُتاری گئیں ؎

شہر کی سب سے چھوٹی مسجد لال دروازے کی مسجد کہلاتی ہے جو شہر کے شمال مغربی حصے میں واقع ہے [۱] اس کا طرز وہی ہے جو دوسری مسجدوں کا۔ اور اس کے دروازے کا پیش جس کی تصویر آگے آتی ہے ان عمارتوں سے زبردست آثار کا

[۱] شرقی آرکیٹکچر اوف جونپور ص ۴۳ تا ۵۱ - نیز دیکھو لوحیں ۲۶ تا ۴۰ ؎

نمونہ ہے اور اسی کے ساتھ ہندو مسلم طرز تعمیر کی وہ عجیب مخلوط وضع بھی دکھاتی ہے جو اس مخلوط طرز کے سارے زمانے میں مروج رہی۔ مسجد کا طول ۱۶۸ فیٹ ۱۶ اور سامنے سے لے کے عقب تک عرض ۳۵ فیٹ ۴ ہے اور صحن ۱۳۲ ۱/۲ فیٹ شرقاً غرباً اور شمالاً جنوباً ۱۳۰ ۱/۲ فیٹ ہے۔ پہلوؤں پر کوئی ۷ ۱/۲ فیٹ عریض دالان بنے ہوئے ہیں اور شرقی سرے پر ان کا عرض ۱۶ فیٹ رہ جاتا ہے۔ دروازے کے پیش کا کل عرض نیچے ۵۴ فیٹ اور بلندی ۹۴ فیٹ ہے ؎



تصویر ۳۸۵ لال دروازے کی مسجد جونپور

جونپور میں جس قدر مسجدیں سلامت ہیں، ان میں سب سے مرصع اور خوبصورت

اٹالا مسجد ہے جس کی تکمیل ۱۴۰۸ء میں ہوئی۔ اس کے صحن کے گرد کے دالان پانچ گز کے ہیں۔ ان میں سے پہلے اور بیرونی درجے کے ستون دُہرے چوکور ہیں اور باقی چار قطاروں کے اکہرے ہیں جن پر پتھر کے چوکوں کی سپاٹ چھت ڈالی ہے جیسا کہ ہندو مندروں کا دستور ہے۔ یہ دو منزلہ عمارت ہے۔ نیچے کی منزل میں تین درجے کا دالان ہے۔ اس کے بعد حجروں کا سلسلہ ہے جو دوسری طرف کھلتے ہیں اور اسی طرف آخری گز پر برآمدہ بنا ہوا ہے۔ یہ ساری ترتیب اس قدر ہندی وضع کی ہے کہ پہلی نظر میں تو آدمی کو ہیرن ہنگل کی طرح یہی گمان گزرتا ہے کہ یہ دراصل پہلے کوئی بودھ مت کی خانقاہ ہوگی لیکن ہیرن کو یہ خیال نہ آیا کہ یہاں اور اسی طرح جامع مسجد میں حجرے باہر کے رُخ کھلتے ہیں اور جامع مسجد میں تو ان کی سطح صحن مسجد سے بھی نیچی ہے جو اسلامی عمارتوں میں تو بالکل عام ہے لیکن بودھی عمارات میں ایسا کبھی نہیں ہوتا علاوہ ازیں اس مسجد کے دروازے جو بیرونی صحن کا اصلی زیور ہیں، خالص اسلامی وضع کے ہیں اور مغربی دروازے کے سامنے تین پیش کمانچے بنائے ہیں جن کی وضع تو ویسی ہی ہے جیسی پچھلی تصویر میں نظر آتی ہے، لیکن حسن و تزئین میں کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ان پیش کمانچوں میں وسطی ۲۳½ فیٹ اونچا اور قاعدے پر ۴۶½ فیٹ عریض ہے اور دو چھوٹے ۱۴½ فیٹ بلند اور ۳۲½ عریض ہیں پھر اس کے اندر جو گنبد در پیش بنائے ہیں وہ جہاں تک اس قدیم زمانہ کا حال مجھے معلوم ہے اسلامی صنعت کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان کا یہاں ہونا اس لئے اور بھی ممتاز ہے کہ گویہ صحن کی نیم ہندی وضع کے مقابل ہیں: تاہم ان میں اسلامی معماروں کا قوسی طرز اس درجہ مکمل نظر آتا ہے کہ بعد کے کسی زمانے میں بھی اس سے بڑھ کر مکمل نہ ہوا ہوگا[1]۔

دوسری عمارتوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا غیر ضروری ہے اگرچہ دو طرزوں کے بیچ کے تغیر کا نمونہ ہونے کے لحاظ سے جونپور کی یہ عمارتیں وہ سادگی اور عظمت رکھتی ہیں جو اس طرز میں کم دیکھنے میں آتا ہے۔ فرید براں اسلامی دار دیوار یا

[1] "شرقی آرکیٹکچر اوف جونپور" ۳ دمالیہا۔ لوح ۲۹ تا ۴۰۔ معدودے چند ستون ہندو مندروں کے ہیں۔

بنا کے اُن میں استحکام کی ظاہری شان ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ اسلامی عمارات کا جو عام تخیل ہمارے ذہن میں ہے، اس سے الگ ہے گو تغلق آباد اور بعض دوسرے مقامات میں یہ بات جونپور سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے ترک و افغان بادشاہوں میں استحکام کا اظہار، طرز تعمیر کی ایسی ہی خصوصیت بن گیا تھا جیسا کہ انگلستان کے نارمن بادشاہوں کی عمارات کا بھاری بھر کم ہونا لیکن ہندوستان میں اس کے ساتھ جس درجہ نفاست پائی جاتی ہے وہ بہت کم کہیں ملے گی بلکہ دوسرے ملکوں میں تو استحکام اور عالی ہمتی کی عمارات میں عموماً بھدا پن آگیا ہے اور یہاں یہ بات بالکل نہیں ہے ؎

اس طرز کی خصوصیات پائے تخت جونپور ہی تک محدود نہیں بلکہ غازی پور اور جنوب میں قنوج تک ان کا اثر موجود ہے اور بنارس میں بھی ان کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اس شہر کی نواح میں بکریا کنڈ نامی مقام پر ایک مجموعۂ مقابر ہے لے جس کا پہلے بھی ہم ذکر کر چکے ہیں۔ ان کے ماسوا ابھی بعض اسلامی عمارتیں بنی ہوئی ہیں جو جونپور کے طرز تعمیر کا نہایت دلکش نمونہ اور یقیناً اسی زمانے کی ہیں، جس کی عمارات کا ہم نے اوپر حال لکھا ؎

مملکت جونپور میں بہت سے چھوٹے مقبرے اور خانقاہیں بھی پائی جاتی ہیں، جن میں مسلمانوں نے ہندو اور جینی ستونوں سے کام لیا اور محض ان کی ترتیب بدل دی ہے فن کے اعتبار سے یہ تفصیل و تنقید کے قابل نہیں لیکن ان میں ہر جگہ کچھ ایسی ناقابل بیان خوشنمائی ہے کہ یہ خواہی نخواہی خراج تحسین وصول کر لیتی ہیں۔ اس مرکب طرز کا خاص نمونہ جونپور کی وہ مسجد ہے جسے عام لوگ "سیتا کی رسوئی" کہتے ہیں۔ یہ ایک جینی مندر معلوم ہوتا ہے جس کی ترتیب اسی طرح بدل کے مسجد بنا لیا گیا ہے۔

لے اگر یہ عمارتیں احمد آباد کے بیس میل تک کے فاصلے پر ہوتیں جہاں بیسیوں ایسی اور موجود ہیں، تو ان کا تذکرہ کچھ بھی ضروری نہ ہوتا، اور ہر شخص جو اس طرز عمارت سے واقف ہے، ان کا زمانہ، سنہ ۱۴۵۰ء یا کچھ پہلے یا بعد تجویز کر لیتا اور بانی کا پتہ چلانے کی کوئی ذرہ برابر ہی سنہ اٹھاتا کیونکہ اس عہد کی بہت سی دوسری عمارتیں اسی قسم کی پائی جاتی ہیں ؎

جس طرح کہ ہم پہلے بعض عمارات کا ذکر کر آئے ہیں[۱]۔ آثار سمیت اس کی پیمائش ۱۳۳ × ۱۲۰ فیٹ ہے۔ مسجد کی اصل عمارت میں ۱۵، ۱۵ استونوں کی ۴ قطاریں اور تین گنبد ہیں۔ پہلوؤں میں صرف دہرے دالان اور صدر عمارت کی نسبت ذرا چھوٹے ستون ہیں جن کی اصل تعداد ۶۸ تھی۔ باہر سے اس مسجد میں کوئی خاص خوبصورتی نہیں لیکن اندر کے ستونوں سے صحن مسجد میں عجیب دلکشی اور خوبی پیدا ہوگئی ہے۔ اس کے بڑے دروازے پر جو کتبہ لگا ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے ابراہیم شاہ شرقی نے ۱۴۰۶ء میں مسجد کی صورت میں مکمل کیا[۲]۔ بعد کے زمانے میں، اور خود مختاری کے ہاتھ سے چلے جانے کے بعد بھی، جونپور اور اس کے توابع میں چند اعلیٰ درجے کی عمارتیں اسی عہد کے طرز تعمیر میں تیار ہوئیں لیکن ان کی اتنی اہمیت نہیں معلوم ہوتی کہ ایسی کتاب میں جیسی کہ ہماری ہے، انکا تذکرہ ضروری ہو۔

[۱] دیکھو کتاب ہذا صفحہ ۶۸، ۶۹۔

[۲] کننگ ہیم رپورٹس۔ جلد اول، ۲۸۷ اسی کتاب سے مجھے معلوم ہوا کہ صحن مسجد کے جو ستون ۱۸۳۶ء میں میں نے دیکھے تھے، وہ ۱۸۵۷ء سے کچھ قبل وہاں سے اٹھوائے گئے۔

باب پنجم

گجرات

احمد آباد کی جامع مسجد اور دوسری مسجدیں۔ سرکھیج اور بٹوا کے مقبرے اور مسجدیں۔ اضلاع کی عمارات ؛

سنین

مظفر شاہ والیٔ گجرات .... سنہ ۱۳۹۱ء
اس کا پوتا احمد شاہ۔ احمد آباد کی تعمیر کرتا ہے .... سنہ ۱۴۱۱ء
محمد شاہ رحمدل .... سنہ ۱۴۴۱ء
قطب الدین۔ رانا کنبھ سے جنگ .... سنہ ۱۴۵۴ء
محمود شاہ بیگڑا .... سنہ ۱۴۵۹ء
مظفر شاہ ثانی .... سنہ ۱۵۱۱ء
بہادر شاہ مقتول (بدست پرتگیزاں) .... سنہ ۱۵۳۶ء
مظفر شاہ ثالث .... سنہ ۱۵۶۱ء
گجرات کا الحاق اکبری سلطنت میں .... سنہ ۱۵۷۲ء

اسلامی فن تعمیر نے ہندوستان میں جس قدر مختلف صورتیں اختیار کیں،

ان میں غالباً سب سے نفیس احمد آباد کے طرز تعمیر کو سمجھا جائے گا اور اس کے سب سے زیادہ خاص ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ کوئی طرز اس درجہ ہندوستانی نہیں ہے اور کسی دوسرے طرز سے اس کی حقیقت اتنی قطعی طور پر واضح نہیں ہوتی ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا، مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری میں سندھ و گجرات پر بڑی آن بان کے ساتھ حملہ کیا اور بظاہر اسے بھی فتح کر لیا لیکن ملک اتنا آباد اور اس کا تمدن ایسا اعلیٰ تھا کہ حملہ آور یہیں جذب ہو کر بہت جلد نظر سے غائب ہو گئے۔[۱]

اس کے بعد محمود غزنوی نے صوبہ گجرات پر یورش کی لیکن کوئی مستقل نشان اپنا نہ چھوڑا اور سقوط دہلی (۱۱۹۶ء) کے بعد بھی گجرات اور ایک صدی تک اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کرتا رہا تا آنکہ سلطان علاء الدین خلجی نے اسے راجہ کرن واگھیلا سے چھین لیا اور اپنے صوبہ دار مقرر کئے۔ محمد شاہ ثالث تغلق نے ۱۳۹۱ء میں منظفر کو والی گجرات مقرر کیا جو تاک قبیلے کا راجپوت نو مسلم تھا۔ اسی کے قریب زمانے میں تیموری حملہ نے ہندوستان میں ہل چل ڈال دی گجرات پہلے بھی عملاً آزاد تھا مگر ۱۳۹۶ء میں منظفر نے باضابطہ خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ آئندہ دو صدیاں جن میں احمد شاہی خاندان سر آرائے سلطنت رہا ہمسایہ ریاستوں اور سرکش باجگزاروں کے ساتھ مسلسل جنگ و جدال میں صرف ہوئیں لیکن مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ بہادر شاہ کی وفات (۱۵۳۶ء) تک ان کی طاقت بڑھتی رہی اگرچہ اپنی رعایا کے جذبۂ تمرد کو وہ قطعی طور پر مغلوب نہیں کر سکے اور انکی بڑی تعداد کو اپنے دین کا پیرو تو یقیناً نہیں بنا سکے۔ یہی سبب ہے کہ اس باب میں جن خاص خاص عمارتوں کا ذکر ہے، وہ پایۂ تخت یا اس کے بالکل قرب وجوار کی ہیں۔ اس کے آگے ہندو اپنے قدیم مذہب پر قائم اور پہلے کی طرح مندر بناتے رہے گو ظاہر ہے کہ دھولکا، کھمبائت، بڑودہ وغیرہ

۱؎ گجرات میں عربوں نے مستقل طور پر کوئی حکومت نہیں قائم کی مگر سندھ میں ان کا تمدن اب تک غالب اور آبادی ۳، فیصدی مسلمان ہے۔ مترجم.

بڑے بڑے شہروں میں مسلمانوں کے معبد موجود تھے جن میں سے بعض خاص وقعت رکھتے ہیں اور انھیں عام طور پر ہندو عمارتوں کے ستون لے کے بنایا ہے ۔

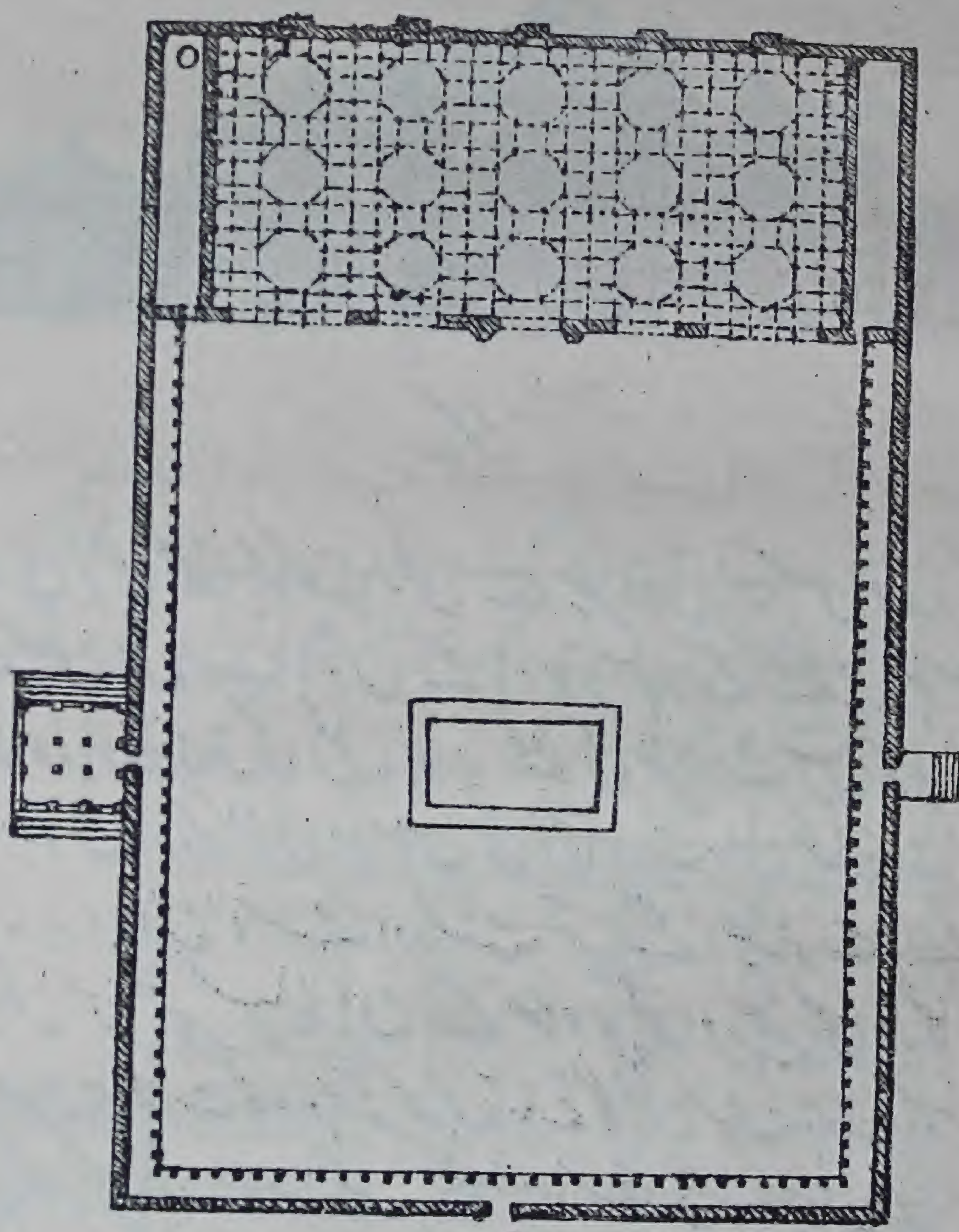
خود احمد آباد میں ہندو اثرات آخر تک سارہی ہیں۔ مسجدیں تک جزئیات کے اعتبار سے بھی ہندوانی یا کہنا چاہئیے کہ جینی وضع میں ہیں۔ کہیں کہیں کوئی محراب بنادی ہے جس کی غرض یہ نہیں کہ وہ عمارت کے لئے ضروری تھی، بلکہ یہ ہے کہ ایک اسلامی نشان موجود رہے اور مقابر ومحلات میں تو عام طور پر ایسی محرابیں بھی ندارد ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ گجرات کی ہندو حکومت مسلمانوں کی فتح سے قبل تمدن کے بلند درجہ تک ترقی کرچکی تھی۔ سدھپور، پٹن، ڈھیرا وغیرہ مقامات کی عمارتیں گجراتی نسل کی تعمیری قابلیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ مسلمانوں نے اس نسل کو جبراً مغلوب کیا لیکن اس نے اپنے فاتحین کو مغلوب اور مجبور کردیا کہ وہ اوضاع اور وہ اسباب تزئین اختیار کریں جن سے بہتر فتحمندوں کے پاس نہ تھے نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے طرز عمارت میں جینی یا چالوکیہ صناعی کی نفاست وجلا کے ساتھ ایک خاص قسم کی وسعت تخیل شامل ہوگئی جس تک ہندو کبھی نہ پہنچے اور جو اس قوم کی خصوصیت ہے جو اندنوں تمام ہندوستان کو اپنے زیر نگیں لارہی تھی ۔

اسلامی حکومت کا پہلا مستقر انہلواڑہ تھا جو ملک گجرات کی پرانی راج دہانی اور مسلمانوں کے ہاتھ آنے کے وقت یقیناً ممالک ایشیا کے شاندار ترین شہروں میں داخل ہوگا۔ اس شان وشوکت کا اب بہت کم نشان باقی رہ گیا ہے ۔

گجرات کے دوسرے بادشاہ احمد شاہ نے انہلواڑہ سے دارالسلطنت بدل کے ایک مقام کرناوتی میں منتقل کیا اور یہ جگہ اسی بانی شہر کے نام پر آئندہ احمد آباد موسوم ہوی اسے بساتے ہی اپنی جبلی مستعدی سے احمد شاہ نے عالیشان عمارتوں سے اس کی زیب وزینت بڑھائی۔ ان میں سب سے ممتاز جامع مسجد ہے

۱؎ مولف نے اس تمام بیان میں غضب کا مبالغہ کیا اور مسلمانوں سے اپنے عجیب تعصب کا ثبوت فراہم کردیا ہے۔ نقشے کی وسعت، تعمیر کی اولوالعزمی پھر محض گنبد ومینار کے اضافے سے گجرات کی اسلامی عمارتوں میں جو حسن پایا جاتا ہے اس کا غیر اسلامی عمارات میں سان گمان بھی نظر نہیں آتا۔ باوجود اس مسلمہ حقیقت کے فاضل مولف گویا بیقرار ہے کہ صنعت وبنا کی یہ فضیلت مسلمانوں سے چھین کر دوسروں کے حوالے کردیجائے۔ مترجم۔

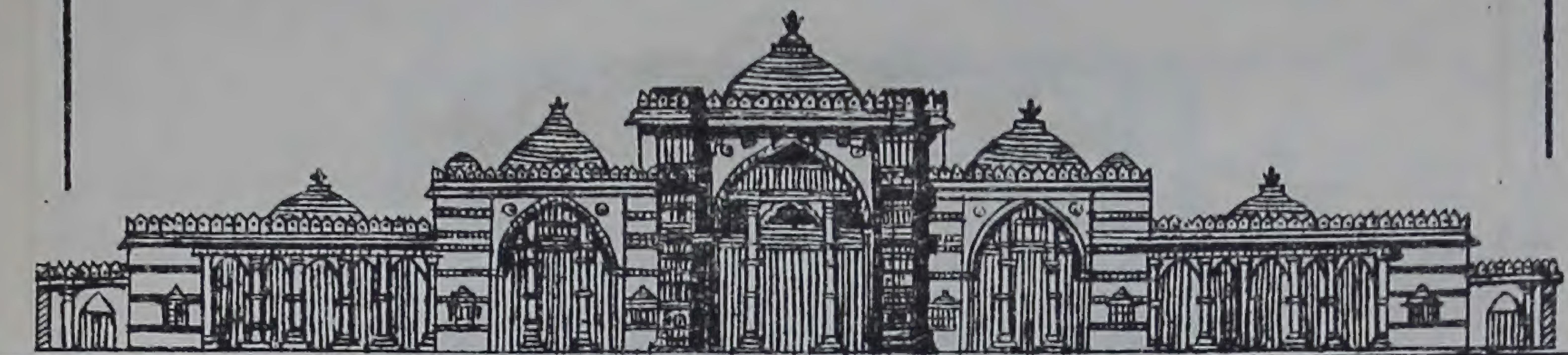
جو بہت بڑی تو نہیں لیکن ممالک ایشیا کی سب سے خوبصورت مساجد میں شمار ہوتی ہے۔ اس کی ترتیب آئندہ نقشے سے واضح ہوگی اس کا طول ۳۸۲ اور عرض ۲۵۸ فیٹ ہے مگر اصل عمارت مسجد ۲۱۰ × ۹۵ فیٹ یعنی تقریباً ۲ ہزار مربع فیٹ پر بنی ہوئی ہے مسجد کے اندر ۲۶۰ ستون پندرہ گنبدوں کو اٹھائے ہوئے ہیں جن کو کمال تناسب کے ساتھ تعمیر کیا ہے اور صرف بیچ کے تین گنبد باہر اور



نقشہ ۳۸۶

دوسروں سے خاصے زیادہ اوپر اٹھے ہوئے ہیں۔ اگر اس نقشے کا رانپور کے مندر سے مقابلہ کیا جائے جو قریب اسی زمانے میں احمد آباد سے ایک سو ساٹھ میل کے اندر کنبھ رانا کے زیر نگرانی تعمیر ہوا تو اس زمانے کی جینی اور اسلامی

ترتیب کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا۔ ستونوں کی شکل اور عموماً جزئیات تقریباً، دونوں عمارتوں میں یکساں ہیں گو ہندوؤں کے ہاں زیادہ آرائش اور صناعی صرف کی گئی ہے۔ مسجد کا نقشہ بھی مندر کی نسبت زیادہ سادہ اور یکساں چلا جاتا ہے اگرچہ گنبدوں کی مختلف بلندیوں نے اس میں کچھ تنوع پیدا کر دیا ہے



تصویر ۳۸۷

اور ہر شعبے کی کرسی عمداً مختلف رکھی ہے میرا ذاتی احساس مندر کی شعریت کا ہمنوا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود مسجد کے نقشے میں جو سنجیدگی پائی جاتی ہے ممکن ہے کہ وہ زیادہ بہتر ذوق کی دلیل ہو۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ دونوں نقشے ہزار ہزار ستون کے جنوبی ایوانوں کی اکتا دینے والی یکسانیت پر فوقیت رکھتے ہیں۔ یہ ایوان، وسعت اور محنت تعمیر کے اعتبار سے بے شبہ ممتاز نظر آتے ہیں لیکن حسن تعمیر کیلئے ان کے علاوہ کچھ اور چیز بھی درکار ہوتی ہے۔ جو پچھلی تصویر سے عمارت کا عام نقشہ سمجھ میں آجائے گا لیکن افسوس ہے اس کے مینار ٹوٹ گئے جس وقت فورنیس نے اس کا خاکہ لیا تو وہ سلامت تھے[1] اور مشرقی روایتوں میں احمد آباد کے لرزتے میناروں کے نام سے شہرت رکھتے تھے۔ ۱۸۱۹ء کے ایک زلزلے نے انہیں بالکل ہی لرزا دیا۔ مگر شہر میں بعض اور مینار موجود ہیں جن سے ان کی

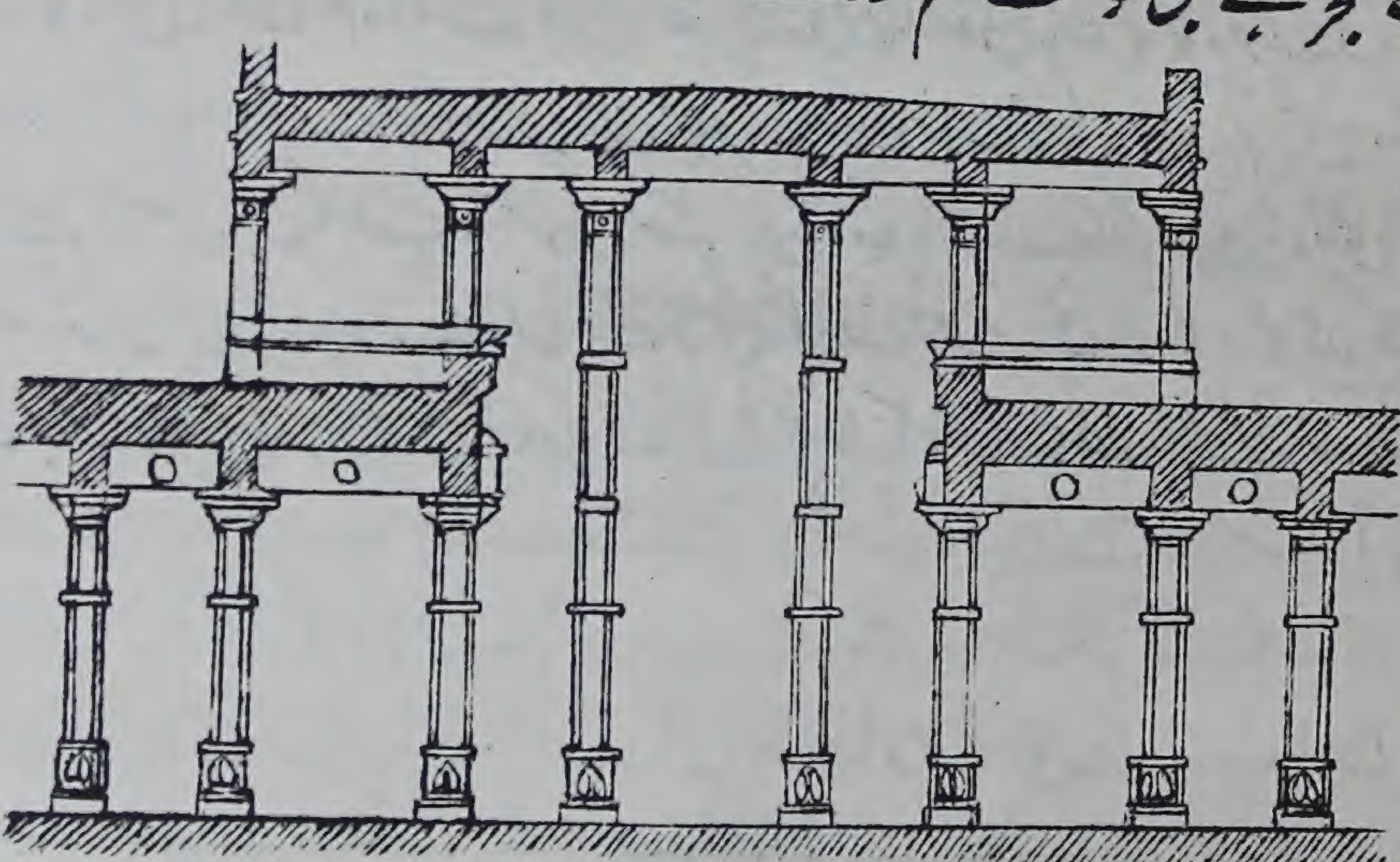
[1] فورنیس، "اورینٹل میموائرز"۔ جلد سوم۔ باب سیم" دیکھو "آرکیولوجیکل سروے آف ویسٹرن انڈیا" ہشتم۔ ۳۰ ۔

شکل دوبارہ تیار کی جا سکتی ہے :
جامع مسجد کے پہلو اور نقشہ معمول کے خلاف ہیں ورنہ احمد آباد کی مسجدوں کی عام صورت وہ ہوتی تھی، جو رانی روپ ونتی یا "ملکہ کی مسجد" واقع محلہ میرزا پور کی ہے جس میں ۱۲، ۱۲ ستونوں پر تین گنبد ہیں اور وسطی گنبد اتنا اونچا رکھا ہے کہ اندر روشنی پہنچ سکے۔ اس کے نقشے کی تصویر کو سمجھانے کی غرض



تصویر ۳۸۹

سے ہم نے ایک اور شکل بنائی ہے جس سے اس کے گنبدوں کے ستونوں کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے کہ بیچ کے گنبد والے دوسروں سے دُگنے اونچے ہیں اور چھت پر بھی چھوٹے چھوٹے ستون دے کے اس بلندی کو پورا کر دیا ہے۔ ان کے سامنے مُجّر ہے جس کو عام طور سے



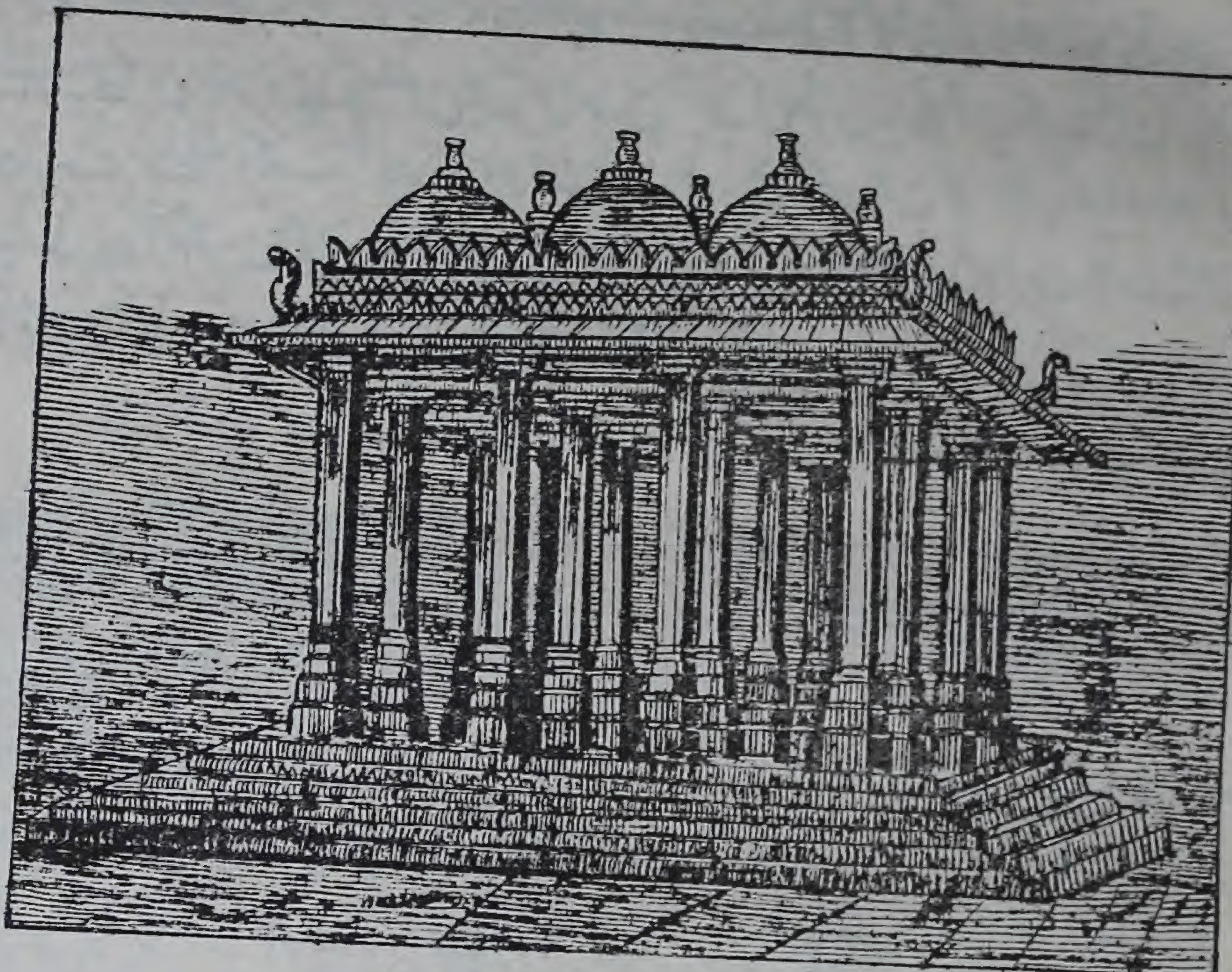
تصویر ۳۹۰

بڑے تکلف سے سنگ تراشی اور نقش و نگار سے آراستہ کرتے ہیں۔ اس

ترکیب سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کافی مقدار میں روشنی اندر آجاتی ہے جس طرح کہ باہی زنطی گنبدوں میں۔ فرق اتنا ہے کہ یہاں باہی زنطی گنبدوں سے زیادہ صناعی اور خوشنمائی پیدا ہوگئی ہے۔ سورج کی شعاعیں فرش تک بلکہ کھڑے آدمی کے سر تک نہیں پہنچ سکتیں بلکہ گنبد کی بیرونی چھت سے ان کی روشنی چھن کر اندر آتی ہے اور ہوا کے بہترین انتظام کے ساتھ عمارت بغیر خیرگی کے ایسی روشن رہتی ہے کہ دیکھنے سے لطف آتا ہے۔ سب سے آخری خطرے سے بچاؤ کی غرض سے عموماً ان مسجدوں میں چھوٹے ستونوں کے آگے پتھر کی بہت باریک جالی لگا دیتے تھے۔ یہ اکثر اعلیٰ درجے کے کام کی اور نہایت خوبصورت ہوتی تھی، اسی لئے بارہا اڑالی جاتی تھی۔

مذکورہ بالا وضع کی تین یا چار مسجدیں احمد آباد میں بنی ہوئی ہیں لیکن بتدریج اس طرز میں ہندی پن آتا گیا۔ اکثر اوقات سامنے کی محرابیں چھوڑ دی جاتیں اور صرف ستونوں کی قطار پر چھت ڈال دیتے جن کے گوشوں پر مینار ہوتے تھے۔ اس وضع کی سب سے بڑی ترقی شہر سے کوئی پانچ میل دور سرکھیج میں نظر آتی ہے۔ سنہ ۱۴۴۶ء میں محمد شاہ نے یہاں اپنے باپ کے مشیر ندیم احمد گنج بخش کی یادگار میں ایک ۱۰۲ فیٹ مربع مقبرے کی بنا ڈالی۔ ان عمارتوں کی وضع کا اندازہ اگلی تصویر سے ہوگا جس میں مقبرے کے سامنے کی سولہ دری دکھائی گئی ہے۔ اس میں حسب معمول نقشہ سیدھا سادہ ہے، کہ مربع، اونچی کرسی، چوکور ستون جن میں سوائے اس کے کوئی تکلف نہیں ہے کہ پائے بتدریج چوڑے ہوتے جاتے ہیں اور ستون کو اوپر کے رخ پھیلا کے خفیف سا جھکاؤ دے دیا ہے۔

تصویر برصفحۂ دیگر

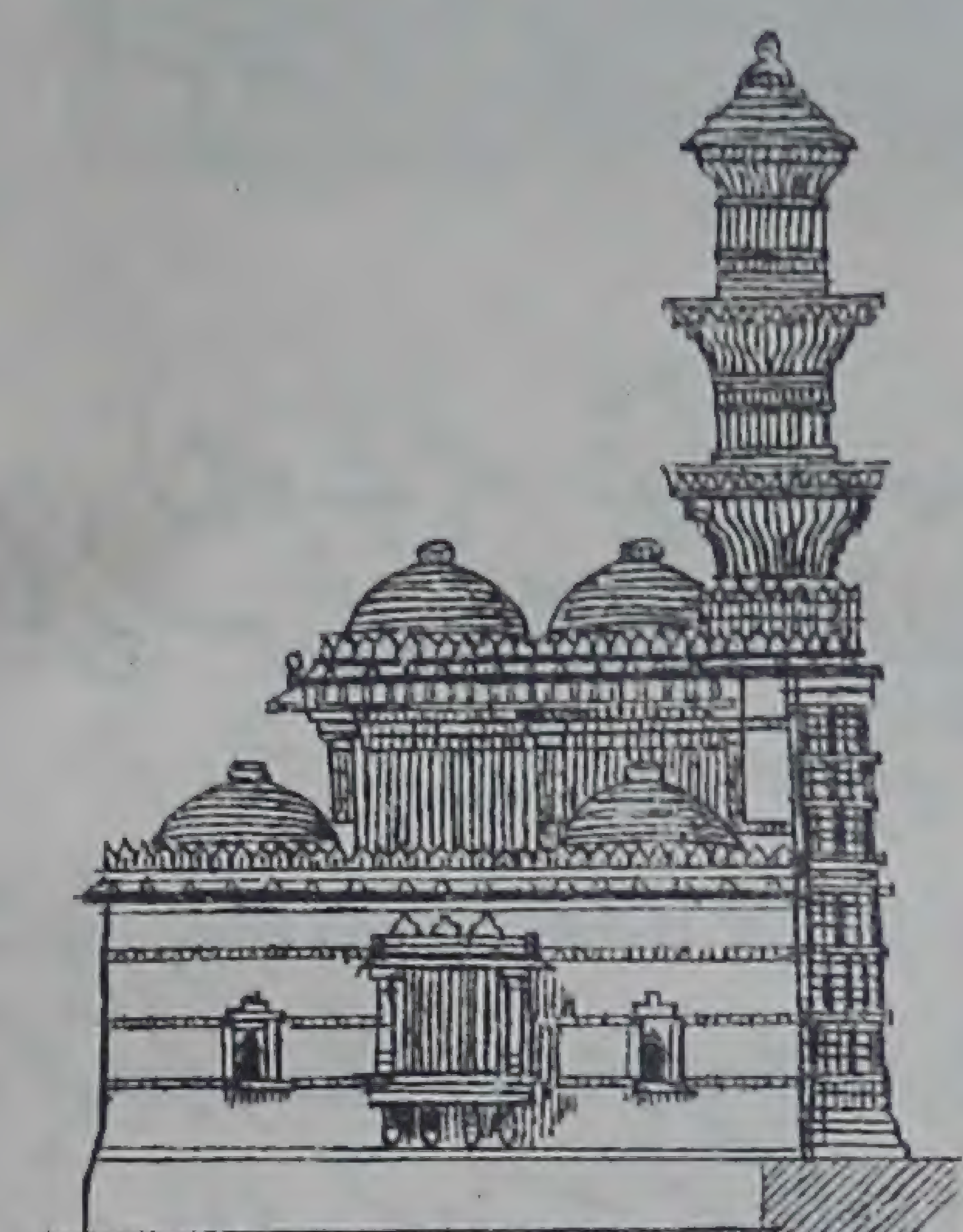


تصویر ۳۹۲

۲۳۵ اوپر نو چھوٹے چھوٹے گنبدوں کی چھت ہے جو بجائے خود کوئی وقعت نہیں رکھتے لیکن اس قسم کی چھوٹی عمارتوں پر، اندر سے دیکھیے یا باہر سے، اس سے بہتر و خوش وضع چھت ڈالنے کا طریقہ مشکل سے کہیں نظر آئے گا۔ اس مجموعہ عمارات میں مسجد جو اندر سے ۱۴۱ × ۶۵ فیٹ ہے ۱۴۵۱ء میں تکمیل کو پہنچی اور آخر میں محمود بیگڑا نے ایک مقبرہ ۴۸ مربع فیٹ کا اپنے واسطے اور ایک اپنی بیوی راجہ بائی کے واسطے تعمیر کرایا۔ ان کے ساتھ اور کئی مقبرے اور محل بنے ہوئے ہیں اور یہ سب مل کر اس نواح کا سب سے اہم مجموعہ عمارات ہو گئے ہیں۔ ان میں کہیں محراب سے کام نہیں لیا۔ ستون کی دیوار گیریوں کی وضع بھی ہندی ہے اور گنبدوں کو عمودی اصول پر تعمیر کیا گیا ہے۔ بڑے مقبرے میں کوشش کی ہے کہ مثمن کمرے سے زیادہ جگہ نکال کر بارہ ستونوں پر کلاں تر گنبد بنایا جائے لیکن کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ دوازدہی شکل ساتھ کی عمارتوں سے

میل نہیں کھاتی اور اس کے لئے یا تو زیادہ وسیع جگہ چھوڑنی تھی یا بارہ سے زیادہ پہلو بنانے مناسب ہوتے ۔ مسجد، البتہ، حسن سادہ کا کامل نمونہ اور جامع مسجد کے نقشے سے بھی بہتر ہے۔ اس میں بھی جامع مسجد کی طرح پانچ گنبد ہیں لیکن ایک
دوسرے سے نزدیک تر اور باوجود قطر زیادہ ہوتے کے ان کا عرض کم اور دو گ ۲۳۶
کا رکھا ہے۔ آگرے کی موتی مسجد کے سوا جس کا ذکر آگے آئے گا، ہندوستان کی کوئی مسجد نفاست کے اعتبار سے ایسی قابل دید نہیں ہے۔

ان بڑی مسجدوں کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی نہایت خوبصورت مسجدیں ہیں جن میں محافظ خاں اور رانی سیپری کی مسجد سب سے ممتاز ہیں۔ پہلی کی صدر عمارت کا سرا جو ۱۴۹۲ء میں تکمیل کو پہنچا، کچھ خوشنما نہیں لیکن اس کے اجزا نہایت عمدہ ہیں اور حسن اتفاق سے اس کے مینار بھی سلامت رہ گئے ورنہ پرانی عمارتوں میں ایسا کم ہوتا ہے۔[1] ذیل کی تصویر، نیز جامع مسجد وغیرہ کی گزشتہ تصویروں سے اندازہ ہوگا کہ ان میناروں کا نچلا حصہ خالص ہندی وضع کا ہے۔ احمد آباد میں تمام پائے بالکل ہندو یا جینی مندروں کی کرسیوں کی مثل عمودی ہیں اگرچہ انہیں زیادہ لمبا کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسری اوضاع و جزئیات بھی سب وہی ہیں جو چندراوتی یا آبو (کی ہندو عمارتوں) میں نظر آسکتی ہیں البتہ ایک فرق ضرور ہے کہ ہندو مندروں کے گوشوں میں طاق بنا کے مورتیں رکھ دی جاتی ہیں ظاہر ہے کہ مسلمان اسے گوارا نہ کر سکتے تھے لہٰذا وہ ان میں بیل بوٹے کندہ کر دیتے ہیں۔

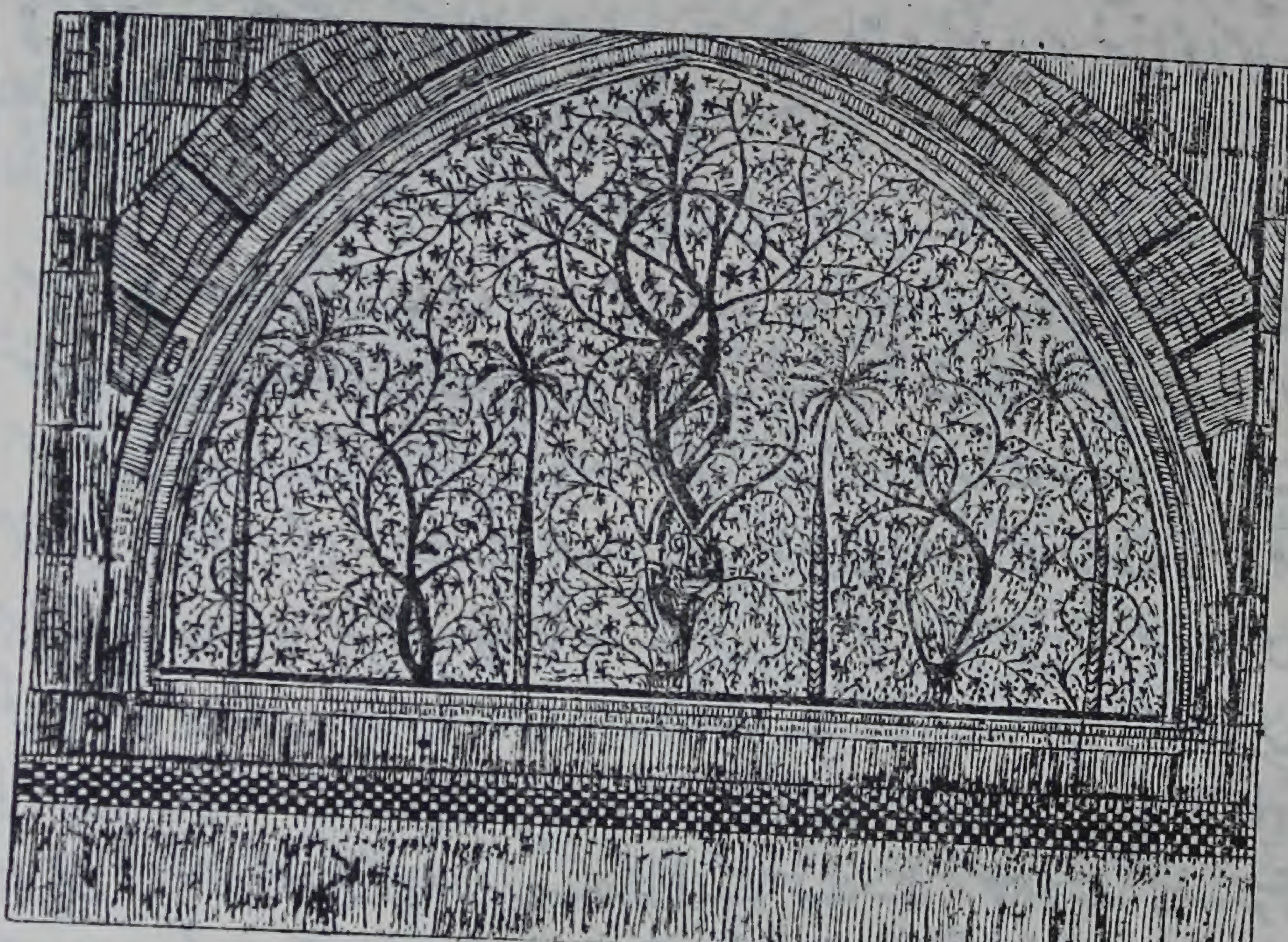


تصویر ۳۹۳

[1] گجرات کے تمام قدیم مینار یا گنبدوں کے کلس پر ترشول کا تہ ہوتا تھا۔ لیکن تقریباً تیس سال ہوئے اس مسجد کی محکمہ تعمیرات نے مرمت کرائی تو اس کی بجائے ترکی ہلال بنا دیا۔ حالانکہ اس مسجد کی تعمیر کے وقت شاید خود ترکوں نے اس نشان کو اختیار نہ کیا ہوگا کیونکہ فتح استنبول کے بعد سے یہ نشان ان میں مروج ہوا ہے۔

بقیہ برصفحہ دیگر

جامع مسجد کے ابتدائی کوشش سے لے کے ملکہ کی مسجد (واقع مرزاپور) کے نفیس ترین نمونوں تک ہم اس وضع کے تدریجی ارتقا کا معائنہ کر سکتے ہیں۔ ایک صدی کی مشق سے انہوں نے جو جو شکلیں ایجاد کیں وہ تعمیری زیب و زینت کے اعتبار سے دنیا کے ہر ملک اور ہر زمانے کی اوضاع زیبائش سے مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اسی سلسلے میں یہاں کے مسلمانوں نے دریچہ کاوی کی ایک نئی صنعت اختراع کی اور اس میں بھی ان کا جواب نہ تھا۔ ذیل کی تصویر میں سیدی سید کی مسجد کے دریچے



تصویر ۳۹۴

کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ مسجد محل کے احاطے (بھدر) میں ہے اور اب توڑ کر خراب کر دی گئی ہے۔ تاہم اس تصویر سے صنعت مذکور کی باریکی اور خوشنمائی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ اس مسجد کے تفصیلی حالات "آرکیولوجکل سروے آف ویسٹرن انڈیا" جلد ہفتم" لوح ۹۷ تا ۱۰۴ میں تصاویر کے ساتھ کافی وضاحت سے درج ہیں۔

کا اندازہ ہوگا۔[1] حق یہ ہے کہ جس ہنرمندی سے اس میں نباتی اشکال کو اسی حد تک باقاعدہ نقوش کی صورت میں مرتب کیا ہے جس حد تک یہاں ضرورت تھی، اس سے بہتر صناعی کی نظیر ملنی دشوار ہے۔ پھر جس طرح تین معمولی اور چار کھجور کے درختوں کو مساوی فصل دے کے تراشا ہے، اس میں نہ تو محض قدرتی اشکال کی نقل ہے اور نہ ان میں سے پھول پتے نکالنے کا اصل مقصد ہاتھ سے جانے دیا ہے پھر جس ہمواری کے ساتھ نقوش کو پوری سطح پر پھیلایا ہے، غالباً یہ سب سے بڑھکر کمال کا نمونہ ہے۔ دہلی اور آگرے میں قیمتی مرمر تراشی کے بعض لاجواب نمونے ملتے ہیں لیکن اس صناعی کا وہ بھی پوری طرح مقابلہ نہیں کر سکتے۔

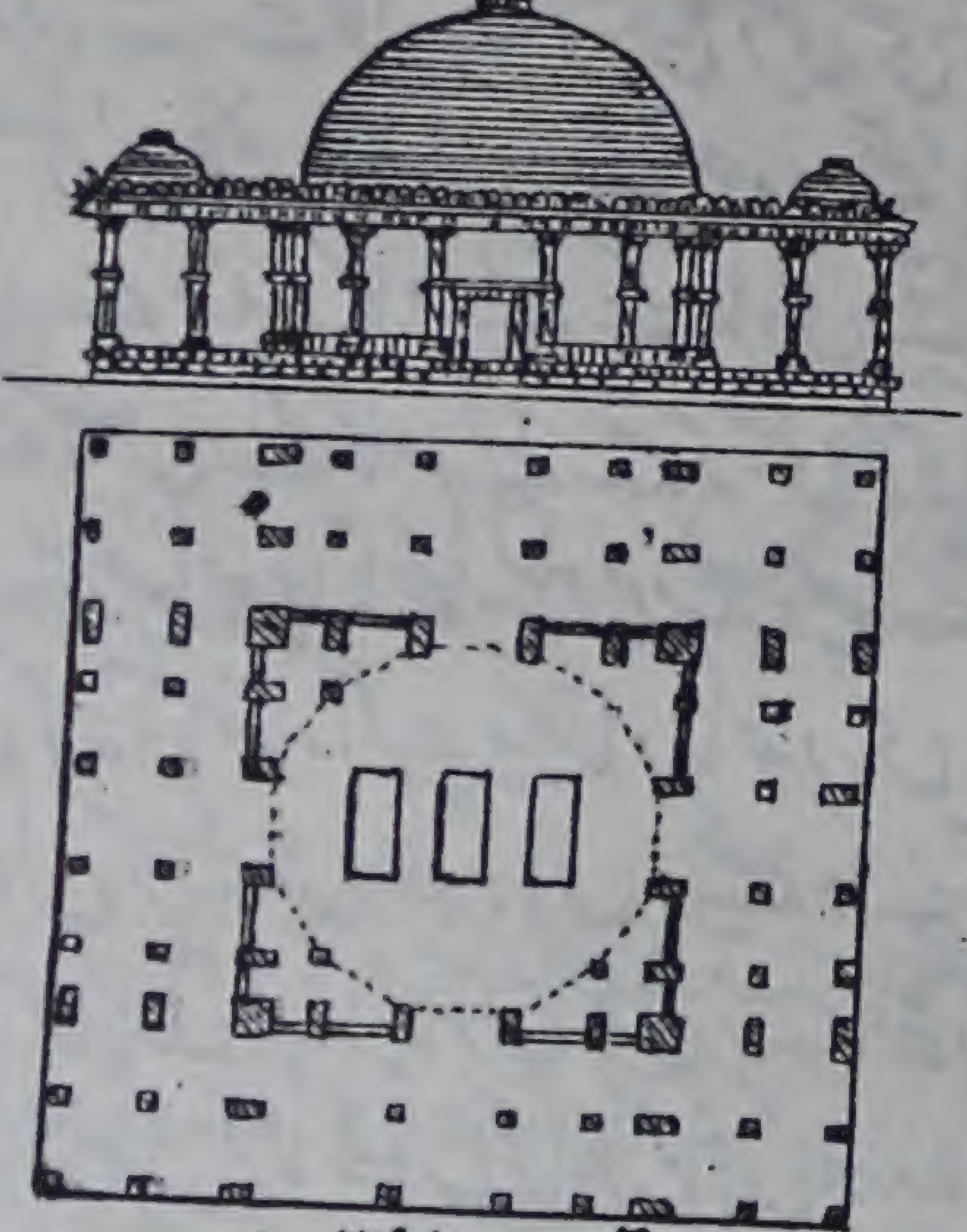
مسجدوں کی چھت پر مینار ہمیشہ گول اور قدرے مخروطی بنائے گئے ہیں جیسا کہ محافظ خاں کی مسجد کی تصویر میں دکھایا ہے۔ اور ان میں چھجے نکال کے تنوع پیدا کیا ہے۔ ان کی دیوارگیریوں میں بڑے تکلف کا کام کیا ہے اور اسی طرح کنگوروں میں، جو ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اوپر کے سرے پر ہمیشہ مخروطی وضع کی برجی بنا دیتے تھے اور اس میں بھی ٹیڑیاں ڈالتے کہ سپاٹ نہ معلوم ہوں۔ جہاں تک میرا علم ہے مساجد کے یہی مینار تعمیر کے حسن اور کاریگری کی باریکی میں قاہرہ کے میناروں سے فوقیت لے گئے ہیں۔ اور رانی سپیری کی مسجد کے مینار ان سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔ حقیقت میں یہ مسجد احمد آباد بھر میں نقشے اور کاریگری دونوں کے لحاظ سے سب سے خوبصورت نگینہ ہے۔ اس میں محرابیں نہیں ہیں اور ہر حصہ ایسا بنایا ہے کہ ایک ہندی رانی ہی بنوا سکتی اور ہندی کاریگر ہی تراش سکتے تھے۔ ۲۳۸

[1] آرکیولوجیکل۔۔۔۔ ویسٹرن انڈیا، ہفتم، ۴۱

[2] معمولی نقشوں سے ان مسجدوں کی خوبصورتی کا اندازہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ ناظرین کو چاہئے کہ "آرکیولوجیکل سروے اوف ویسٹرن انڈیا" کی ساتویں آٹھویں جلد کی تصویریں اور فرگسن و ہوپ کی آرکیٹیکچر اوف احمد آباد وغیرہ (مطبوعہ ۱۸۶۶ء) کی تصویریں دیکھیں۔

مقبرے

طرزِ تعمیر سے واقفیت ہو جانے کے بعد مقبروں کی وضع کا از خود اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان میں سب سے سادہ ابوتراب کا مقبرہ ہے۔ یہ بارہ ستونوں پر ایک ہشت پہلو عمارت ہے جس کا ہر پہلو آگے تک بڑھا دیا ہے مگر وہ بھی مربع بنتا ہوا۔ دروازے چاروں پہلوؤں کے وسط میں ہیں۔ اس میں اور جینی ترتیب میں فرق یہ ہے کہ جینی عمارات کے پہلو زاویہ دار ہوتے ہیں اور یہ مربع ہیں۔ اس میں ہندی وضع کی فوقیت ایک ہی نظر میں معلوم ہو جاتی ہے اور اگرچہ ابوتراب کے چھوٹے سے مقبرے میں اس کی یکسانی زیادہ گراں نہیں گزرتی لیکن سرکھیج کے مقبروں میں یہ بدنمائی کی حد تک پہنچ گئی ہے بحالیکہ جینی عماتوں میں ستون کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔



تصویر ۳۹۶

مربع نقشے کی ناگوار یکسانی کے علاوہ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، سرکھیج میں یہ محسوس کیا گیا کہ ہشت پہلو گنبد اپنے پایوں پر کچھ خوشنما نہیں ہوتا۔ اس کی بہت کچھ اصلاح سید عثمان کے مقبرے میں کر دی گئی جسے محمود بیگڑا نے ۱۴۶۰ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس عمارت میں گنبد کے نیچے بارہ پہلو رکھے ہیں اور ستونوں کو دو دو اور چار چار کے مجموعوں میں نصب کرنے سے، نیز بیچ میں کم و بیش جگہ چھوڑنے سے خاصی طرح تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ نقشے میں گنبد نیچے کی منزل کے مقابلے میں بہت زیادہ بھاری معلوم ہوتا ہے لیکن مجموعی تناسب کے اعتبار سے ایسا نہیں ہے اور جب وسطی چوک میں جالیاں بڑھائی گئیں تو احمد آباد کے ستونی ۲۳۹
طرزِ عمارت میں یہ مقبرے کی سب سے کامیاب وضع بن گیا۔

اپنے عہدِ تعمیر کے آخر زمانے میں احمد آباد کے معمار توسی اوضاع کے بہت گرویدہ

نظر آتے ہیں جن سے دوسرے ملکوں میں ان کے بھائی عموماً کام لیتے تھے محمود بیگڑا کے ایک وزیر سید مبارک کے لئے سنہ ۱۴۸۴ء میں جو مقبرہ محمود آباد میں بنایا گیا اس میں تمام تر قوسی طرز سے کام لیا گیا ہے اور جیسا کہ آگے مفصل ہماری نظر سے گزرے گا، یہ ہندوستان کے سب سے عالیشان مقبروں میں شمار ہوتا ہے اسی بادشاہ نے احمد آباد کے قریب بٹوا میں ایک بزرگ کے مزار پر مقبرہ تعمیر کرایا جو ہر اعتبار سے اسی طرز میں ہے۔ لیکن معمار محرابی شکلیں بنانے میں ایسے ناتجربہ کار تھے کہ گو بڑی محرابوں کے سامنے چھوٹی محرابیں نکال کے نقشہ نہایت مناسب طور پر مرتب کیا لیکن یہ بیرونی سلسلہ یا تو بالکل منہدم ہو گیا اور یا جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے تعمیر ہی نہیں کیا گیا تھا۔ بہر حال یہ ساری عمارت بہت ہی بگڑی ہوئی صورت میں باقی ہے۔ حالانکہ اصل مقبرہ جس میں محرابوں سے مطلق کام نہیں لیا گیا تھا چند گز کے فاصلے پر بالکل سلامت ہے۔ لیکن دونوں کے پیمانے دیکھ کر یہ بھید کھل جاتا ہے کہ کس تعمیری ضرورت سے محراب کو ترجیح دی گئی تھی۔ اصل میں یہاں جتنے بڑے پائے اور وسیع تر فصل اور عرض و طول دینے مقصود تھے، یہ بات اتنے بڑے پیمانے پر صرف شہتیروں سے، جن سے ہندو کام لینے کے عادی تھے، میسر نہ آسکتی تھی۔ یونانی اور رومی ان اوضاع سے اس لئے کام لیتے تھے کہ جتنی بڑی کمان بنانی ہو وہ عرض و طول ستونوں کے ذریعے مہیا ہو جاتا تھا۔ لیکن ہندو چھوٹے دائرے پر کام کرتے تھے اور بظاہر اسے بڑھانا ان کو نہ آتا تھا۔ اگرچہ یہ جتا دینا ضروری ہے کہ ہندو عام طور پر ستونوں کو صرف صحن میں استعمال کرتے ہیں اور وہاں دیکھنے والے کی اپنی قامت کے سوا اور کوئی چیز مقابلے میں نہیں ہوتی لہذا یہ ستون کافی بڑے نظر آسکتے ہیں لیکن جب مسلمانوں نے انھیں باہر کے رخ استعمال کرنا شروع کیا اور کمانیں اور دوسرے بڑے بڑے اجزا تیار کئے تو اس وقت ان ہندو ستونوں کا چھوٹا ہونا نمایاں ہو گیا۔

ممکن ہے کہ صرف وسعت اور طول و عرض کو تعمیر کا مقصد قرار دینا، عہد انحطاط کی دلیل مانا جائے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ یہ مقصد صنعت تعمیر کا ایک بڑا اور اہم جزو ہے اور احمد آباد کے متاخرین ایسا ہی خیال کرتے تھے۔ بعد کی مساجد و عمارات میں انھوں نے بڑی وسعت و رفعت پیدا کی مگر ان تمام اوصاف کو ہاتھ سے دے بیٹھے جن کی بدولت ان کا ابتدائی طرز اس قدر خوبصورت اور دلچسپ تھا۔

مذکورہ بالا عمارات کے علاوہ احمد آباد میں صناعی کے بعض خرد تر نمونے بھی غیر معمولی طور پر خوبصورت ہیں۔ ان میں چند باؤلیاں اور واو یا گہرے کوئیں قابل ذکر ہیں جن کی تہ تک چوڑے چوڑے زینے بنائے ہیں اور ستونوں اور غلام گردشوں سے اسی اہتمام کیساتھ آراستہ کیا ہے۔ جیسے زمین کے اوپر بعض بڑی بڑی عمارتوں کو۔ مغرب والوں کی نظر میں جہاں بارش کی کثرت ہے، پانی کی کون قدر کرتا ہے لیکن گرم ملک کے رہنے والے ان زیر زمین مکانوں کی راحت بخش ٹھنڈک میں خود آئیں تو لطف اُٹھائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ؑ
۲۴۱ شہر کے گرد بہت سے بڑے بڑے تالاب ہیں اور ان میں پانی کی آمد برآمد کے جو بند بنائے ہیں وہ بھی حسن تعمیر کا ایک نمونہ ہیں بلکہ ان مفید عام چیزوں ہی کے طرز سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل احمد آباد تعمیر کا کیسا طبعی ذوق رکھتے تھے۔ یہ ان کی فطرت کا تقاضا تھا کہ ہر شے خوبصورت و پر تکلف بنائی جائے اور وہ ان چیزوں میں بھی ایسے ہی کامیاب ہوئے جیسے اپنی مساجد و محلات کی تعمیر میں ؎

اضلاع کی عمارتیں

پائے تخت احمد آباد کی متعدد عمارات کے علاوہ، ولایات گجرات یا اضلاع کے صدر مقامات میں بھی، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا، بعض قابل ذکر عمارتیں ہیں۔ ان میں کھمبائت کی جامع مسجد نہایت عالیشان ہے یہ محمد تغلق کے زمانے (۱۳۲۵ء) میں تعمیر ہوئی اور وسعت میں صرف پائے تخت کی مسجد سے کمتر ہے۔ اس کا پورا رقبہ ۲۰۰ × ۲۱۰ فیٹ اور اندر کا صحن ۱۲۰ × ۱۳۵ فیٹ ہے۔

ؑ احمد آباد یا قرب و جوار کے ان واؤوں کی با تصویر کیفیت کے لئے ملاحظہ ہو "آرکیولوجکل سروے اوف ویسٹرن انڈیا" جلد ششم ہشتم ۔ نہم ؎

التمش کی مسجد اجمیر سے یہ قدرے چھوٹی ہے ورنہ نقشہ اور ترتیب قریب قریب وہی ہے لیکن اندر جا کے تفصیل سے دیکھئے تو دونوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ کھمبائت کے صدر دالان کی کمانیں جو تعداد میں صرف تین ہیں بالکل سادہ بلکہ سپاٹ اور اتنی نیچی رکھی ہیں کہ اندر کے ہندی یا جینی ستونوں کی بلندی کے موافق رہیں جو سب کے سب شکستہ مندروں سے مہیا کئے ہیں اور کم سے کم اس جگہ مناسبت یا تعمیری خوشنمائی کا لحاظ کئے بغیر انھیں از سر نو منصب کر دیا ہے۔ بایں ہمہ ان میں ایک خاص حسن پیدا ہو گیا ہے اور جملہ عناصر اپنی غرض کے موافق ٹھیک جائے پر ہونے کے باعث کوئی ناگوار عدم تناسب نہیں معلوم ہوتا۔[1]

اس مسجد کی سب سے قابل دید عمارت، بانی مسجد عمر ابن احمد گازرونی کا مقبرہ ہے جو اس نے ۱۳۳۳ء میں خود بنوایا تھا۔ یہ صحن کے جنوبی سرے پر کوئی ۴۹ فیٹ کے عرض میں، دو منزلہ بنا ہوا ہے اور اس پر ۲۷ فیٹ قطر کا گنبد ہے۔ اس میں سب ملبہ بظاہر ہندو عمارتوں کے کھنڈروں کا ہے، اسی لئے مختلف اجزا ایسی بری طرح جمائے گئے تھے کہ تین صدی بعد یہ عمارت گر پڑی اور اس وقت سے کھنڈر پڑی ہوی ہے۔ شکل کے اعتبار سے یہ حد درجہ خوشنما اور صناعی کے لحاظ سے بہترین شے تھی لیکن اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسا مصالحہ جو دوسری چیزوں کے لئے تیار ہوا تھا، کسی اور مقام پر استعمال کرنا کس قدر حماقت کی بات ہے۔

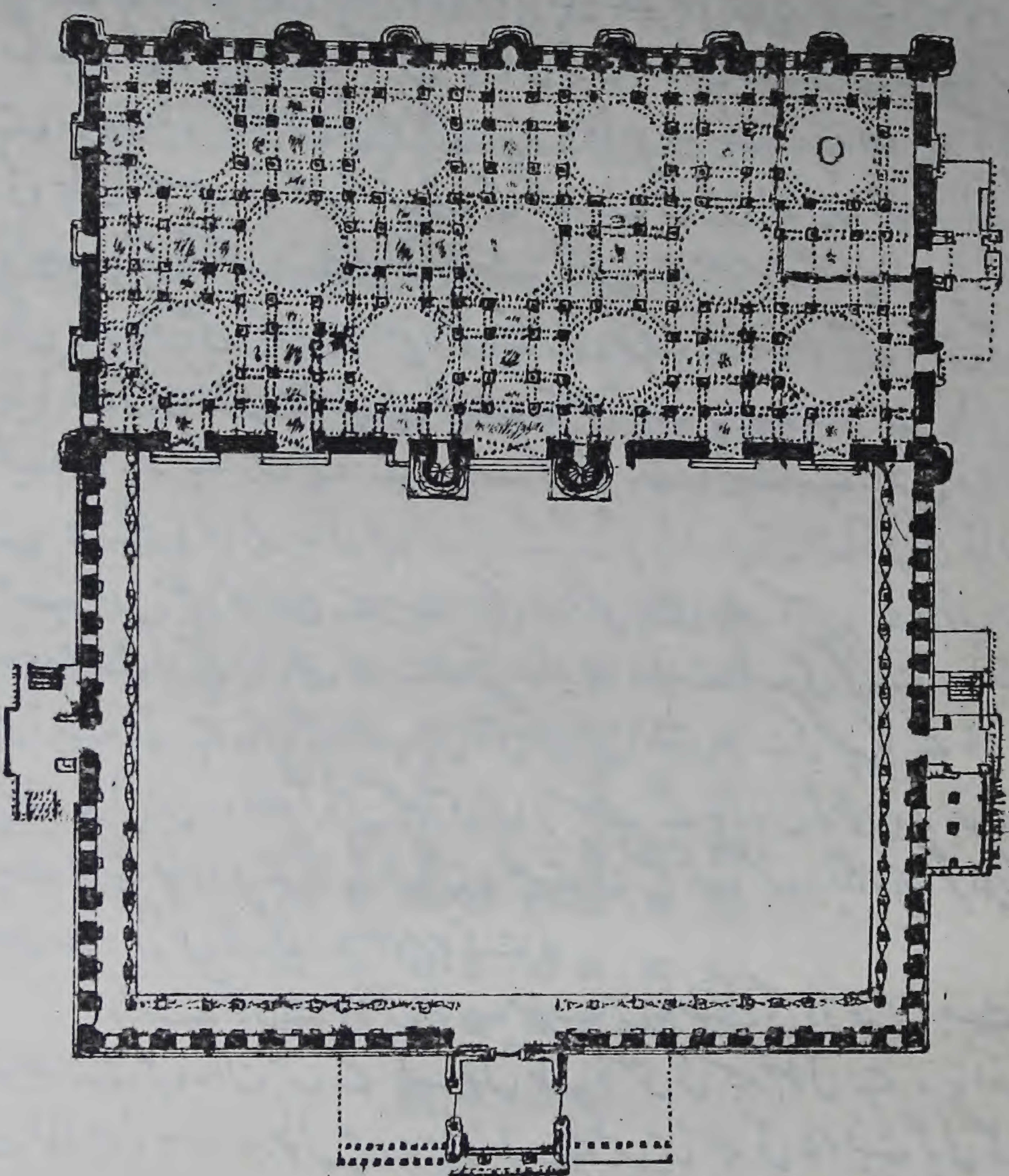
اسی نقشے سے ملتی جلتی مگر عرض و طول میں کم، ایک مسجد بڑوچ میں ہے۔ اس کا پورا طول شمالاً جنوباً ۱۳۵ فیٹ ہے اور کم سے کم آج کل کسی بیرونی احاطے کے آثار نہیں پائے جاتے۔ مگر اس میں بعض صناعی کے نمونے بہت خوبصورت ہیں۔

احمد آباد سے ۸۰ میل جنوب مشرق میں چمپانیر واقع ہے جسے محمود بیگڑا نے ۱۴۸۴ء میں فتح کر کے اپنا پائے تخت بنایا۔ یہاں اس نے

[1] کھمبائت کی مسجد کے حالات اور نقشوں کے واسطے ملاحظہ ہو آرکیولوجکل سروے ۔۔۔۔ انڈیا جلد چہارم۔

۲۴۲

ایک مسجد جامع تعمیر کی



تصویر ۳۹۹

جو سنہ ۱۵۰۸ء میں تکمیل کو پہنچی اور فن کے اعتبار سے خاصی طرح گجرات کی سب سے خوبصورت عمارت سمجھی جا سکتی ہے۔

باہر سے اس کا طول شرقاً غرباً ۲۱۶ اور شمالاً جنوباً ۲۰۸ فیٹ ہے۔ صحن کے تینوں پہلوؤں پر کھلے ہوئے دالان (اب نہایت شکستہ) ہیں اور شمال، جنوب

اور مشرق کی طرف آمد و رفت کے دروازے ہیں جن میں پہلے دو چھوٹے اور مشرق کی طرف صدر دروازہ زیادہ بڑا بنایا ہے اور اس پر بڑے اہتمام سے سنگ تراشی کا کام کیا ہے۔ اصل مسجد کافی بڑی اور ابھی تک خاصی درست حالت میں ہے۔ اندر سے اس کی پیمائش ۱۶۹ ½ × ۱۸ فیٹ ہے اور احمد آباد کی جامع مسجد کی طرح اس میں بھی گنبدوں کی تین قطاریں ہیں مگر ان کی ترتیب بالکل مختلف ہے جیسا کہ گزشتہ تصویر سے معلوم ہوگا، یہاں چار گنبد اگلی اور چار پچھلی قطار میں، اور وسطی قطار میں صرف تین ہیں مگر انھیں اس طرح بنایا ہے کہ تین آڑی قطاریں بن گئی ہیں۔ اس عجیب ترتیب سے ان گیارہ گنبدوں کے نیچے، جن میں سے ہر ایک کا قطر ½ ۲۰ فیٹ ہے۔ مغربی دیوار میں ۷ قبلے یا محرابیں بنائی ہیں اور باہر کے رُخ پانچ در ہیں جن میں وسطی کی کمان حسب معمول بغلی محرابوں سے بہت اونچی اور دُگنی چوڑی ہے۔ اس کے دونوں رُخ سو سو فیٹ اونچے مینار ہیں اور سامنے کی منڈیر جو ۱۵ فیٹ تک چلی گئی ہے، ۵۰ فیٹ کے قریب بلند ہے۔ اسی کے عقب میں وسطی گنبد تین منزلیں دے کر تعمیر کیا ہے اور ہر منزل میں دو غلام گردشیں چھوڑی ہیں۔ مسجد کے چاروں گوشوں پر ۵۰، ۵۰ فیٹ اونچے چار دمدمے بنائے ہیں جن پر چھت کی سطح تک نقش و نگار ہیں مگر اوپر کا حصہ سادہ بلکہ کسی قدر گنوار و معلوم ہوتا ہے۔

احمد آباد سے ۲۳ میل جنوب مغرب میں، ڈھولکے کی دو مسجدیں بہت خوبصورت ہیں۔ ان میں سے ایک ہلال خاں قاضی کی مسجد کہلاتی ہے۔ یہ اندر سے شمالاً جنوباً ۱۴۲ اور طول میں ۴۸ فیٹ ہے جس میں مسجد کی ۲۵ فیٹ گز کی اصل عمارت بھی داخل ہے۔ اس کے سامنے کے رُخ اونچے حصے میں تین وسطی کمانیں اور بازوؤں میں ایک ایک جالی کی کھڑکی آمد و رفت کے لئے بنی ہوئی ہے۔ اوپر دو چھوٹی چھوٹی برجیاں بنا دی ہیں۔ اندر سنگ مرمر کا نفیس منبر اور چوکور پتھروں کی (جو ہندو مندروں سے لئے گئے ہیں) خوشنما چھت ہے۔ صحن کے رُخ بہت نفیس کمانچہ بنا کے صدر دروازہ تعمیر کیا ہے۔ سنہ بنا ۱۳۳۳ء ہے۔

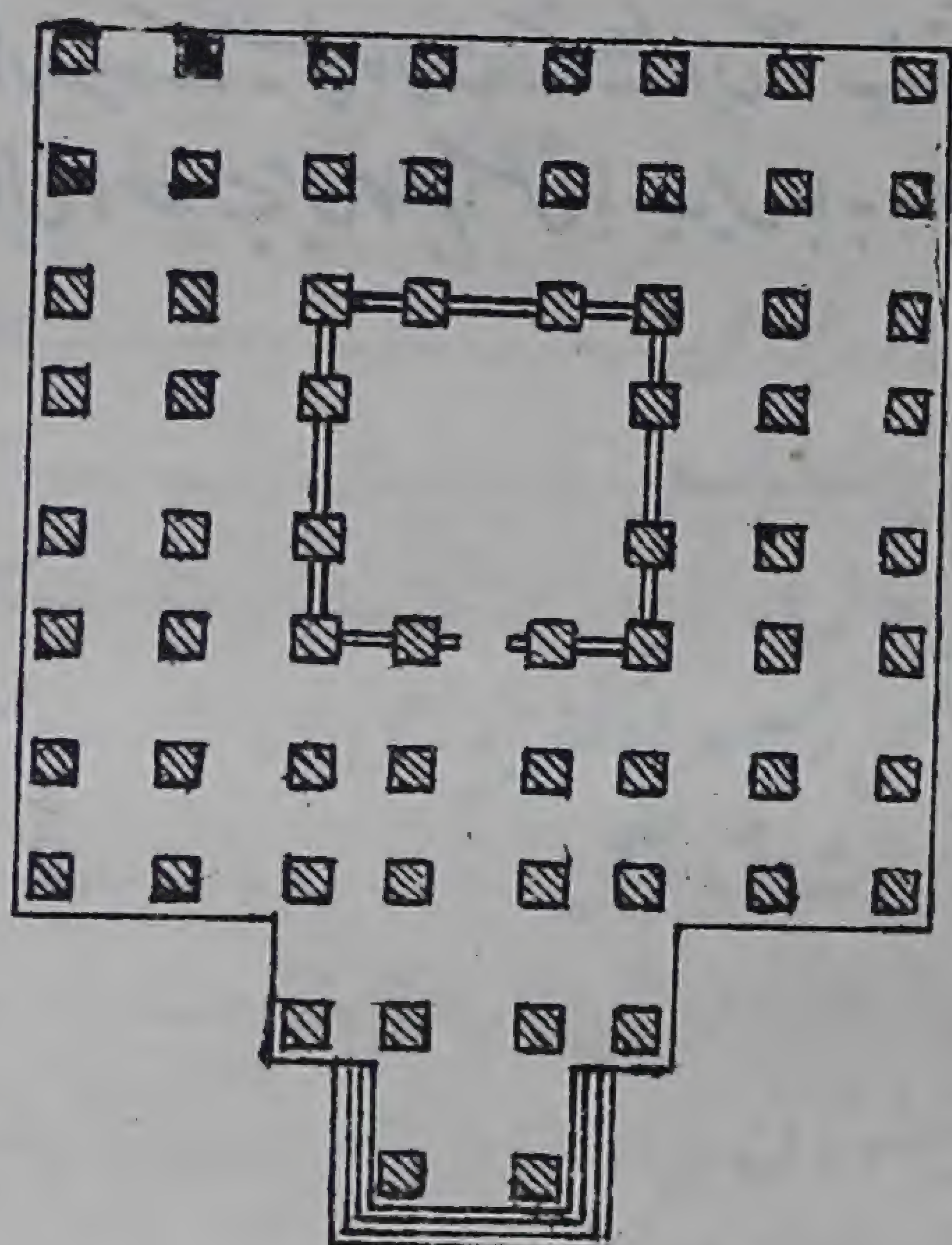
دوسری، جامع مسجد ہے جس کا طول اندر سے شمالاً جنوباً ۱۴۲ فیٹ ہے۔

اس پر بھی پانچ گنبد بنے ہوئے ہیں۔ تین وسط میں اور ایک ایک پہلوؤں پر۔ احمد آباد کی مسجد کی مثل اس کی وسطی کمان کے دونوں طرف بھی مینار بنائے ہیں۔ یہ مسجد سنہ ۸۱۵ھ میں تعمیر ہوئی ۔

تیسری مسجد جو تمام ترمندروں کے ملبے سے بنی ہے سنہ ۷۶۱ھ میں تکمیل کو پہونچی اور ٹانکا مسجد کہلاتی ہے[1]۔

گمر اضلاع کی ان عمارتوں میں سب سے خوبصورت قصبہ محمود آباد کا مقبرہ ہے جو ہندوستان بھر میں اس قسم کی سب سے اچھی عمارتوں میں داخل ہے اسے محمود بیگڑا نے اپنے ایک وزیر مبارک سید کے واسطے سنہ ۸۴۲ھ میں تعمیر کیا تھا ۔

۲۴۴



تصویر ۴۰

اسی بادشاہ کے زمانے میں قطب عالم رح کا مقبرہ بٹوا میں تعمیر ہوا جس کا اوپر ذکر آچکا ہے مگر مبارک سید کا مقبرہ اگرچہ اس سے چھوٹا اور دروازے کو چھوڑ کر صرف

[1] ان تینوں مسجدوں کے تفصیلی حالات "آرکیولوجیکل سروے..." میں مذکور ہیں ۔

۹۶ مربع فیٹ ہے، لیکن نقشے کی سادگی، اجزا کے استحکام و تناسب کے اعتبار سے زیادہ بہتر نمونہ پیش کرتا ہے اور اس لحاظ سے ہندوستان کا کم کوئی مقبرہ اس سے فوقیت رکھتا ہوگا۔ اس پر نقش و نگار بھی نہایت نفیس اور مناسب موقع تیار کئے ہیں اور مجموعی طور پر مقبروں میں سب سے اوّل صف میں جگہ پانے کیلئے صرف عرض و طول کی کمی ہے ورنہ تعمیری ترتیب میں بھی، اگر پیمانہ بڑھا دیا جائے تو کسی ردّ و بدل کی گنجایش بنانے والے نے نہیں چھوڑی ہے [1]۔

قبر کے گرد بہترین نقش و نگار کا مجحر بنا ہوا ہے اور دُہرے سائبانوں سے حظیرۂ قبر میں اس عزلت و سکون کی شان پیدا ہوگئی ہے جو ایسے مقابر کی نہایت ضروری شرط ہے [1]۔

[1] گجرات کے اسلامی آثار قدیمہ کے تفصیلی حالات کے لئے وہی کتاب "آرکیولوجکل سروے اوف ویسٹرن انڈیا (جلد ششم تا نہم) قابل ملاحظہ ہے جس کا ہم اس باب میں جا بہ جا حوالہ دیتے رہے ہیں۔

۲۴۶

باب ششم

مالوہ

دھار ۔ منڈو کی بڑی مسجد ۔ محلات ۔

سنین

سُلطان دلاور غوری .... سنہ ۱۴۰۱ء
سُلطان ہوشنگ .... سنہ ۱۴۰۵ء
محمد غزنی خاں .... سنہ ۱۴۳۴ء
محمود شاہ خلجی (ہمعصر رانا کنبھ چتوڑی) .... سنہ ۱۴۳۶ء
سلطان غیاث شاہ خلجی .... سنہ ۱۴۷۵ء
سلطان ناصر شاہ .... سنہ ۱۵۰۰ء
سلطان محمود ثانی .... سنہ ۱۵۱۰ء
مالوے کا الحاق سلطنت گجرات میں .... سنہ ۱۵۳۰ء
مغلیہ میں .... سنہ ۱۵۶۹ء

منڈو کے غوری خاندان نے جونپور کے شرقیوں کے ساتھ ساتھ خود مختاری حاصل کی یعنی سلطان دلاور نے جو سنہ ۱۳۸۷ء سے صوبہ مالوہ میں حکومت کرتا تھا، سنہ ۱۴۰۱ء میں شاہ کا لقب اختیار کر لیا لیکن منڈو کی عظمت اور تمام بہترین عمارات بنانے کا فخر ہوشنگ کو حاصل ہے اس کے بعد دوسری اسلامی حکومتوں کی طرح یہ بادشاہی بھی

کچھ مدت پھلتی پھولتی رہی تا آنکہ ۱۵۳۰ء میں سلاطین گجرات نے اور آخر میں اکبر نے فتح کر کے اسے ۱۵۶۹ء میں اپنی سلطنت کا جزو بنالیا ؎

اس مملکت کا پہلا صدر مقام دھار میں تھا، جو منڈو سے کوئی ۲۲ میل شمال میں قدیم شہر تھا۔ مگر خود مختاری کے بعد منڈو کو دارالملک بنالیا گیا۔ ہندوؤں کے قدیم اور محترم شہر ہونے کے باوجود دھار میں اس کی گزشتہ عظمت کی کوئی یادگار باقی نہیں رہی، مسلمانوں کی بھی صرف دو مسجدیں ہیں جن میں تمام تر ہندی عمارات کے کھنڈروں کا مصالحہ استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں بڑی مسجد جامع ہے اس کے صحن کا عرض شمالاً جنوباً ۱۰۲ فیٹ اور طول ۱۳۱ فیٹ ہے۔ مسجد کی اصل عمارت ۱۱۹ × ½ ۴۰ فیٹ میں بنی ہوئی ہے جس کی چھت ۶۴ ستونوں پر قائم ہے یہ صرف ½ ۱۲ فیٹ بلند اور ہندی فن تعمیر کی یادگار ہیں اور سب پر کم و بیش پر تکلف سنگ تراشی کا کام ہے۔ مسجد کا سامان زینت ۳ گنبد ہیں مگر ان کا طرز بھی ہندی ہے۔ صحن کے ہر طرف دالان چلا گیا ہے جس میں ۸۴ ستون ہیں۔ ان کی بلندی صرف ۱۰ فیٹ ہے مگر ان پر بھی بہت اہتمام سے بیل بوٹے تراشے ہیں قطب صاحب یا اجمیر کی مسجد کی مثل یہاں محرابیں ڈھکے کے کوئی دیوار سامنے نہیں بنائی۔ اندر سوائے ہندی ستونوں کے اور کوئی چیز نمایاں نہیں ہے۔ اور جانب مغرب نماز کی محرابیں یا مسجد کی ترتیب نہ ہو تو یہ ایک ہندو عمارت سمجھی جاسکتی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں معلوم ہوتا کہ یہاں کوئی چیز قدیم سے اپنی جگہ پر نہیں ہے بلکہ یہ ستون بستی کے شکستہ مندروں سے مسلمانوں ہی نے لاکے یہاں لگائے ہیں جہاں وہ اب تک قائم ہیں اور غالباً یہ تعمیر منڈو میں پائے تخت کے منتقل ہونے سے قبل تکمیل کو پہنچی تھی ؎

دوسری مسجد بھی اسی قسم کی اور قدرے چھوٹی ہے مگر مدت سے یہاں نماز وغیرہ نہیں ہوتی اور بہت ہی بے مرمت حالت میں پڑی ہوئی ہے اس کے دروازے کے سامنے لوہے کا ایک کھمبا زمین میں آدھا دبا پڑا ہے اور اسی کے نام پر اسے "لاٹھ مسجد" کہتے ہیں بعض اوقات اسے بھی قطب کے مینار کی طرح مینار فتح (جے استھمبا) گمان کیا گیا ہے لیکن یہ قیاس مشکل سے درست ہو سکتا ہے۔

اگر یہ محض زیب و زینت کے لئے ہوتا تو اسے مدور یا مثمن اور خوش وضع ہونا چاہئے تھا لیکن اب یہ جن تین ٹکڑوں میں ٹوٹا پڑا ہے، ان میں سب سے بڑا ٹکڑا ۲۴ فیٹ ۳ اور اس کا آخری حصہ ۱۱ انچ کے قریب تک چوکور ہے نیچے کے رُخ کوئی دو فٹ کی جگہ چھوڑ کر بھی اسے چوکور بنایا ہے۔ دوسرا ٹکڑا ۱۱ فیٹ ۴ انچ لمبا اور تین چوتھائی کے قریب چوکور اور باقی مثمن پہلو ہے۔ تیسرے ٹکڑے کی پیمائش ۴ ۱/۲ فیٹ اور یہ سرے کی گول پٹی کے سوا باقی مثمن ہے[۵۱] میرا خیال یہ ہے کہ یہ اڑواڑ وغیرہ کسی عمارتی کام کے واسطے بنا تھا جیسے کنارک میں سورج کے مندر کی مصنوعی چھت کے لئے اس طرح کی اڑواڑ کا ہم اس کتاب کے پہلے حصے میں ذکر کر چکے ہیں۔ اس لاٹھ میں بعض سوراخ موجود ہیں جن سے اس قیاس کی کسی حد تک تائید ہوتی ہے۔ بہرحال اصلیت جو کچھ بھی ہو، یہ اس بات کا ایک اور عجیب ثبوت ہے کہ اہل ہند اس زمانے میں، جب کہ ہم انھیں اس قسم کے آلات بنانے کی قابلیت سے معریٰ سمجھتے ہیں، لوہے کے اتنے بڑے بڑے ٹکڑوں سے کام لیا کرتے تھے۔ اس لاٹھ کی تیاری کا زمانہ غالباً وہی ہے جب کہ اس مسجد کے جہاں یہ پڑی ہوئی ہے، ستون بنائے گئے ہوں گے اور ان ستونوں کی طرز سے پایا جاتا ہے کہ غالباً وہ دسویں یا گیارھویں صدی کے ساختہ ہیں ؛

وہ مقام جہاں شہر منڈو واقع ہے ہندوستان کے صدر مقامات کے بہترین محل وقوع میں شمار ہوتا ہے۔ یہ ایک وسیع سطح مرتفع ہے جسے ایک گہری گھاٹی نے مالوے کی عام سرزمین سے الگ کر دیا ہے۔ یہ گھاٹی کم سے کم بھی ۳۰۰ سو گز چوڑی ہے اور ۲۰۰ سو فیٹ سے کسی جگہ گہرائی میں کم نہیں۔ اسے عبور کرنے کے لئے نہایت عمدہ پشتہ بنا ہوا ہے جس کی حفاظت تین بڑے دروازوں سے ہوتی ہے اور پشتے کے دونوں طرف مقابر ہیں۔ اس ٹیکرے کے گرد جہاں شہر بستا ہے، اور چٹان کے عین کنارے پر شہر پناہ بنائی ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ دور میں ۲۸ میل تک چلی جاتی ہے۔ لیکن اس نے شہر کی

---

۵۱ ایچ، کوزنز، "آرکیولوجیکل۔۔۔ رپورٹ ۳-۱۹۰۲ء، صفحہ ۲۰۵ -

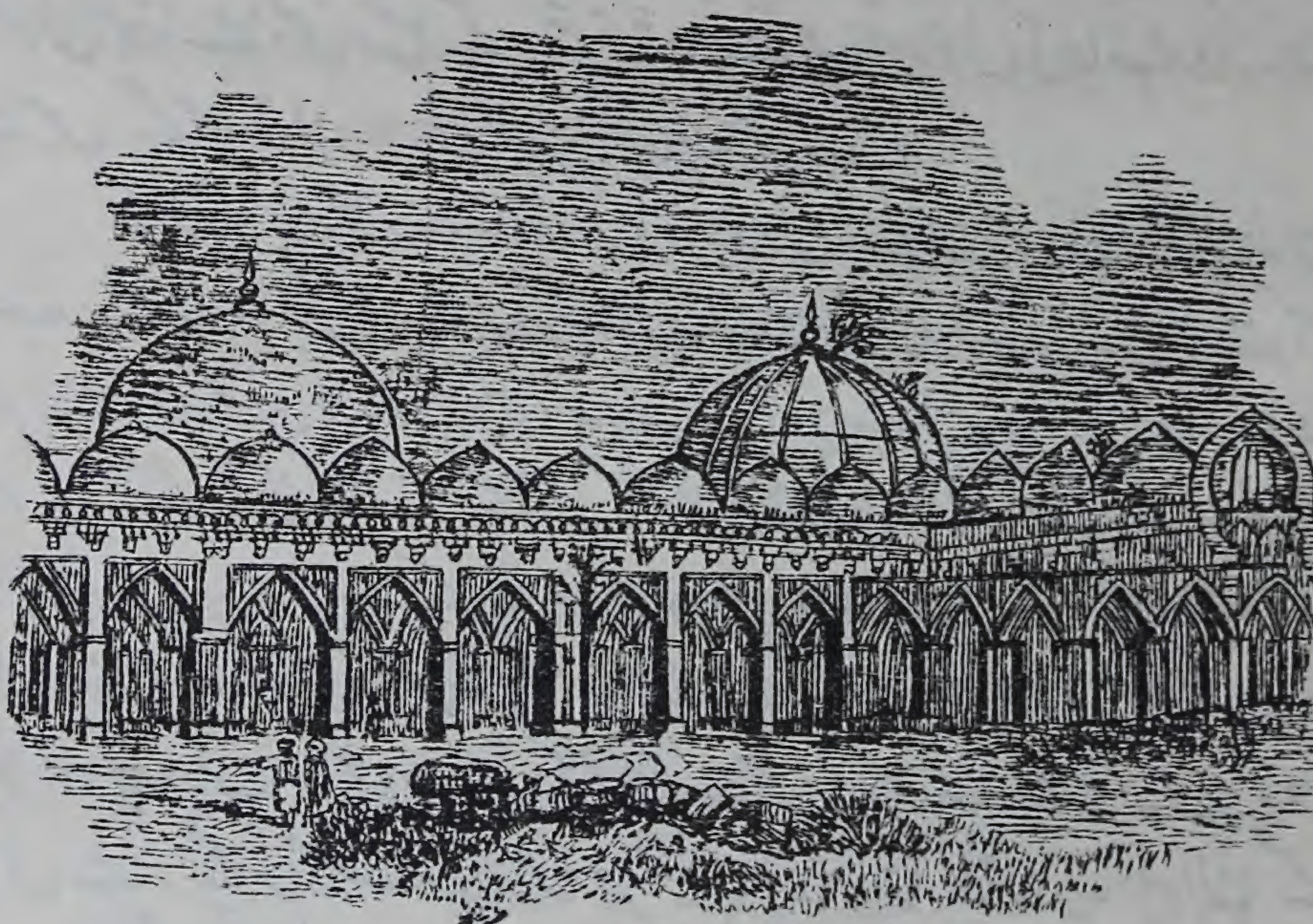
وسعت کا بہت غلط اندازہ ہوتا ہے جب تک یہ صراحت نہ کر دی جائے کہ یہ دیوار جہاں کہیں ممکن ہوا گھاٹیوں کے بلند حصے سے ملا دی گئی ہے اور بعض جگہ یہ گھاٹیاں ایک ایک دو دو میل تک ٹیکرے کے اندر چلی گئی ہیں اور ان کے درمیان میں صرف نصف میل کا فصل رہ جاتا ہے۔ سارے ٹیکرے یا سطح مرتفع کا طول بھی شرقاً غرباً ۴، ۵ میل اور شمالاً جنوباً ۳ میل ہوگا۔ اس کی بالائی سطح میں نہایت دلکش نشیب و فراز پائے جاتے ہیں اور پانی کی افراط ہے زمین انتہا درجے کی زرخیز ہے جیسا کہ خودرو درختوں سے ظاہر ہے جن کی کثرت نے شہر کی عمارتوں کے ٹکڑے کر دیئے یا انہیں اس طرح ڈھانک لیا تھا کہ چند روز پہلے تک وہ مشکل سے نظر آتی تھیں۔

فصیل کے شمال کا راستہ دہلی دروازے سے ہے جو اب نہایت شکستہ ہونے کے باوجود بلند و بالا، دیکھنے کے قابل عمارت ہے۔ یہ خالص پٹھان طرز میں ہے لیکن تناسب اجزا اور لوازم زیب و زینت کے لحاظ سے غیر معمولی طور پر نفیس ہے۔

شہر کے اندر سب سے عمدہ عمارت مسجد جامع ہے جسے دوسرے بادشاہ ہوشنگ شاہ (۱۴۰۵ء تا ۱۴۲۲ء) نے شروع کیا تھا مگر ۱۴۵۴ء میں محمود شاہ اول اتمام کو پہنچا سکا۔ یہ بہت بڑی نہیں ہے پھر بھی سادہ صناعی اور عظمت کے باعث اپنی قسم کی عمارتوں کی صف اوّل میں شمار ہوتی ہے۔ باہر سے اس کی پیمائش شمالاً جنوباً ۲۷۱ فیٹ اور شرقاً غرباً ۲۹۰ فیٹ ہے جس میں ۵۵ فیٹ آگے نکلا ہوا دروازہ یا کمانچہ شامل نہیں ہے۔ اندر سے ۱۶۲ فیٹ کا قریب قریب بالکل مربع صحن ہے اور اس لحاظ سے اس کے چاروں رخ بھی یکساں ہیں کہ ہر پہلو میں مساوی عرض و رفعت کی گیارہ بڑی بڑی کمانیں بنی ہوئی ہیں جن کے نیچے دس فیٹ بلند بھُر بھُرے پتھر کی ایک ہی ڈال کے پائے یا ستون دیئے ہیں۔ اگر کچھ تنوع ہے تو اتنا کہ مشرق کی طرف دوہرا اور شمال و جنوب میں تہرے دالان ہیں اور صدر قبلہ رو عمارت پانچ گہ کی بنائی ہے اور ۴۲، ۴۲ فیٹ قطر کے تین گنبد بھی اسی طرف ہیں۔ ان بڑے گنبدوں کے نیچے بارہ بارہ ستون مساوی فصل چھوڑ کر نصب کئے ہیں۔ اور معمار نے یکسانی کی خاطر وسطی چوک کو بھی جس کے اوپر گنبد کا خطِ تقاطع قائم ۲۴۹

کیا ہے، زیادہ چوڑا نہیں کیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ثمن کے وہ چار پہلو جن پر گنبد ہے اور جو صحن کی سمتوں کے بالمقابل ہیں، باقی آڑے چار پہلوؤں سے قدرے چھوٹے ہیں۔ اندرونی طور پر یہ بہت بے ڈھنگی شکل ہو جاتی ہے لیکن اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ایک دوسری دشواری یہ پیدا ہو جاتی کہ چھوٹے گنبد جن چھوٹی محرابی قطاروں پر قائم کرنے پڑے ہوں گے، ان کے اور زیادہ چوڑی کمانوں کی قطاروں کے مقام اتصال پر مستطیل فصل چھوڑنے پڑتے اور اسی لئے غالباً معمار نے ان دونوں میں سے کمتر زحمت کی شکل اختیار کی ؟

اندرون صحن کی تصویر ذیل میں دکھائی گئی ہے اور استحکام و عظمت کے سادہ اظہار کے شاید بہترین نمونے جو اس وقت ہندوستان میں پائے جاتے ہیں، اس مسجد کا بھی انہی میں شمار ہے۔



تصویر نمبر ۴۰۳

یہ بہت شکستہ ہوتی جاتی تھی لیکن چند سال ہوئے ریاست دھار کی طرف سے اس کی اور منڈو کے دوسرے آثار قدیمہ کی بہت کچھ مرمت کرائی گئی ہے ؟

مسجد کے عقب میں بانی کا مقبرہ، اگرچہ کچھ بہت بڑا نہیں ہے مگر ایک جنگجو پٹھان بادشاہ کی آخری منزل ہونے کے اعتبار سے اس میں ایک خاص عظمت وشان پائی جاتی ہے۔ اندر باہر سنگ مرمر کی پچیکاری محض خوبصورتی کے لئے کی گئی تھی اور چونکہ یہ پتھر عمارت کا اصلی جزو نہ تھا، لہٰذا جگہ جگہ سے نکل گیا ہے۔ دروازے سے اور اس کے پہلو کے دو دریچوں سے روشنی اندر آتی ہے شمال کی طرف تین سنگِ مرمر کی جالیوں سے بھی روشنی چھنتی ہے جس کی وجہ سے اندر کا حصہ صرف اسی قدر تاریک ہے جتنا کہ اس مقام کے واسطے رہنا موزوں ہے۔

مسجد کے ایک رُخ ۲۳۰ فیٹ لمبا، نہایت شاندار لنگر خانہ[1]، ۲۰۰۰، ۲۸ ستونوں کی تین قطاروں پر قائم ہے۔ یہ ستون خالص ہندی وضع کے ہیں۔ صرف سر ستون پر شاخدار پھن یا "گرتی مکھ" کی بجائے جو ہندو عمارات میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے، اسی وضع کے پتے تراش دیئے ہیں اور شمال کی جانب دروازے کا کمانچہ ہے جس کے ستون اور طرز تعمیر خالص ہندی ہیں۔

مگر منڈو کے محلات غالباً اس کی مسجدوں سے بھی بڑھکر قابل دید ہیں۔ ان میں سب سے بڑا جہاز محل ہے جو دو تالابوں کے وسط میں ہونے کے باعث اس نام سے موسوم ہوا اور واقع میں جہاز کی طرح قریب قریب وسطِ آب میں قائم ہے۔ یہ بڑی وسیع عمارت ہے جس کا مشرقی رُخ ۳۶۰ فیٹ کے قریب لمبا اور ۴۰ فیٹ بلند ہے۔ اس کے بیچ میں محراب دار دروازہ جس کے بالائی رُخ سنگ مرمر لگایا ہے، اب تک خاصی طرح سلامت ہے۔ اس کے اوپر صراحیاں دے کے چھجا اور پھر ایک صراحی دار جھروکہ نکالا ہے جس کی صورت ایک مستطیل بارہ دری کی سی ہے۔ نیچے کی منزل میں ہر رُخ پر پانچ پانچ کمانیں ہیں اور ان کے اوپر بہت چوڑا چھجا چھوڑا ہے۔ سامنے کے رُخ کے دونوں سروں پر قبہ دار کمانچے بنے ہوئے ہیں ایک طرف پہلو کی شکستہ عمارات کا جاحی سلسلہ اور مقابل کی طرف

[1] مولف نے اسے "دھرم سالہ" لکھ دیا ہے جو اس موقع پر صریحاً غلط ہے۔ مترجم

دوسرے مکانات اور چھت پر جانے کا زینہ ہے۔ مغرب کی جانب سے جدا ہر یہ تالاب پر چھایا ہوا ہے، دیکھئے تو مجموعی طور پر یہ ایک حیرت انگیز عمارت ہے۔ وسعت اور خوشنما نقشے کے اعتبار سے یہ اپنے زمانہ کی سب سے بہتر عمارتوں میں ہے اور ہر چند وہ نفاست اس میں نہیں جو بعد میں مغلوں نے دکھائی تاہم ایک جنگجو مملکت کے آزاد پٹھان بادشاہ کے شایانِ شان محل ضرور ہے۔

عمارت کا صدر حصہ ایک لداؤ کا ایوان ہے جس کا عرض کوئی ۲۴ فیٹ ہم طول اس سے دگنا، اور بلندی ۲۴ فیٹ ہے۔ اس کے عقب میں دونوں طرف جو پشتے بنائے ہیں، وہ اتنے چوڑے ہیں کہ چوگنے لداؤ کے لئے کافی تھے۔ ایوان کے اگلے سرے پر سہ منزلہ مکان ہیں جن میں سب سے اوپر کی منزل پر بھدے دریچے یا جھروکے آگے کو نکلے ہوئے ہیں۔ ان کے بعد لداؤ کے دالانوں کا ایک طویل سلسلہ پانی کے بیچ میں بنا ہوا ہے جو ظاہرا محل کے رہنے سہنے کے حصے تھے۔ محل کے دوسرے حصوں کی طرح یہ بھی بلند اور اتنے چوڑے آثار کے ہیں کہ ہندوستان کی عمارتوں میں کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ لہذا ان کے دیکھنے سے ویسا ہی اثر یا رعب بھی پڑتا ہے۔

وادی نربدا کی آگے بڑھی ہوئی چٹان کے کنارے پر ایک اور محل باز بہادر سے منسوب ہے۔ جو نسبتہً ہلکی اور زیادہ صاف ستھری عمارت ہے۔ غالبًا اسے ناصرالدین خلجی نے ۱۵۰۹ء میں بنایا تھا مگر یہ شمالی محل سے بھی زیادہ شکستہ حالت میں ہے اور صحن کے بعض حصوں یا دالانوں کی گمذیوں کے سوا، اور قریب قریب ساری عمارت منہدم ہو چکی ہے۔ اس کے اوپر کی طرف پہاڑی پر روپ متی کی چھتری ہے جو اب تک خاصی طرح سلامت رہ گئی ہے۔

جامع مسجد کے شمال میں ہنڈولا محل واقع ہے جو اپنے چوڑے آثار کے باعث دوسری عمارتوں کی نسبت کچھ بہتر حالت میں محفوظ رہا۔ اس خوشنما عمارت کی پشتہ دار سلامی دیواریں، آگے نکلے ہوئے جھروکے اور اندر دبی ہوئی کھڑکیاں، اس کا استحکام ظاہر کرتی ہیں۔ اندر کا بڑا ایوان ½ ۸۰ فیٹ لمبا، ۲۴ فیٹ چوڑا اور ۳۸ فیٹ اونچا ہے۔ اس کی چھت کمانوں پر قائم کی ہے اور پورا ایوان نہایت

عالیشان بنا ہوا ہے۔ اس کے شمال جانب نیچے گودام اور اوپر زنان خانہ تھا۔ مغرب میں تھوڑی دور ہٹ کر زیر زمین حوض اور ان کے کناروں پر تہ خانے بنے ہیں کہ گرمیوں میں اس چھپا باؤلی کے زمین دوز مکانات میں دوپہر گزاری جائے۔ ان سے وہ اہتمام اور خوش مذاقی ثابت ہوتی ہے جو پانچسو برس پہلے مسلمان اپنے محلات میں اپنے لوازم آسائش بہم پہنچانے میں صرف کرتے تھے ٭

ہنڈولا محل کے شمال میں نہار جھروکہ محل بھی اسی چار دیواری کے اندر واقع ہے۔ اس کے باہر دلاور خاں غوری کی مسجد ہے جو ۸۰۵ھ میں پرانے ملبے سے تعمیر ہوئی اور منڈو کی سب سے قدیم مسجد ہے مگر اس کی سادہ ساخت بھی پٹھانوں کے طرز تعمیر کی خصوصیات دکھاتی ہے ٭

جہاز محل کے جنوب میں ایک سہ منزلہ عمارت طویلی محل[1] کہلاتی ہے جس میں بلند عربی محرابوں کی قطاروں پر چوڑے چوڑے آثار کی بادررو دریچہ بالائی منزلیں اور نیچے چوڑی چوڑی پتھر کی اولیتان بنی ہوئی ہیں۔ اس کے سامنے تالاب اور کھنڈروں کے سلسلے سے عجیب اور قابل دید منظر پیدا ہو گیا ہے ٭

پوری سطح مرتفع پر عمارات و مقابر کے آثار شکستہ پھیلے ہوئے اور یہ اتنی انواع و اقسام کی ہیں کہ احاطۂ تحریر میں لانا دشوار ہے۔ ایک وسیع اور ویران جنگل کے سناٹے میں انھیں سب سے الگ تھلگ دیکھ کر مسلمانوں کے چند روزہ بادشاہی خاندانوں کی شان و شوکت کا وہ سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے کہ ہندوستان بھر میں کسی دوسرے مقام پر یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ اور اگر احتیاط سے ان کی تصویریں لی جائیں تو یہی آثار قدیمہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ ان کے بانی صنعت تعمیر کے اصلی اصول سے حیرت انگیز واقفیت رکھتے تھے ٭

یہاں اور علیٰ ہذا دوسرے مقامات میں، فن عمارت پر بڑا اثر مصالے

[1] درصل یہ محض "طویلہ" تھا۔ محل بعد میں دہقانی باشندوں نے جنھیں یہاں کی ہر عمارت عجیب معلوم ہوتی ہے، اضافہ کر دیا۔ اس پورے مضمون کے لئے مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ کی محققانہ کتاب "منڈو" مطالعے کے قابل ہے ٭ مترجم۔

کا پڑا ہے جو قریب میں مل سکتا تھا۔ جامع مسجد کے پائے دیکھ کر ہی سنگ سرخ (بھر بھرے پتھر) کی افراط کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے تین سو سے زیادہ پائے اس پتھر کی ایک ایک ڈال کے بنے ہوئے ہیں۔ پھر دیواروں اور پایوں میں سنگ تراشی کے واسطے سفید اور رنگین دونوں قسم کے سنگ مرمر سے کام لیا گیا ہے۔

منڈو کی عمارات میں دیسی (ہندو) باشندوں کے عمودی طریقوں کی آمیزش کے بغیر خالص قوسی طرز دیکھنے میں آتا ہے اور گو اسی زمانے کی جونپوری اور گجراتی عمارتوں میں ہم اسلامی طریق تعمیر میں ہندی طریقوں کا روز افزوں اثر معائنہ کرتے ہیں لیکن منڈو میں ایسی ہندی اشکال و اوضاع سے قطعی احتراز کیا گیا ہے اور معمار برابر اسی نکیلی محراب کے طرز پر قائم رہے ہیں۔ اگرچہ بعد میں مغل بناؤں[1] کی محرابوں میں جو پیچ و خم نکالے گئے، ان کی بظاہر منڈو میں کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

[1] ملاحظہ ہوں "ہسٹری اوف منڈو" (طبع ثانی ۱۸۷۵ء) "روئنز اوف منڈو" (کیپٹن ہیرس بنگلہ ۱۸۶۰ء) رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۵۹ء۔ نیز بابت ۱۹۰۲ء "آرکیولوجکل سروے اینوئیل رپورٹ" بابت ۱۹۰۳ء تا ۱۹۲۴ء وغیرہ۔

باب ہفتم

بنگالہ

بنگالے کی چھتیں۔ مسجد قدم رسول، گور۔ مساجدِ سونا۔

ادینہ و اک لاکھی، مالدا۔ مینار۔ بڑے دروازے۔

پائے تخت گور

یہ آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا کہ مالوے کے معمار دارالسلطنت دہلی کے مقوس طرز کے اس قدر گرویدہ کیوں رہے حالانکہ ان کے جونپوری اور احمد آبادی بھائی عمودی طرز کے شیدا ہوگئے تھے اور جہاں کہیں موقع ملتا اسی سے کام لیتے تھے۔ دھار کی مسجد بنانے والوں کے سامنے بھی ہندی وضع اختیار کرنے کے وہی اسباب ترغیب موجود تھے اور ہندو اور جینی مندروں کا جتنا مصالحہ کہیں کہیں انہوں نے استعمال کیا، اس سے بھی زیادہ مل سکتا تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نہ ہندی طرز مستعار لیتے ہیں نہ اس کی نقل کرتے ہیں بلکہ اسی نیکلی محراب کی وضع پر جمے ہوئے ہیں جو غیر ملکوں میں اسلامی طرز کی خصوصیت ہے۔ لیکن اہلِ مالوہ کی طرح بنگالے والوں نے عمودی طرز کبھی نہیں اختیار کیا تو اس کی وجوہ سمجھنے میں کچھ دشواری نہیں۔ اس ملک میں پتھر قریب قریب عنقا ہے اور ستون یا کھمبے بنانے کی اور کوئی مناسب شے بھی میسر نہیں آتی۔ لہٰذا اینٹ کے سوا اور کوئی مصالحہ

نہیں ملا تو انہوں نے خواہی نخواہی ہر جگہ اور ہر عمارت میں جسے پائے دار بنانا تھا، محرابوں سے کام لیا۔ مگر یہ بنگالی طرز جو ہندوستان خاص میں خالص اینٹ کا واحد نمونہ ہے، ایک ایسی مقامی خصوصیت رکھتا ہے جو نہایت عجیب و دلچسپ ہے اگرچہ مصالحے کی نوعیت کی بناء پر اس میں فن کی بعض وہ اعلیٰ صفات نہیں آسکتیں جو بہتر و کلاں تر مصالحے کی عمارتوں کی خصوصیت ہیں۔ نکیلی محراب کی وضع کو ترقی دینے کے علاوہ بنگالی معماروں نے چھت کی ایک نئی وضع بھی ایجاد کی جس کا زمانہ حال تک اسلامی اور ہندو عمارات پر بہت کچھ اثر پڑا۔ اس کتاب کے گزشتہ حصے میں ہم آنور کی چھتری کا ذکر کر چکے ہیں۔ اسی اصول پر بنگالیوں نے بانس کی لچک سے فائدہ اٹھایا اور اپنے مکانات میں عام طور پر کروی شکل کی چھتیں بنانے لگے جو ان کی نظر کو اتنی مانوس ہو گئیں کہ وہ انہیں خوبصورت سمجھتے ہیں۔ بانس اور خس کی ایسی چھت بنائیں تو وہ واقع میں خوشنما بھی ہوتی ہے لیکن اینٹ یا پتھر کی عمارت کے معاملے میں اسے حسن ذوق کا نمونہ کہنے میں کلام ہے۔ اگرچہ تعمیر میں رسمیات کو اسقدر دخل ہے اور خوبصورتی اس درجہ ذہنی تلازم پر مبنی ہے کہ ایسے معاملہ میں پردیسی اشخاص مشکل سے حکم ہو سکتے ہیں۔ بہرحال اتنی بات ضرور ہے کہ یہ کروی وضع بنگالے میں ترقی کرکے مستقل طرز عمارت بن گئی تو سترھویں صدی میں اس کا اثر دہلی، اور اٹھارویں صدی میں لاہور تک پہنچا اور اندازاً ۱۶۵۰ء سے آگے تک جس قدر عمارتیں بنیں، ان سب میں کم و بیش یہ اثر پایا جاتا ہے۔

عمارت میں رسمیات اور معیار حسن میں عادت کو جس قدر دخل ہے، اس کی یہ بھی ایک عجیب مثال ہے کہ گو اہل فرنگ کو یہ وضع ہمیشہ بدنما معلوم ہوتی رہی مگر اہل ہند میں، خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اسے زمانہ حاضرہ کی نہایت مطبوع و نفیس نئی وضع سمجھا جاتا ہے[۵]۔

[۵] رومی اور اطالی معمار بھی دریچوں پر اسی قسم کے کروی سائبان بناتے ہیں اور گو اصولاً یہ وضع بجائے خود قابل نفرت ہو لیکن عادی ہونے کی وجہ سے ہم بھی انھیں استعمال اور پسند کرتے ہیں۔

مگر ان مقامی اور مختص اوضاع سے قطع نظر، بنگالے کے اسلامی پایۂ تخت گور کی عمارات اپنی وسعت اور انواع و اقسام کی صناعی کی بنا پر التفات خاص کی مستحق ہیں۔ ۱۱۹۳ء میں قطب الدین ایبک نے دہلی فتح کی اور اسی سال محمد بختیار خلجی نے گنگا کے کنارے کنارے بنگالے تک سارا علاقہ فتح کر لیا۔ ندیا کی تسخیر کے ساتھ ہی اس نے ۱۱۹۹ء میں لکھنوتی یا گور میں والیٔ بنگالہ بن کر حکومت شروع کی اور سلطان ایبک نے بھی اس عہدے پر اس کی توثیق کر دی۔ اس کے بعد کے والی قریب قریب خود مختاری کے ساتھ حکومت کرتے رہے اور ۱۲۸۲ء میں سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا ناصر الدین بغرا خاں والی مقرر ہوا، تو یہ عہدہ اس کے خاندان میں موروثی ہو گیا۔ ۱۳۳۰ء میں فخر الدین مبارک نے سرکشی کی اور والیٔ بنگالہ قادر خاں کو ہلاک کر دیا اور مشرقی اور مغربی بنگالے میں الگ الگ حکومتیں ہوتی رہیں آخر ۱۳۴۵ء میں مغربی بنگالے کے حاکم کو شمس الدین الیاس نے تلوار کے گھاٹ اتارا اور مشرقی بنگالے کے والی اختیار الدین غازی شاہ کو شکست دی۔ اس طرح وہ ایک نئے (پوربیا) خاندان شاہی کا بانی ہوا جو تقریباً ڈیڑھ صدی یعنی ۱۴۸۷ء تک فرمانروائی کرتا رہا اور ان کی بادشاہی حبشیوں نے اور پھر ۱۴۹۳ء میں علاء الدین حسین شاہ نے چھین لی۔ مگر اس بادشاہ کے بیٹے محمود کے زمانے میں بہار کے افغان حاکم، شیر خاں (سوری) نے ۱۵۳۷ء میں بنگالے پر حملہ کیا اور گور کو بالکل تاراج کر ڈالا جس کے بعد سے یہ وسیع و دولتمند شہر ویران ہونے لگا اور اس کی عمارتیں کس مپرسی میں رہ گئیں۔ داود شاہ خلف سلیمان کے زمانے میں یہ ساری ریاست اکبر کی وسیع سلطنت میں ضم ہو گئی۔ (۱۵۷۶ء)

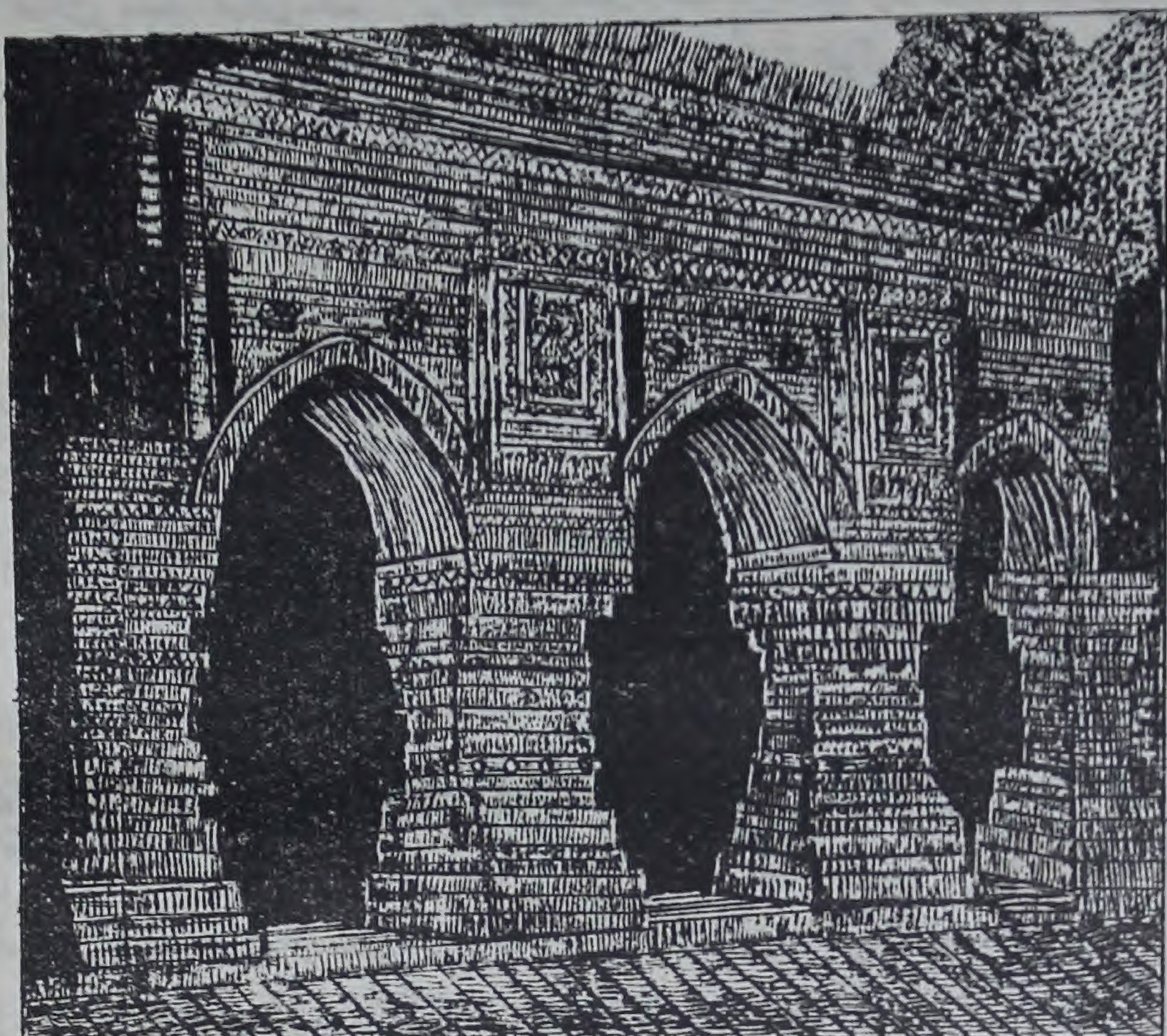
بنگالے کے ان حاکموں نے کوئی ایسا کارنمایاں تو نہیں کیا کہ ہندوستان کی عام تاریخ میں ان کو ممتاز جگہ حاصل ہوتی لیکن وہ ہندوستان کے ایک زرخیز ترین ملک کے مالک تھے اور اپنی دولت کثیر پایۂ تخت کی تعمیری تزئین و آرائش میں صرف کرتے تھے۔ یہ عمارتیں اگر ذوق کے اعتبار سے ہمیشہ بہت اعلیٰ نہ ہوتی تھیں تو بھی آرائش و تجمل میں یقیناً دیکھنے کے قابل ہونگی۔ لیکن بنگالے کی

آب و ہوا آثار قدیمہ کی خاص طور پر دشمن ہے۔ انجیر یا گولر کی قسم کا کوئی درخت مکان کی کسی دراڑ میں ایک بار بھی جگہ پا جاتا ہے تو پھر اس عمارت کی خیر نہیں رہتی۔ یہ نہ بھی ہو تو بھی روئیدگی کی وہ کثرت ہے کہ عمارات کو ڈھونڈنا، اور کم سے کم ان کی اصلی حالت کا پتہ چلانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس سب پر طرّہ یہ کہ گوڑ ایسی جگہ واقع ہے جہاں سے براہ دریا ملبۂ مصالحہ لے جانا خاص طور سے آسان ہے۔ گرمی کے سیلاب کے وقت کشتیاں اس کے کھنڈرات میں ہر جگہ پہنچ سکتی اور اینٹ پتھر وغیرہ بھر کر بہاؤ کے رُخ جہاں کہیں نیا شہر بنتا ہو، وہاں بلا وقت پہنچا سکتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مرشد آباد، مالدا، رنگت پور، اور راج محل سب کے سب قریب قریب اسی گوڑ کے ملبے سے تعمیر ہوئے، اور خود ہگلی بلکہ کلکتہ بھی بنگالے کے اسی قدیم پائے تخت کی غنیمت سے بخوبی بہرہ مند ہوا بجالیکہ خود گوڑ ایک قابل دید ڈھیر رہ گیا جس کے کھنڈروں میں اصلی صورت کا پتہ چلانا تقریباً محال ہے؛

مسلمانوں کے قبضے میں آنے سے بہت پہلے گوڑ ہندوؤں کا مشہور صدر مقام تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ سین اور پال خاندان کے راجہ یہاں سکونت رکھتے تھے اور انہوں نے ضرور اسے عمارات اور مندروں سے جو ان کی دولت اور شہرت کے شایانِ شان ہوں، اسے آراستہ کیا ہوگا۔ مگر یہ عمارتیں غالباً بیشتر اینٹ کی چنائی کی تھیں گو ان میں ستون اور ایک قسم کے سنگ موسیٰ کی، جو درحقیقت نہایت باریک سنگریزے سے مرکب ہوتا ہے، صناعی کے کام ہونگے کیونکہ اس پتھر پر نہایت عمدہ جِلا ہو جاتی ہے۔ اس ہندو صنعت کے بہت سے ٹکڑے کھنڈروں میں دستیاب ہوتے ہیں اور اگر احتیاط سے ان کا امتحان کیا جائے تو ممکن ہے کہ قدیم طرز کا ٹھیک ٹھیک پتہ چل سکے۔ مگر اس میں خاص طور پر دیکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ اس نے بعد کے اسلامی طرز پر کس قدر اثر ڈالا۔ یہ بعد کا اسلامی طرز دہلی، جونپور اور یا کہیں کے طرز کے مطابق نہیں ہے بلکہ خالص مقامی اور بذات خود کافی خوبی و خوشنمائی رکھتا ہے۔ اس کی بڑی خصوصیت بھاری بھاری اور چھوٹے پتھر کے ستون ہیں جن پر محرابیں یا لداؤ اینٹ سے تیار کئے جاتے تھے

حالانکہ دوسری جگہ مثلاً جونپور میں، ہلکے ہلکے ستونوں پر سیدھے گردنے اور چپٹی چھتیں ڈال دی ہیں۔

بنگالے کی طرز کی عام کیفیت قدم رسول مسجد کے نمونے سے ظاہر ہوگی[1] جو گور کے قلعے کے جنوب مشرقی دروازے پر بنی ہوئی ہے اور حسن تعمیر سے عاری نہیں ہے۔ خشتی عمارت



تصویر نمبر ۴۰۵

میں جو قدرتی کمزوری ہوتی ہے اس کی بہت کچھ تلافی مضبوط سہاروں سے

[1] یہ مسجد نصرت شاہ نے ۱۵۳۰ء میں تعمیر کی تھی کہ اس کا باپ حسین شاہ (۱۴۹۳ء تا ۱۵۱۹ء) جو پتھر مکۂ معظمہ سے لایا تھا اور اس پر پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نقش پا تھا، وہ اس مسجد میں رکھا جائے۔

ہوگئی ہے اور دوسرے اجزا کے چھوٹے ہونے سے جو بدنمائی پیدا ہوتی اُسے شروع ہی سے ستونوں کے چوڑے چوڑے پائے بنا کے جن پر محرابیں قائم ہیں، دور کردیا ہے۔ رُو کار میں تنوع پیدا کرنے کی غرض سے سیدھی سیدھی چوڑی تختیاں اور ڈھلی ہوئی اینٹ کی پٹیاں ڈالی ہیں اور انہی کا سلسلہ بل دے کے پورے گرد نے سے ملا دیا ہے اس عمارت میں چھتیں بھی کردہی وضع کی بنائی ہیں جو اس طرز تعمیر کی خاص خصوصیت ہے اگرچہ یہاں گرویت بہت خفیف ہے۔ خاص گوڑ کے اندر سونا مسجد جو" بارہ دروازہ مسجد بھی کہلاتی ہے" نہایت خوبصورت عمارت ہے۔ اس کا رو کار پتھر کا ہے جس میں ذرا ذرا ابھرے ہوئے گل بوٹے تراشے ہیں یہ گویا چوبی کام کی نقل ہے، جو عام طور پر مستعمل تھا اور کانت نگر مندر بننے کے زمانہ تک (جس کا کتاب کے پہلے حصے میں ذکر آچکا ہے) رو کاریں انہی مقبول طریق سے مزین کی جاتی تھیں۔ اس مسجد کے اندر کے اکثر ستون ہٹا دیئے گئے جس سے لداؤ کی چھتیں گر پڑیں اور اب اگر خودرو درخت پوری عمارت دیکھنے کا موقع بھی دیں تو بھی اس کی تعمیر کی خوبی کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ مگر آئندہ صفحے پر ہم نے پنڈوا کی مسجد آدینہ کا جو نقشہ دیا ہے اسی سے اس مسجد کی ترتیب بھی کسی حد تک سمجھ میں آسکتی ہے۔ پنڈوا مسجد مذکور کی تعمیر کے وقت پائے تخت کا شمالی ناحیہ تھا۔

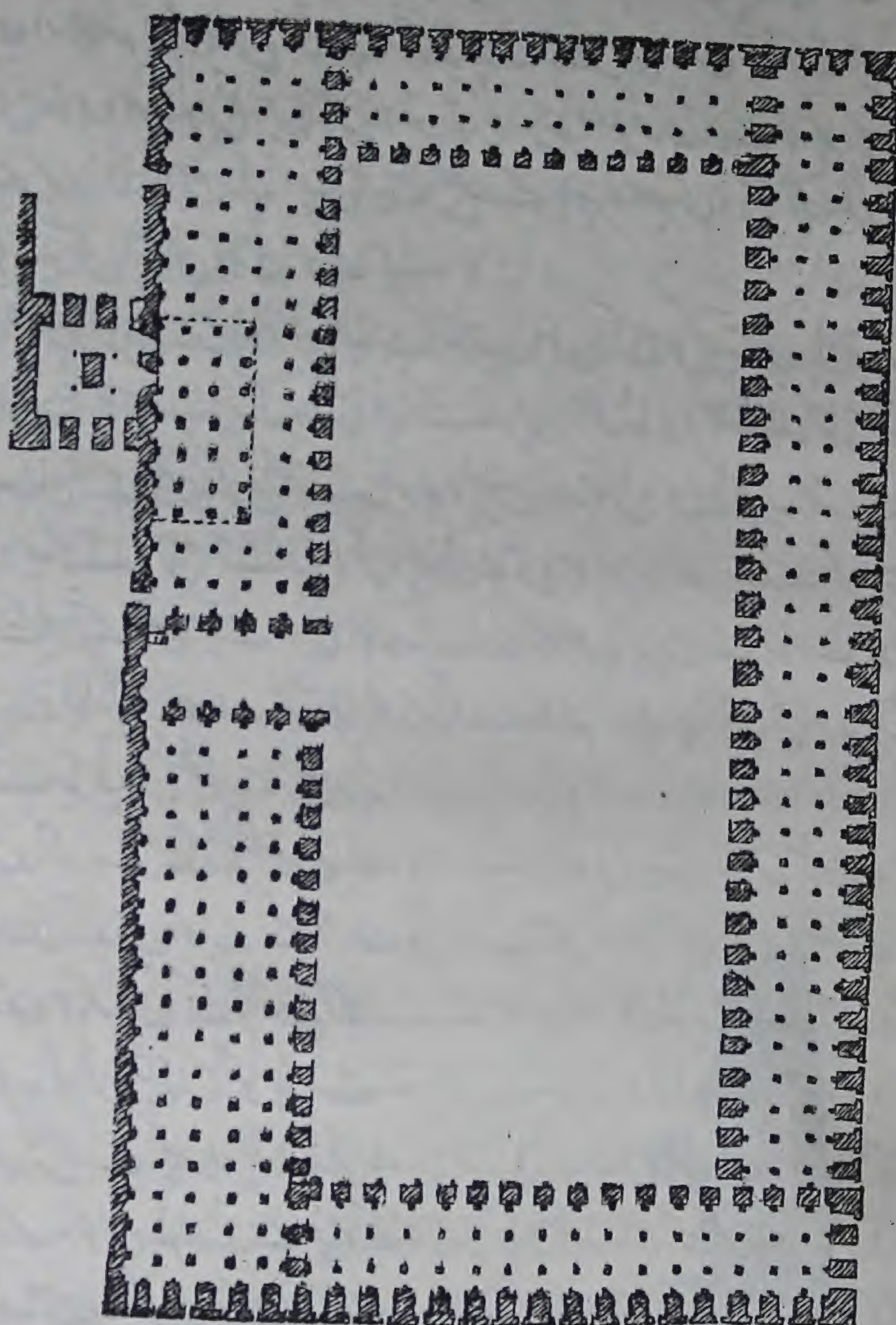
قلعے کے باہر شمال مشرق میں ایک اور مسجد بارہ سونا مسجد کہلاتی ہے اور غالباً گوڑ کے آثار قدیمہ میں اس سے زیادہ خوشنما کوئی عمارت محفوظ نہیں ہے۔ اسے ۱۵۲۶ء میں نصرت شاہ نے بنایا تھا۔ باہر سے اس کا طول ۱۶۸ اور عرض ۷۶ فیٹ ہے۔ ۸، ۸ فیٹ چوڑے آثار کی دیواریں ہیں جن کے اندر باہر رنگین سنگ رخام کا حاشیہ ہے۔ سامنے گیارہ محراب دار دَر، ۵، ۵ فیٹ ۱۱، ۱۱ انچ چوڑے اور ۱۴، ۱۴ فیٹ بلند بنائے ہیں۔ ان سے پیش دالان میں داخل ہوتے ہیں جس کی چھت گیارہ گنبدوں کی اور ان کے نیچے بھی کمانیں بنائی ہیں۔ اس کے آگے مسجد کی صدر عمارت ہے جس کی چھت گر پڑی مگر اس میں طولاً تین دالان، بیس بیس ستونوں پر قائم تھے اور دیواریں بھی گیارہ بند محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ دالان کے

سرے کے دروازوں کی دونوں جانب، اور عقبی گوشوں میں بادامی سنگ اسود کے پہلو دار مینار (کل ۶) بنائے تھے جن کی برجیاں اب شکستہ ہوگئی ہیں۔ عرض و طول اور زبردست آثار دیکھ کر ثابت ہوتا ہے کہ یہ کیسی پُرشکوہ عمارت ہوگی۔ حقیقت میں اسلامی طرز کی اکثر ہلکی ہلکی محرابوں کے مقابلے میں گوڑ کی یہ تعمیری خصوصیت یہاں بہت ممتاز و نمایاں ہوگئی ہے ؛

کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد آدینہ کو اُس شاہی نسل کے ایک مشہور ترین فرمانروا سکندر شاہ (۱۳۵۸ء تا ۱۳۸۹ء) نے اِس غرض سے بنوایا تھا کہ اُس کے احاطے میں یا باہر قریب ہی اپنی قبر بنوائے۔ مسجد کی چار دیواری نہایت وسیع ہے یعنی شمالاً جنوباً ۵۰۷ اور شرقاً غرباً ۲۸۵ فیٹ چوڑی ہے۔ وسط میں ۱۳۰×۴۰۰ فیٹ کا صحن اور ہر طرف اینٹ کی بہت چوڑی دیوار ہے جس میں برابر کی ۸۹ کمانیں بنائی ہیں اور صرف محراب قبلہ زیادہ چوڑی اور شاندار ہے۔ مسجد کی چھت بھی ۱۰ فیٹ ۵ انچ اونچے اور نیچے سے دو دو فیٹ کے چوکور ستونوں پر جن کی کل تعداد ۲۶۰ ہے تیار کی ہے۔ بعض ستون سیاہ پتھر (رخام) کی ایک ڈال کے ورنہ باقی سب اسی طرز کے ہیں جیسے مسجد قدم رسول کی تصویریں دکھائے جا چکے ہیں۔ ان کے خوشنما اور شاندار ہونے میں شک نہیں لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ تنوع سے عاری ہیں ان ستونوں اور عقبی دیواروں پر ایک ہی وضع اور ساخت کی ۳۰۷ گمٹیاں بنائی ہیں اور یکسانیت میں صرف ایک چبوترے نے فرق پیدا کیا ہے جو "بادشاہ کا تخت" کہلاتا ہے اور ایک حصہ عمارت کو دو منزلوں میں تقسیم کردیتا ہے۔ اُس کی چھت ۲۱ چھوٹے اور بھاری اور بعض پتھر کی ایک ڈال کے سبک اور نفیس تر ستونوں پر قائم تھی۔ مگر چھت گر گئی اور دوسرے سہارے کے بہت کم ستون اب سلامت رہ گئے ہیں ؛

تصویر بر صفحۂ دیگر

لے اس کا شکستہ مقبرہ مغربی دیوار کے شمالی سرے کے متصل ہے ؛



تصویر نمبر ۴۰۶

مسجد آدینہ کی ساخت کسی کارواں سرائے کے لئے زیادہ موزوں ہوتی۔ کیونکہ اگر عمارت میں محض خوشنمائی پیدا کرنی مقصود تھی، تو اس کے لئے اتنی یکسانیت کچھ پسندیدہ نہیں نظر آتی۔ پورے مجموعے میں یہ نقص پایا جاتا ہے اور اگرچہ ان کی عظمت و وسعت اور نقش و نگار کی نفاست نیز وہ عجیب اور گھنا جنگل جس کے اندر یہ کھنڈر ڈھکے پڑے تھے، مجموعی طور پر ان عمارات کو تصویر بنانے والے کے لئے

بہایت دلکش چیز بنا دیتے ہیں، مگر جنوبی ہند کے ہزار ہزار ستون کے ایوانوں کے متعلق جو اسقام تم اس کتاب کے پہلے حصے میں بیان کر آئے ہیں، وہ سب یہاں بھی موجود ہیں واقع میں بعض دفعہ تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم پھر کسی تامل نسل کے علاقے میں آگئے جن کی خصوصیات سطح کے باہر اُبھری آئی ہیں اگرچہ ان پر ایک غیر قوم کی پوشش پڑی ہوی ہے ؛

مسجد آدینہ سے دو میل جنوب مغرب میں اک لاکھی مسجد یا مقبرہ واقع ہے۔ مقبرہ کہلانے کا سبب یہ کہ یہاں غیاث الدین اعظم شاہ (سنہ ۱۳۹۰ء تا ۱۳۹۷ء) کی قبر بتائی جاتی ہے لیکن کوئی کتبہ موجود نہیں اور ممکن ہے کہ یہ عمارت جلال الدین محمد شاہ (سنہ ۱۴۱۴ء تا ۱۴۳۲ء) کی بنوائی ہوی ہو جو بڑا عمارت گر گزرا ہے۔ یہ گنبد کے نیچے اسّی فیٹ مربع عمارت ہے۔ اس میں بہت سا مصالحہ ہندی مندوں کے ملبے سے لیا گیا ہے اور اینٹ اور سنگ رخام سے چنائی کی ہے۔ تزئین کی غرض سے جا بجا منقش اینٹیں لگائی ہیں۔ کونے کے پشتوں پر بڑے تکلف کے بیل بوٹے بنے ہوے ہیں جن سے میناروں کے نقش و نگار یاد آتے ہیں مگر ان پشتوں کو صرف چھت کی سطح سے کچھ اوپر منڈیر یا ٹوپی بنا کے دونوں طرف سے نیچے کے رُخ موڑ دیا ہے۔ اگرچہ یہ عمارت بہت چھوٹی ہے مگر فن کے اعتبار سے مسجد آدینہ سے زیادہ خوبصورت اور اعلیٰ کمال کا نمونہ ہے ؛



تصویر نمبر ۴۰

اس مقام کے سب سے دلچسپ آثار میں ایک مینارہ ہے جو قلعے سے بڑھتے ہی جانب مشرق استادہ ہے

اس کی دو تہائی بلندی دوازدہ پہلو ہے اور اس کے بعد وہ ۴۸ فیٹ کی بلندی تک گول چلا گیا ہے۔ اس کا دروازہ زمین سے خاصا اونچا رکھا ہے اور مجموعی طور پر یہ آئرلینڈ کے گول برجوں سے بہت مشابہ ہے اور ان کے سوا اور کوئی عمارت اس نمونے کی ہمارے علم میں نہیں ہے، اگرچہ اس بات کا مطلق قرینہ نہیں کہ آئرلینڈ اور یہاں کی عمارت میں کوئی تعلق ہوگا۔ تو غالباً اس مینار کے گرد پہلے ایک ۱۵ فیٹ اونچا چبوترہ بنا ہوا تھا لیکن ایسا ہو بھی تو بھی اب وہ بالکل غائب ہو گیا ہے۔ مینار کے اندر چکر کھاتا ہوا زینہ چوٹی کے کمرے تک چلا جاتا ہے جس کے اوپر گنبد بنا ہوا تھا عجب نہیں کہ یہ بھی قطب مینار، اور کوئل اور دولت آباد وغیرہ مقامات کی میناروں کی طرح فتح کی یادگار میں تعمیر کیا گیا ہو۔ بیان کرتے ہیں کہ اس پر ایک کتبہ کندہ تھا جس میں اس کی تعمیر سیف الدین فیروز سے منسوب تھی جو سنہ ۱۴۸۸ء سے سنہ ۱۴۹۰ء تک گور کا حکمراں رہا۔ طرزِ عمارت سے بھی اس کی پوری طرح تصدیق ہوتی ہے مگر مقامی روایت یہ ہے کہ اس کی چوٹی پر ایک درویش پیر آسا[1] نامی رہا کرتے تھے؎

ان عمارتوں کے علاوہ گور میں کئی بڑے دروازے خاصے شاندار بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے اچھا قلعے کا شمالی دروازہ ہے جسے داخل یا سلامی دروازہ کہتے اور رکن الدین باربک شاہ (سنہ ۱۴۶۰ء تا سنہ ۱۴۷۴ء) کی تعمیر بتاتے ہیں۔ اگرچہ یہ اینٹ کی عمارت ہے اور صرف کچی چینی سے اس پر بیل بوٹے بنائے ہیں لیکن اس قسم کی عمارتوں میں، جہاں کہیں بھی ہوں، یہ بڑی شان کی چیز ہے۔ شہر کا جنوبی اور اسی طرح بالا حصار کا دروازہ اس بات کی بہترین مثال ہیں کہ اینٹ اور صرف اینٹ سے کیسی عالیشان عمارت بن سکتی ہے۔ شہر کے اس دروازے کو کوتوالی دروازہ کہتے ہیں۔ یہ پرانی بستی کے جنوبی رخ سے باہر جانے کا راستہ ہے اور نہایت خوبصورت و پُرشکوہ ہے۔ بالائی حصے کے سوا یہ خاصی درست حالت میں سلامت ہے۔ محراب کی کیلی تک بلندی ۳۱ فیٹ اور نیچے پوری

[1] غالباً یہ "فیروز شاہ" کی بگڑی ہوئی صورت ہے؎

ڈیوڑھی کا عرض ۱۵ فیٹ ہے۔ جنوبی رُخ دونوں پہلوؤں پر نیم دائرے کی شکل میں فوجی پہرے کے لئے دمدمے بنے ہوئے تھے[1]۔

لیکن صرف عمارات کی وسعت یا کاریگری کے کمالات ہی گوڑ کی عظمت کا سبب نہیں ہیں بلکہ اس کی اصلی عظمت و شان وہ عجیب و غریب کھنڈر ہیں جن کا سلسلہ جنوب میں پنڈوا سے ے کے قریب قریب بیس میل تک، جو کبھی گنگا کا کنارا تھا چلا گیا ہے اور ان میں صدہا مقابر و مساجد (بعض اب تک آباد اور بعض بالکل مٹی کا ڈھیر) مندر، حوض اور برج دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں جن میں نہ اب کوئی ترتیب ہے نہ ٹھیک راستہ اور جن کو خودرو درختوں کی کثرت نے جو ہندوستان کے صرف اسی علاقے میں ہوتی ہے آدھے سے زیادہ مستور و محجوب کر لیا ہے جو چیز کاغذ پر نقشے میں بظاہر ادنیٰ اور معمولی ذوق کا نمونہ معلوم ہوتی ہے، ممکن ہے کہ وہی برائے العین گذشتہ شان و شوکت کا مرقع نظر آئے اور اس لحاظ سے ہندوستان کا کوئی قدیم پائے تخت ایسا عجیب غریب اور اسی کے ساتھ بغایت ملال انگیز نقش دل پر نہیں چھوڑتا جس قدر کہ بنگالے کے اس پرانے افغانی پائے تخت کے معائنے سے پیدا ہو جاتا ہے[2]۔

[1] جے، ایچ، ایون شا کی کتاب "گور، اٹس روئنز اینڈ انس کرپشنز" (۱۸۷۸ء) ایم، مارٹن "ایسٹرن انڈیا"، "رپورٹس" وغیرہ وغیرہ۔

[2] ۱۹۰۰ء میں جب سے یہاں کاشت شروع ہوئی اور جنگل کاٹا گیا نیز حکومت بنگالہ نے ان کھنڈروں کی طرف توجہ کی اس وقت سے ان آثار قدیمہ تک آسانی سے رسائی ہونے لگی ہے۔

باب ہشتم

گلبرگہ

مسجد گلبرگہ ۔ مدرسہ بیدر ۔ مقابر۔

سنین

علاء الدین حسن گنگو بہمنی، دربار تغلق کا سردار ۱۳۴۷ء

محمد شاہ غازی (اول) ۱۳۵۸ء

مجاہد شاہ ۱۳۷۵ء

محمد شاہ (ثانی) ۱۳۷۸ء

تاج الدین فیروز شاہ (جس کی راجۂ وجیانگر کی بیٹی سے شادی ہوئی) ۱۳۹۷ء

احمد شاہ (اول) پائے تخت بیدر ۱۴۲۲ء

علاء الدین احمد شاہ ثانی ۱۴۳۵ء

کلیم اللہ (آخری تاجدار خاندان بہمنی) ۱۵۲۵ء

قاسم برید بانی برید شاہی ۱۴۹۲ء

علی برید (علانیہ بادشاہی اختیار کرتا ہے) ۱۵۴۲ء

امیر برید شاہ (خاندان کا آخری بادشاہ) ۱۶۰۹ء

چودھویں صدی عیسوی میں سلطان علاء الدین خلجی اور محمد شاہ تغلق کی

جنگ آزمائیوں نے، راس کماری اور خلیج منار تک تمام جزیرہ نما میں اسلامی سطوت کی دھاک بٹھا دی تھی۔ لیکن یہ قریب قریب ناممکن تھا کہ اس زمانے کے افغان بادشاہ جو اس قدر کم متمدن تھے[1] کسی ایسی حکومت کی تنظیم کر سکیں، جو اتنی وسیع اور مختلف الاحوال سلطنت پر ایک مرکزی مقام سے، اور وہ بھی دہلی جیسے دور کے مقام سے، حکمرانی کر سکتی ہو۔ محمد تغلق کو اس دشواری کا احساس تھا اور اس نے دولت آباد کو پائے تخت بنانے کی تجویز سوچی تھی۔ اگر وہ اس تجویز میں پوری طرح کامیاب ہو جاتا تو بہت ممکن تھا کہ پورا جنوبی ہندوستان مستقل طور پر مسلمانوں کے قبضے میں آجاتا۔ مگر یہ نہ ہوا البتہ بل تیز کے حکمراں خاندان بلال کا ۱۳۱۱ء میں خاتمہ ہوگیا اور ورنگل کا خاندان نیم جان کر دیا گیا اگرچہ کچھ مدت تک بالکل مغلوب نہ ہو سکا ادھر وجیانگر کی نوخیز قوت حائل ہو کر جنوبی ریاستوں کو مسلمانوں کی دست درازی سے کئی صدی تک بچاتی رہی۔ خلاصہ یہ کہ اگر دہلی کی مرکزی قوت سے آزاد ہو کر اسلامی سلطنتیں یہاں قائم نہ ہو جاتیں تو کچھ عجب نہ تھا کہ دکن مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جاتا اور ہندو، شاید بندھیاچل کے جنوب میں عرصۂ دراز تک اپنی حکومت پر قائم رہتے۔

اسلامی بادشاہیوں میں سب سے پہلی خود مختار بادشاہی حسن گنگو بہمنی نے قائم کی جو اپنے بانی کے نام پر بہمنی سلطنت کہلائی حسن، محمد تغلق کے دربار کے ایک برہمن کا ملازم تھا اور اپنے آقا کی وجہ سے ترقی پائی تو شکر گزاری میں اس کا نام اپنے القاب میں داخل کر لیا۔ اس نے ۱۳۴۷ء میں دکن کے ایک قدیم شہر کل برگہ یا گلبرگہ کو مستقر بنایا اور اس کے قریبی اخلاف کے عہد میں یہ سلطنت برار سے کرشنا اور مشرق میں حدود ریاست ورنگل سے لے کے مغربی ساحل تک پھیل گئی۔ ورنگل و وجیانگر کو ان بادشاہوں نے نہ صرف قابو میں رکھا بلکہ وقتاً خراج دینے پر مجبور کیا۔ یہ اقبال مندی کا دور تقریباً ایک صدی تک رہا اور اس کے بعد احمد شاہ اوّل (۱۴۲۲ تا ۱۴۳۵ء) نے ۱۴۲۶ء میں اپنا دارالسلطنت

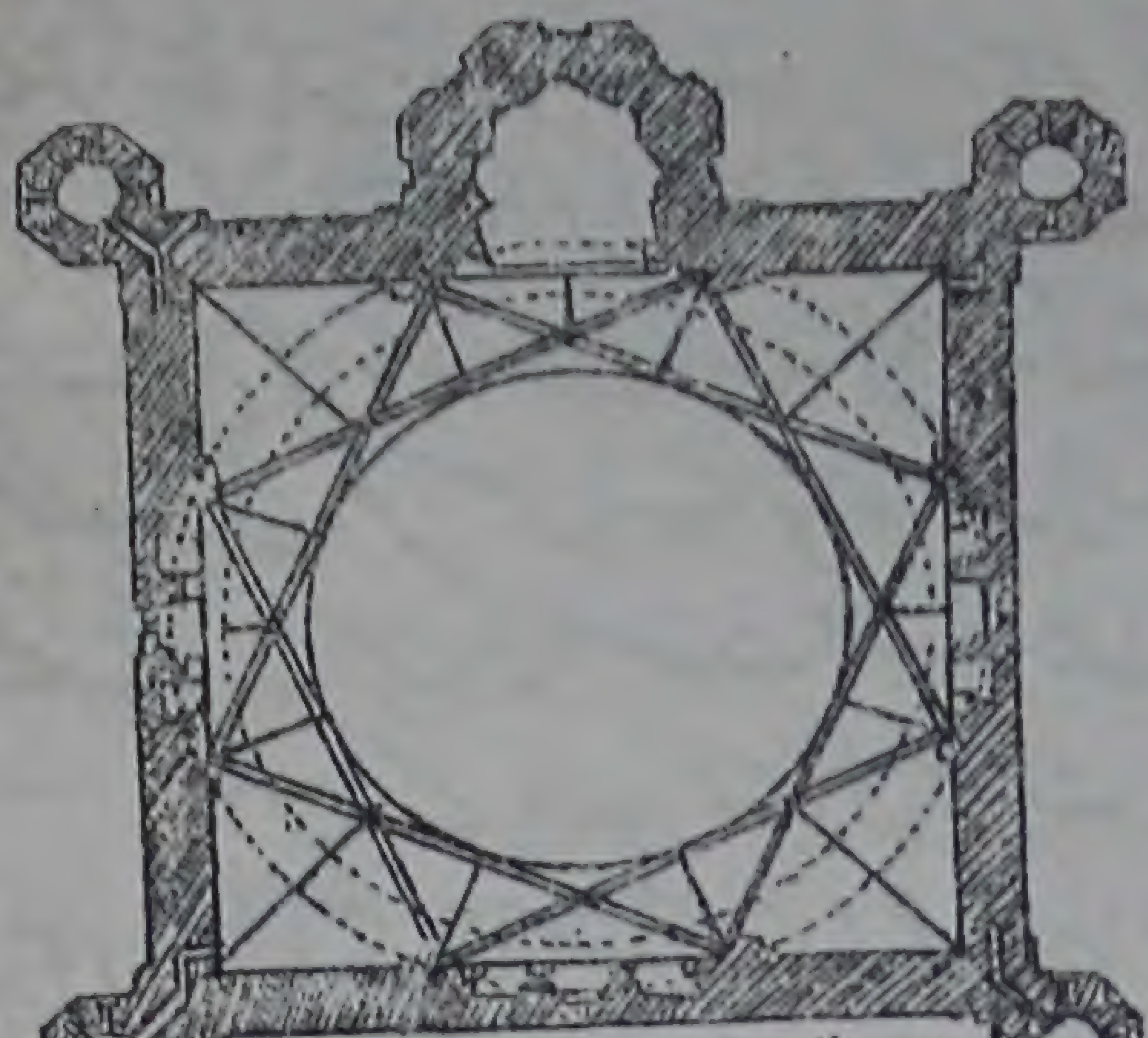
[1] "افغان" سے ترک سلاطین دہلی مراد ہیں۔ انھیں مصنف نے کہیں "باربرس" کے نام سے یاد کیا ہے جو اس نے غالباً اس زمانے کے فرنگی بادشاہوں پر قیاس کر لیا ہے؛ مترجم۔

بیدر میں منتقل کر لیا جس کی وجوہ کی کہیں تصریح نہیں ملتی علاء الدین احمد شاہ ثانی کے زمانے میں تازہ فتوحات نے میسور سے گجرات تک تمام مغربی دکن کو شاہان بہمنی کے زیر نگیں کر دیا لیکن محمد ثانی کے بعد سے سلطنت کمزور ہو گئی بہمنی سلاطین ایک صدی تک اور بساک کرتے جیتے رہے اور آخر میں برید شاہی کی صورت اختیار کی۔ مگر اس سے پہلے دکن میں بہمنیوں کی جگہ بیجاپور کے عادل شاہی لے چکے تھے جن کی سلطنت ۱۴۹۰ء میں قائم ہوئی ؎

دکن کے پائے تخت کی حیثیت سے گلبرگہ کو چند روز جو اولیت حاصل رہی (۱۳۴۷ء تا ۱۴۲۸ء) اس دوران میں وہاں کئی اعلیٰ درجے کی عمارتیں بنیں، جن میں ایک مسجد بھی ہے کہ ہندوستان کی سب سے ممتاز مساجد میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ یہ اگرچہ بہت زیادہ نہیں، تاہم کافی وسیع ہے۔ شرقاً غرباً ۲۱۶ اور شمالاً جنوباً ۱۷۰ فیٹ، گویا ۳۶،۷۲۰ مربع فیٹ کے رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان کی بڑی مسجدوں میں یہی مسجد، جامع قرطبہ کی طرح پوری کی پوری مسقف ہے۔ مثلاً اگر اس کا منڈو کی مسجد سے مقابلہ کیجیے، جو اور اعتبار سے یکساں ہے، تو بڑا فرق یہی نظر آئے گا کہ منڈو کی مسجد کا بڑا حصہ کھلا ہوا صحن ہے جس کے ہر طرف دالان بنے ہوئے ہیں۔ گلبرگہ کی مسجد میں کھلا ہوا صحن مطلق نہیں بلکہ ۱۲۶ × ۱۰۰ فیٹ کی پوری مسجد پر ۶۳ چھوٹے چھوٹے گنبدوں کی چھت پڑی ہوئی ہے اور روشنی پہنچانے کا انتظام پہلو کی دیواروں میں کمانوں کے ذریعہ کیا ہے جو سوائے مغرب کے چار طرف خاص مسجد اور ۴۵ فیٹ پیچھے کو نکلا ہوا محراب و منبر کا مقصورہ ہے ہر سمت بنی ہوئی ہیں وسطی حصے پر ایک چھوٹا کھنڈ بنا کے ۴۰ فیٹ قطر کا بڑا گنبد تعمیر کیا ہے اور پہلوؤں میں ۶، ۶ گنبد خورد بنا دیے ہیں۔ باقی بغلی دالانوں پر ۲۵، ۲۵ فیٹ چوڑے گنبد ہیں ؎

تصویر بر صفحۂ دیگر

اس قسم کی یہ ایک ہی مسجد
ہے اس لئے مساجد کی عام طرز سے
اس کا موازنہ کرنا دشوار ہے۔
کھلے ہوئے صحن کی مسجد، جس کے
ہر طرف دالان اور حجرے بنے ہوئے
ہوں، ایک خاص قسم کا سکون و
احترام اپنے اندر رکھتی ہے اور
یاد الہٰی کے واسطے نہایت ہی موزوں
مقام ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ
ہندوستان جیسے گرم ملک میں
بعض اوقات شعاع آفتاب سے



تصویر نمبر ۴۱

صحن اس قدر چمکنے اور تپنے لگتے ہیں کہ مسجد میں بیٹھنا تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ اور مستقل طور پر شامیانے یا سائبان ڈال کے اس کے تدارک کرنے کی، جہاں تک مجھے معلوم ہے کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے برخلاف گلبرگے ہیں ساری مسجد پر چھت ہونے کی وجہ سے تمام نمازی سورج کی شعاعوں سے محفوظ رہتے ہیں اور چونکہ سب دالان ایک، یا دونوں سروں پر سے کھلے ہوئے رکھے ہیں، لہٰذا ناگوار تاریکی ہونے نہیں پاتی اور ہوا بھی ان مسجدوں کی نسبت زیادہ بے روک آتی جاتی ہے جن کے صحن چار دیواری سے گھرے ہوئے ہوں۔ رہی تنہائی اور علیحدگی، تو یہ بات بھی باہر کچھ فاصلے سے احاطے کی دیوار بنا دینے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ غرض مجموعی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ ان ہر دو طرز میں، گلبرگے والی صورت، سہولت اور حسن تعمیر دونوں اعتبار سے بہتر ہے اور وجہ ترجیح اس قدر قوی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا ایک دفعہ آزمائش کے بعد پھر اسی کی تقلید کیوں نہیں کی گئی۔ غالباً اس عدم تقلید کا سبب یہ ہوگا کہ بارش کے زمانہ میں اتنی بڑی چھت کا پانی نکالنا دشوار نظر آیا اور پانی کا رکنا یا کہیں درز کا پڑ جانا یقیناً خطرناک ہوتا۔ لیکن گلبرگے کی یہ مسجد تو چار صدی تک قریب قریب بلا شکست

پڑی رہی اور باوجود اس تغافل کے اچھی خاصی حالت میں موجود ہے۔ بہرحال وضع کے بارے میں جو رائے بھی قائم کی جائے یہ تو مسلم ہے کہ پرانی مسجدوں میں، کم سے کم ان میں جو کلیتہً نئے مصالحے سے خالص اسلامی مخصوص طرز پر بنائی گئی ہیں، یہ سب سے اچھی مساجد میں داخل ہے۔ بے شبہ دہلی اور اجمیر کی مسجدوں میں زیادہ دلکشی ہے مگر اس کے اسباب دوسرے ہیں۔ بجالیکہ اسے محض اپنے اصلی نقشے اور ساخت کی بناء پر عظمت و شان حاصل ہوتی ہے[1]۔

مسجد کے علاوہ گلبرگے میں ایک بازار کل ۵۷۰ فیٹ لمبا اور ۶۰ فیٹ چوڑا ہے جس کو ۶۱، ۶۱ کمانوں کی دونوں طرف قطاریں بناکے مزین کیا ہے۔ ان کے ستون نیم ہندی وضع کے ہیں اور دونوں سروں پر بڑے تکلف کے مکان بنا دیئے ہیں۔ اس قسم کی ایسی قابل دید عمارت، جہاں تک مجھے واقفیت ہے ہندوستان میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ کمانوں کا ایک سلسلہ جو اس بازار سے بہت ملتا جلتا ہے، وجیانگر کے ایک بازار میں بھی تھا جسے جاتریوں کا بازار کہتے تھے اور ممکن ہے کہ اس گلبرگے کے بازار کا بھی مال ہو۔

گلبرگے میں اور آثار قدیمہ بھی ہیں جن میں شہر کا ایک بہت بڑا دروازہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ خواجہ بندہ نواز رح کی درگاہ کے مقابل، سنہ ۱۶۴۰ء کے قریب تعمیر ہوا تھا۔ شہر کے مشرق میں بعض عالیشان مقبرے ہیں۔ ان میں سات بہمنی بادشاہوں کے ہیں۔ یہ مربع عمارت پر بہت چوڑے آثار کے گنبد ہیں جن کی دیواریں سلامی دار بنائی ہیں۔ بعض کے بیرونی رُخ پر پتھر کے خوشنما نقش و نگار ہیں مگر اس کے علاوہ اور کوئی عمارتی خوبی ان میں نہیں پائی جاتی ہے۔ یہ اندر خوب آراستہ پیراستہ ہیں۔ مگر ان میں سرکاری دفاتر اور مکانات بن گئے تھے۔

---

[1] اس مسجد کا نقشہ میرے دوست مسٹر آرتھر گدوٹن نے (جواب لارڈ اٹیمن مور ہیں) خود بنایا تھا اور کمال عنایت سے مجھے بھیجدیا۔ مسجد آجکل شکستہ حالت میں ہے۔ ایک زمانہ میں مرمت کیجارہی تھی کہ پاس کے کسی بارود خانہ میں آگ لگ گئی اور یہ کام رک رہا۔ لیکن اس کے بعد حال میں دوبارہ شروع کیا گیا ہے۔

اور اب تک (یعنی تحریر کتاب تک) یہی کام لیا جاتا ہے ؎

احمد شاہ اوّل نے گلبرگہ چھوڑ کر، یہاں سے کچھ اوپر ساٹھ میل کے فاصلے پر بیدر کو اپنا پائے تخت بنایا تو نئے دارالملک کی عمارات عالیشان سے جو شاہان بہمنی کی عظمت کے شایان تھیں، زیب و زینت بڑھائی۔ مگر یہ اب بہت شکستہ حالت میں ہیں۔ ان میں سب سے پرشکوہ عمارت خواجہ محمود گاوان کا مدرسہ نظر آتی ہے جو محمد ثانی کا باوفا مگر بدقسمت وزیر تھا یہ ۲۰۵ × ۱۸۰ فیٹ کی عمارت تھی جس کے مشرقی رُخ، سروں پر رفیع الشان برج بنے ہوئے تھے۔ ان برجوں کے ساتھ یہ سہ منزلہ مدرسہ جس کی پوری روکار ورنہ کم سے کم برجوں کی بیرونی سطح پر مینا کاری کی تھی، حقیقت میں ایک عجیب عمارت ہوگی یہ معلوم ہوتا ہے اس کی تکمیل بانی کی وفات سے دو سال قبل ۱۴۸۱ء میں ہوئی اور مورخ فرشتہ کے زمانے میں یہ ہندوستان کی جامع ترین اور نہایت بارونق جامعات میں گنی جاتی تھی[1]۔ افسوس ہے کہ ۱۶۵۶ء میں عالمگیری لشکر نے اس کا محاصرہ کیا تو اس میں ایک بارود کا ذخیرہ جمع کیا گیا جس میں عمداً یا اتفاقیہ آگ لگ جانے سے عمارت کا ایک بازو برباد ہو گیا۔ اس وقت سے یہ بے کار و غیر آباد پڑی ہے مگر جو کچھ بری بھلی معلومات بہم پہنچ سکتی ہے اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنے زمانے میں یہ کمال شان و شوکت کی عمارت ہوگی ؎

بیدر کے بالا حصار میں شاید سب سے محفوظ و سالم عمارت وہاں کی مسجد ہے جس کا طول ۲۰۵ (اور مسقف) عرض ۷۰ فیٹ ہے۔ ۱۹ محرابی در، اور اندر اسی مدور پائے (۴½ فیٹ قطر کے) بنا کے ان پر چھت قائم کی ہے۔ وسط میں محرابوں اور تین زینے کے منبر کو لئے ہوئے ۳۰ مربع فیٹ کا مقصورہ ہے یہاں چھت سے اوپر ایک مثمن درجہ اٹھا کے اس پر ایک بڑا گنبد بنایا ہے۔ چھت پر کوئی ۴۸ چھوٹے گنبد اور بھی تھے مگر اس کے کئی حصے گر پڑے ہیں ؎ شہر سے باہر تقریباً پانچ میل شمال مشرق میں بہمنی بادشاہوں کے دس مقبرے بھی اسی طرز

---

[1] برگز کا ترجمہ فرشتہ۔ ج ۲ ص ۵۱۰ ؎

کے خاصے شاندار بنے ہوئے ہیں ان میں سب سے بڑا احمد شاہ کا مقبرہ ہے جس نے ۱۴۳۵ء میں وفات پائی۔ ان میں آرائش و زیبائش کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا ہے مگر ساخت عمدہ اور زبردست آثار نیز رقبہ وار تفاع سے عظمت برستی ہے۔

بریدشاہیوں کے گنبد بھی (جنھوں نے ۱۴۹۲ء سے ۱۶۰۹ء تک حکومت کی) کافی شاندار اور وسعت میں گولکنڈے کے گنبدوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس خاندان کے دوسرے بادشاہ امیر برید (۱۵۰۴ء تا ۱۵۳۰ء) کا مقبرہ شہر کے مغرب میں کوئی آدھے میل کے فاصلے سے ایک وسیع اور مضبوط چبوترے پر، تقریباً ۵۰ فیٹ مربع بنا ہوا ہے۔ اس کی دیواریں ۹ فیٹ ۸ انچ چوڑی اور چبوترے کے اوپر ۵۰ فیٹ اونچی چلی جاتی ہیں۔ ان کے سرے پر خوشنما کنگورہ دار کا حاشیہ بنا دیا ہے۔ گنبد کی بلندی ۷۳ فیٹ ہے۔ اندر سے رنگین پتھروں کی پٹیاں ڈال کے اس کی شان بڑھائی اور خط طغریٰ میں عربی کلمات سے تزئین کی ہے۔[1]

---

[1] بیدر کے متعلق مزید معلومات کے واسطے دیکھو "ارکیولوجکل سروے اوف ویسٹرن انڈیا"، جلد سوم۔ (حال میں سررشتہ آثار قدیمہ سرکار عالی نے اس پر ایک مستقل رسالہ شایع کیا ہے۔ مترجم)

باب نہم

بیجاپور

جامع مسجد ۔ ابراہیم و محمود کے مقبرے ۔ دیوان عام ۔ مہتری محل ۔ گولکنڈے کے گنبد ۔ نواب امیر خاں کا مقبرہ ۔

سنین

یوسف عادل شاہ .... سنہ ۱۴۹۰ء
اسمٰعیل عادل شاہ .... سنہ ۱۵۱۰ء
ملو عادل شاہ .... سنہ ۱۵۳۴ء
ابراہیم عادل شاہ اوّل .... سنہ ۱۵۳۵ء
علی عادل شاہ اوّل .... سنہ ۱۵۵۷ء
ابراہیم عادل شاہ ثانی .... سنہ ۱۵۸۰ء
محمد عادل شاہ .... سنہ ۱۶۲۶ء
علی عادل شاہ ثانی .... سنہ ۱۶۵۶ء

جیسا کہ اوپر بیان ہوا گلبرگے کا بہمنی خاندان دہلی کی مرکزی سلطنت یا دکن کی کسی اور معاصر مملکت کی مدد لئے بغیر خود ہی ڈیڑھ صدی تک جنوب کی ہندو ریاستوں سے آویزش و پیکار میں مصروف رہا لیکن پندرھویں صدی کے ختم سے پہلے اس میں اسی زوال و کمزوری کے آثار نمایاں ہونے لگے جو تمام

ایشیائی بادشاہوں کا طبیعی خاصہ ہے۔ اور ممکن تھا کہ ہندو ریاستیں کم سے کم سنہ جیساجل تک پھر آزاد و خود مختار ہو جائیں کہ اتنے میں یوسف عادل خاں کی شکل میں ایک نیا اور قوی تر حریف میدان میں آگیا جسے سلطان ترکی مراد ثانی کا بیٹا خیال کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ خالص ترک تھا اور استنبول میں اس کی ولادت ہوئی اگرچہ اس کی ماں کو شیر خوارگی ہی کے زمانے میں اسے مجبوراً وہاں سے باہر بھیج دینا پڑا۔ گردش روزگار کے بہت سے تماشے دیکھنے کے بعد اسے بیدر میں امیر برید کے لئے خرید لیا گیا اور فوج رکاب میں خدمت پاکے وہ بہت جلد اتنی ترقی کر گیا کہ ۱۵۰۱ء میں دستور دینار نے شکست کھائی تو یوسف عادل خاں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ لیکن نئے خاندان شاہی کے پچاس ساٹھ سال بقا کے لئے سخت کشمکش میں گزرے اور عادل شاہی سلاطین کو اتنی مہلت نہ مل سکی کہ وہ تعمیر و تزئین کی طرف توجہ کر سکتے۔ ان کے پائے تخت کا اصلی دور تعمیر علی عادل شاہ کی بادشاہی (۱۵۵۸ء) سے شروع ہوتا ہے۔ اور تمام مشہور و معروف عمارات کی بنا اسی سو برس کے اندر پڑی جو علی کی تخت نشینی اور عالمگیری محاربات کے درمیان کی صدی ہے جس کے بعد اس بادشاہی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ بایں ہمہ اسی زمانے میں ان کا پائے تخت ایسے سلسلۂ عمارات سے مزین ہو گیا جو اسی قدر ممتاز ہیں جس قدر ہندوستان کے کسی دوسرے اسلامی پائے تخت کی عمارتیں۔ اور اس قول سے آگرہ و دہلی کو بھی بمشکل مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے پھر ساخت کی جدت کے اعتبار سے دیکھئے تو یہ عمارتیں ایسی عجیب ہیں کہ جونپور و احمد آباد جیسے مقامات کی عمارتیں بھی ان سے بڑھ کر نہیں ہیں۔ حالانکہ ان کا طرز عمارت ان عمارتوں سے بہت کچھ مختلف ہے۔

یہ فیصلہ کرنا سہل نہیں ہے کہ اس جدت کا سبب عادل شاہیوں کا تورانی نژاد اور ہر ہندی شے سے متنفر ہونا تھا، یا ایسے مقامی اثرات سے جن کو اب ہم صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے، یہ فرق پیدا ہوا۔ بہت ممکن ہے کہ ان کا غیر نسل سے ہونا اور سنت و الجماعت فرقے کی بجائے ایران کے شیعہ عقائد کی طرف میلان اور

اہل ایران کو شوق سے اپنے ہاں عہدے دیا۔ ان سب نے مل کر عادل شاہی طرزِ تعمیر پر بھی اثر ڈالا اور اس میں رفعت و شان اور وسعت و فراخی کی خصوصیات پیدا کی ہوں گی۔

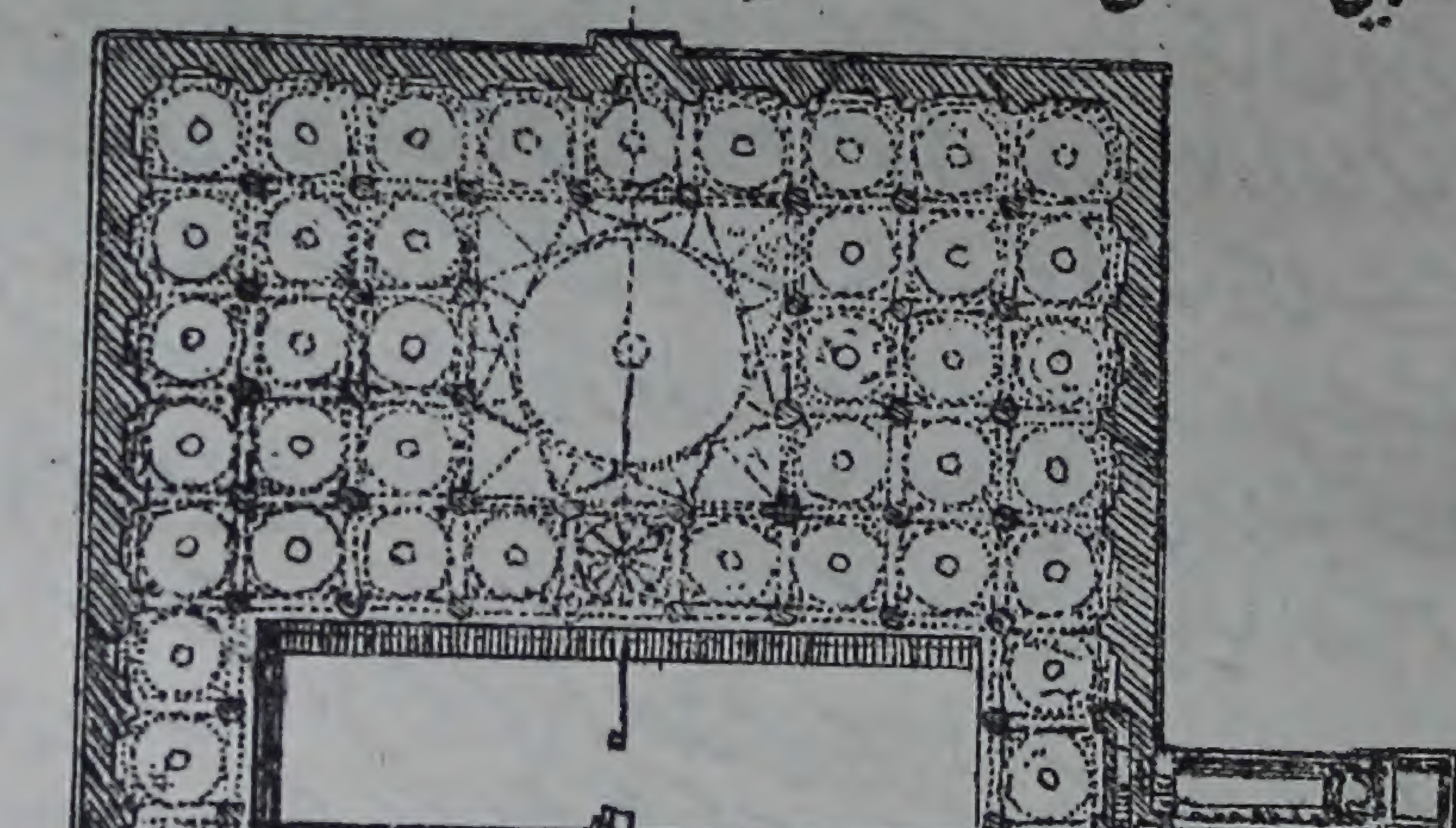
عادل شاہیوں سے پہلے مسلمان فاتحین نے کریم الدین کے ماتحت ۱۳۱۶ء کے قریب بیجاپور کے قلعے میں ایک مسجد ہندو کھنڈروں کے ملبے سے تعمیر کی تھی۔ اس میں جو ستون لگے ہوئے ہیں یہ کس حد تک دوسری عمارتوں سے لئے گئے اس بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں ہے لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کا ایک حصہ کسی ہندو مندر کے پیش دالان کا ہے۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ دوسرے اجزا بھی اور جگہ سے ہٹا کے موجودہ صورت میں مرتب کر دیئے گئے ہوں۔ ایک اور قدیم مسجد خواجہ جہاں کی ہے جو پندرھویں صدی کے اخیر میں تعمیر ہوئی اور ہندو مندر سے ملتی جلتی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسے بھی پرانے مندروں کے ملبے سے بنایا گیا ہوگا۔ بایں ہمہ جس وقت نئے خاندان شاہی کو عمارات پر توجہ کرنے کی فرصت میسر آئی تو انھوں نے ہندی اوضاع اور صناعی کی نقل کرنے کے خیال کو کلیتہً ترک کر دیا اور اپنی نکیلی کمان یا قبے کا خاص طرز اختیار کیا اور اس میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔[1]

جامع مسجد، جو شہر کی قاعدے کی عمارتوں میں ایک قدیم عمارت ہے، علی عادل شاہ نے (۱۵۵۷ء تا ۱۵۷۹ء) بنانی شروع کی اور گو اس کے جانشین بھی اسی نقشے پر بناتے رہے لیکن حقیقت میں وہ آخر تک مکمل نہ ہو سکی بلکہ اس بادشاہی کا چراغ گل ہوا تو اس وقت بھی صدر دروازہ اور صحن کا

---

[1] بیجاپور اس معاملے میں خاص طور پر خوش نصیب ہے کہ اس کے آثار قدیمہ کا حال نہ صرف کثرت سے بلکہ نہایت خوبی سے بالتصویر معرضِ تحریر میں آتا رہا ہے۔ کپتان ہارٹ کی نگرانی میں کمنگ نے اس کی عمارتوں کے جو خاکے اور نقشے اتارے ہیں وہ حسنِ نقاشی اور صحت کے اعتبار سے بے نظیر ہیں۔ میں نے انھیں ۱۸۵۹ء میں پہلے سرکار کے خرچ سے اور پھر مجلس ایشیائے قدیمہ مغربی ہند کی طرف سے بعض مناظر کی تصاویر کے اضافے کے ساتھ ۱۸۶۶ء میں چھپوا دیا تھا۔

جو تھا رُخ ناتمام تھا۔ اس کے باوجود یہ ہندوستان کی بہترین مساجد میں داخل ہے ؎
جیسا کہ ذیل کے خاکہ سے ظاہر ہوگا، مکمل ہو کے یہ ۲۳۱ × ۲۰۷ فیٹ کی مستطیل عمارت ہوتی۔ صدر عمارت اب بھی مکمل ہے اور ۲۰۵ × ۱۴۵ فیٹ، یعنی تقریباً ۲۷ ہزار مربع فیٹ کے رقبے پر بنی ہوی ہے گویا بجائے خود گلبرگے کی مسجد کے برابر ہے اور پہلوؤں کے دالان جو ۱۸۶ فیٹ آگے بڑھے ہوئے ہیں، اس کے علاوہ ہیں۔ اسی طرح اگر یہ مسجد



تصویر نمبر ۱۱

مکمل ہوجاتی تو قرون وسطی کے ایک بڑے کلیسا کے برابر وسیع ہوتی لیکن

اس کی وسعت و ترتیب سے بھی بڑھکر دلکش چیز اس کی صناعی ہے اس کے ہر مربع پر نہایت خوشنما گنبد بنے ہوئے ہیں مگر اوپر سے انھیں اتنا چپٹا رکھا ہے کہ باہر سے چھت کی موٹائی کے اندر چھپ گئے ہیں۔ اس قسم کے بارہ وسطی مربعوں پر ایک بڑا ۵ء۷۱ فیٹ کے قطر کا گنبد ہے اور خود جس مربع پر وہ قائم ہے اس کا ہر پہلو ۷۰ فیٹ پڑتا ہے۔ محمد عادل شاہ کی قبر پر ۱۲۴ فیٹ قطر کا جو عظیم الشان قبہ اسی نقشے پر بعد میں بنا، وہ اس گنبد سے کہیں زیادہ وسیع و رفیع ہے لیکن کمتر عرض و ارتفاع کے باعث یہاں معمار کو موقع مل گیا کہ نسبتہً زیادہ ممتاز و دلکش خطوط نمایاں کرے اور اگر وہ گنبد کے قاعدے کی ٹپیاں چیر کر ان میں دریچے بنانے کی ہمت کر جاتا تو غالباً اس قسم کی ساری عمارتوں میں، جو پردہ عالم پر موجود ہیں، سب سے حسین عمارت بنانے کا شرف اسی کے حصے میں آتا۔

صحن مسجد کے مشرقی گوشوں پر دو مینار بنائے جانے والے تھے لیکن ٹرت شالی کی تعمیر کا باقاعدہ آغاز ہونے پایا۔ بعد میں مشرق کی طرف صحن ۹۵ فیٹ بڑھا کے ایک وسیع دروازہ سامنے والے رُخ کے وسط میں بنایا گیا اور اس کے جنوب میں ایک دالان کا بھی کچھ حصّہ تعمیر ہوا۔

اس مسجد کے نقشے کا گلبرگے کی مسجد سے مقابلہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ان کے درمیان ڈیڑھ صدی کا جو فرق ہے، اس میں ہندوستانی معماروں نے ساخت کی صفائی اور کاریگری کی خوشنمائی میں کس قدر حیرت انگیز ترقی کی۔ ان دونوں کے خاکے ایک ہی پیمانے پر کھینچے جائیں تو یہ فرق ایک ہی نظر میں محسوس ہو جائیگا لیکن ایک چھوٹے پیمانے پر گلبرگے کی مسجد کی جزئیات مشکل سے نمایاں ہو سکتی ہیں۔ بحالیکہ بیجاپور والی کی باقاعدگی اور اجزا کی فراخی کا اندازہ اسی پیمانے کے خاکے سے پوری طرح عیاں ہے۔ یہ عمارت بھی زیادہ کامل لیکن گلبرگے کی قدیم مسجد میں جو خوشنمائی اور ترتیب کی شاعرانہ خوبی پائی جاتی ہے، وہ اپنے جدید تر حریف سے صناعی اور نفاست میں کمتر ہونے کی بہت کچھ تلافی کر دیتی ہے۔

عادل شاہ ثانی (سنہ ۱۶۵۶ تا سنہ ۱۶۷۲ء) نے اپنے واسطے جو مقبرہ بنانا شروع کیا، وہ بہت بلند مربع کرسی پر ہے جس کا ہر پہلو ۲۱۵ فیٹ ہے اگر یہ مقبرہ

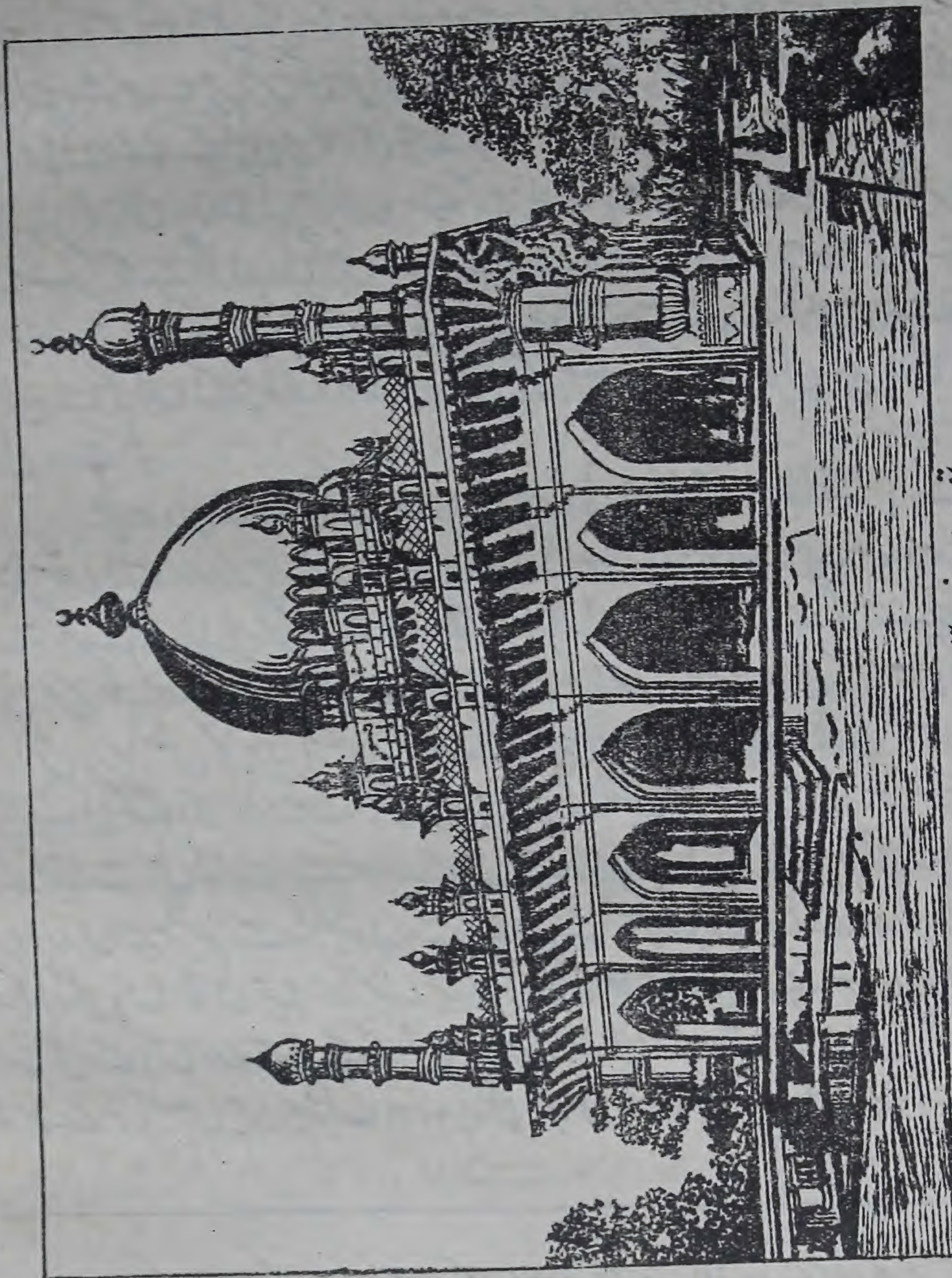
اصلی نقشے کے مطابق مکمل ہو جاتا تو ہندوستان کے بہتر سے بہتر مقبرے کی ٹکر کا ہوتا۔ اس کا وسطی کمرہ ۹۰ فیٹ مربع ہے اور اس کے ہر طرف دہرے دالان بنے ہوئے ہیں جن کی محرابیں غوطی طرز کی طرح دو مرکزوں سے اٹھائی اور گولائی دے کے تخیلی پر لا دی ہیں ؎

تورانی رواج کی خرابی یہ ہے کہ ہر بادشاہ جو اپنی زندگی میں اپنا مقبرہ تعمیر کرتا ہے، اگر اس کی تکمیل سے پہلے فوت ہو جائے تو وہ ادھورا رہ جاتا ہے مگر جواب میں کہ سکتے ہیں کہ اگر وہ زندگی میں بنانا شروع نہ کرے تو پھر بہت ممکن ہے کہ اس کے پسماندہ اتنا بھی نہ کریں کہ اس کی کوئی قابل دید یادگار باقی رہے ؎

علی عادل شاہ ثانی کے دادا ابراہیم ثانی (۱۵۷۹ء تا ۱۶۲۶ء) نے اپنا مقبرہ ایسے محدود پیمانے پر (یعنی کل ۱۱۶ فیٹ مربع) بنایا تھا کہ جب وہ عرصۂ دراز تک اقبال مندی کے ساتھ حکمرانی کرتا رہا، تو اس عمارت کو اپنے، اپنی عزیز ملکہ اور اقربا کے شایان شان بنانے کی صورت یہی رہ گئی کہ اس کی آرائش و زیبائش کا پورا اہتمام کیا جائے چنانچہ عمارت کے ہر ہر حصے پر اس تکلف کی گلکاری اور سنگ تراشی کی ہے جس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔ خط طغریٰ کے کتبات اس کثرت سے کھودے ہیں کہ بیان کیا جاتا ہے کہ پورا قرآن شریف دیواروں پر مرتسم ہے۔ کنگنیوں کے نیچے بڑے تکلف کے توڑے اور دیوارگیریاں لگائی ہیں۔ دریچوں میں جالی کا نفیس کام کیا ہے۔ غرض ہر حصہ صناعی سے اس درجہ معمور ہے کہ اگر کاریگر ہندوستان کے چابک دست لوگ نہ ہوتے تو اس میں بھڑک اور بدنمائی آ جاتی ؎ تصویر میں ہم نے اس

سلہ ابراہیم کی قبر کے ایک طرف اس کی عزیز بیٹی زہرہ سلطانہ اور دوسری طرف ماں کی قبر ہے اور اس کے برابر بادشاہ بیگم تاج سلطانہ مدفون ہے۔ کہتے ہیں یہ روضہ اسی ملکہ کی یادگار بنایا گیا ہے۔ باقی دو قبریں بادشاہ کے بیٹوں کی ہیں ؎

دلکش مقبرے کی مشرقی روکار دکھائی ہے ؕ



تصویر نمبر ۳۰

مقبرے میں بڑا کمرہ مربّع اور اس کا ہر پہلو ۳۹ فیٹ ۱۰ انچہ ہے۔ اس پر پتھر کی چھت ڈالی ہے اور بیچ میں بالکل سپاٹ پٹیاں کورسے کو رلا کے جمادی ہیں

جن کے نیچے صرف ایک چھجے کا سہارا ہے جو ہر جانب دیوار سے ۷ فیٹ ۷ انچ آگے نکلا ہوا ہے۔ باقی تمام سپاٹ چھت کس چیز پر ٹکی ہوئی ہے یہ وہ بھید ہے جسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو واقف ہوں کہ ہندوستان میں چونے کے ڈھیوں اور عمدہ گچ سے کیسے عجیب عجیب کام لئے جاتے ہیں ۔ اس کمرے کے اوپر ایک اور کمرہ گنبد کے اندر بھی اسی نیچے والے کی طرح آرائشی بنا دیا ہے۔ جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ قبے کی متناسب بلندی سے عمارت میں خوشنمائی پیدا ہو جائے۔ دیوار کے آثار میں ایک تنگ و تاریک سا زینہ بنایا ہے کہ اس حجرے کے اندر تک پہنچ سکیں ؛

مقبرے کے ساتھ جواب میں ایک اتنی ہی خوبصورت مسجد بنائی ہے۔ دریہ عمارتیں جس شاہی باغ کے اندر ہیں۔ اسکی حسب معمول فوارے گلباڑیاں وغیرہ بنا کے زیب و زینت بڑھائی ہے اور باہر کے رخ لنگر خانے، مسافر خانے وغیرہ بنے ہوے ہیں۔ غرض یہ کل مجموعہ ایسا ہی پر تکلف اور خوش منظر ہے جیسی ہندوستان میں اس قسم کی بہترین عمارات ہیں اور استنبول کے (مغرب) پار کی عمارتوں سے تو کہیں بڑھ چڑھکر ہے ؛

اس بادشاہ کے جانشین محمد (سنہ ۱۶۲۶ تا سنہ ۱۶۵۶ء) کا مقبرہ نقشے کے اعتبار سے مذکورہ بالا مقبرے سے بالکل متضاد سمجھنا چاہیے۔ ابراہیم کے مقبرے کی خصوصیت، باریک کام کی کثرت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ باقی بڑی بڑی عمارتوں کو لغو سمجھتا ہے مگر محمد عادل شاہ کے مقبرے کا امتیاز اس کی بڑائی اور سادہ عظمت ہے ؛ بیجاپور کی بڑی مسجد کا گنبد جس اصول پر بنایا گیا ہے۔ یہ مقبرہ بھی اسی اصول پر تعمیر ہوا لیکن اتنے بڑے پیمانے پر کہ فن تعمیر کا اعجاز بن گیا حالانکہ مسجد کا مذکورۂ بالا گنبد، محض ایک اعلیٰ عمارتی نقشے کا بروئے کار آجانا تھا ؛

خاکے سے معلوم ہوگا کہ اندر سے یہ ایک مربع مکان ہے جس کا ہر ضلع ۱۳۵ فیٹ ۵ انچ رکھا گیا ہے۔ اس طرح رقبہ ۱۸۳۳۷ مربع فیٹ ہوا اور اس کے مقابلے میں شہر رومہ کے پانتھیوں کی اندر سے پیمائش صرف ۱۵۸۳۳ مربع

فیٹ ہے۔ دونوں عمارتوں کی دیواروں میں جو خلا چھوڑے ہیں، ان کا حساب لگانے کے باوجود ان دونوں میں یہ مقبرہ ہی زیادہ بڑی عمارت ہے ؎

۵۷ فیٹ کی بلندی پر نہایت ہی نادر و خوشنما جھروکوں کا سلسلہ اندر کے رُخ نکالا اور ان سے ایوان کو دائرے کی صورت میں تنگ کر دیا ہے کہ اس کا قطر یہاں ۹۷ فیٹ رہ جاتا ہے۔ پھر ان جھروکوں کی بالائی چھت پر جو فرش سے ۱۰۹½ فیٹ اونچی ہے گنبد اٹھایا ہے جس کا قطر ۱۲۴ فیٹ ۵ انچ ہے اور اس طرح بیچ میں ۱۲ فیٹ چوڑی ایک غلام گردش چھوڑ دی ہے۔ جو اندر سے پورے گنبد کے گرد گزرتی ہے ؎ اندر کے فرش سے ناپئے تو گنبد کی بلندی ۱۷۸ اور باہر کے چبوترے سے لیجئے تو ۱۹۸ فیٹ ہے۔ نیچے اس کا آثار دس اور اوپر کی تیلی پر پہنچ کر نو فیٹ رہ گیا ہے ؎

سب سے بڑا کمال اور جدّت جو اس گنبد کی ساخت میں دکھائی ہے وہ اس کے جناحی یا بیرونی لداؤ کو تھامنے میں ہے کہ اندر کے جھروکے اس طریق سے بنائے ہیں کہ ایک طرف تو آثار کے زاوئیے ان پر قائم ہو جاتے ہیں اور دوسرے ان کی کمانیں ایک دوسرے سے آ کے مل جاتی ہیں اور بجائے خود نہایت مضبوط اور خوب چوڑی عمارت بن گئی ہیں۔ ان کا اندر کے رُخ ہونا گنبد کے وزن کو باہر کی طرف ڈھلکنے سے روکتا ہے اب اگر اس توازن کی عمارت چال کرے بھی تو اس کو اندر کے رخ گرنا چاہئے جو اس کے مدوّر ہونے کے باعث غیر ممکن ہے اور ادھر جھروکوں کا وزن، گنبد کے مخالف سمت میں ہونے کے باعث یہ ایک گرہ سی لگ گئی ہے جو پوری عمارت کے توازن کو تھامے ہوئے ہے اور گنبد کی خوشنمائی اور ظاہری صورت میں بھی کوئی خلل نہیں پاتا ؎

پان تھیوں اور یورپ کے اکثر گنبدوں میں ڈھلاؤ پر اتنی زیادہ چنائیاں کر دیتے ہیں کہ بیرونی صورت ہی چھپ جاتی ہے اور حقیقت میں اندر کی طرف بوجھ دے کے نفاست کے ساتھ توازن قائم کرنے کے مقابلے میں یہ مغربی طریقہ عجب بے ڈھنگا اور بھدّا ہے۔ دوسرے بیجاپوری گنبد کو جہاں اس تدبیر سے ایسی مستحکم بنیاد بہم پہنچ گئی ہے کہ اس پر گنبد بے تکلف استادہ رہ سکتا ہے

اور کسی ڈھلاؤ سے اس کے چال کر جانے کا اندیشہ باقی نہیں رہتا، وہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر اس کی ساخت پر نظر ڈالیں تو بظاہر عقل میں نہیں آتا کہ یہ گنبد قائم کیونکر ہو سکتا ہے۔ ذیل کے نقشے پر غور کیجیے کہ۔

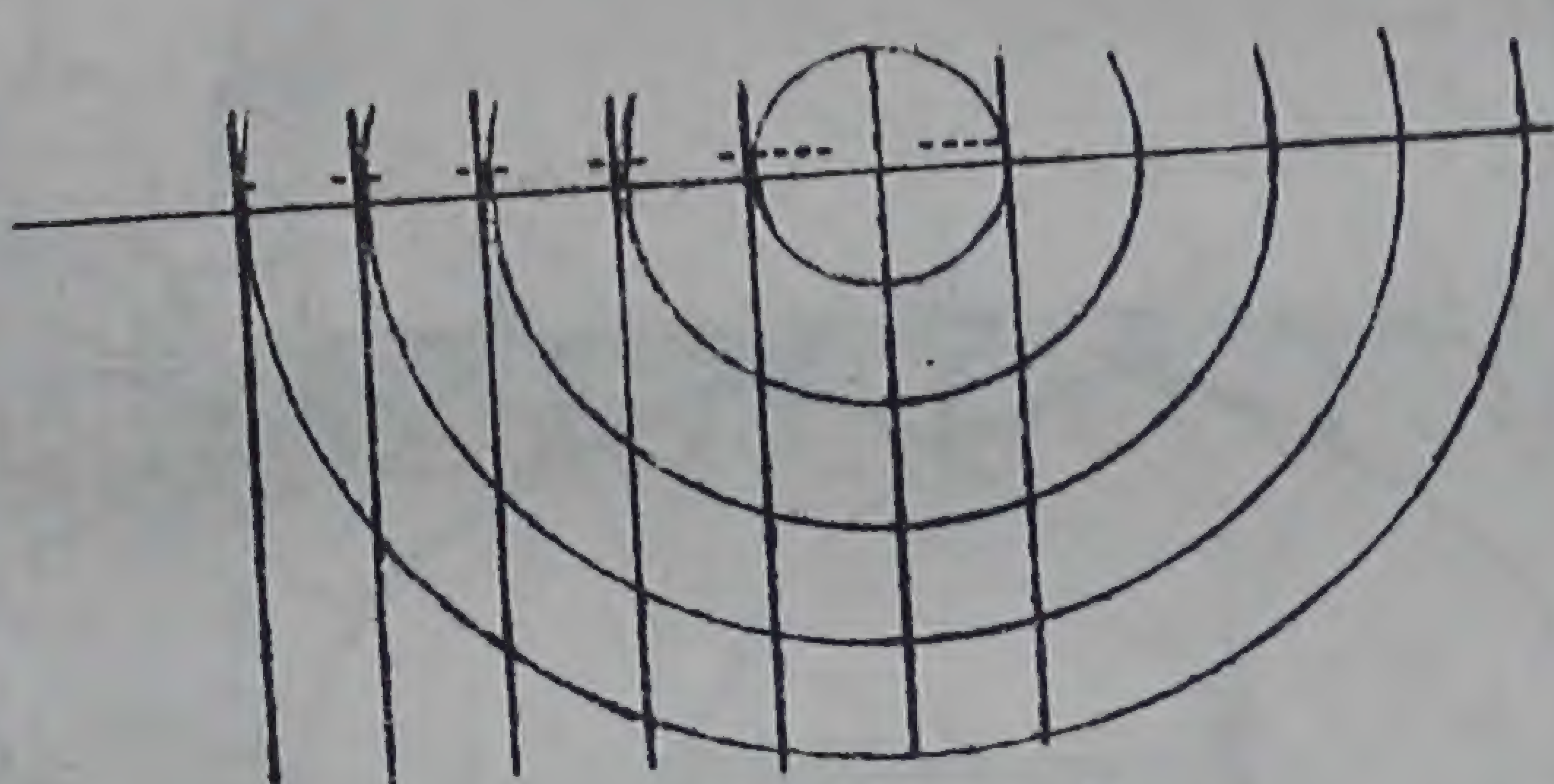


تصویر نمبر ۱۴۷

اگر یہ کسی محراب یا لداؤ کی چھت کا نقشہ ہوتا تو عمارت ایک گھنٹے بھی کھڑی نہ رہ سکتی تھی لیکن خود گنبد کو دیکھئے تو اسے ایسی تدبیر سے بنایا ہے کہ جس طرح یہ تدبیر معمولی محراب یا لداؤ کے واسطے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی قریب قریب اسی طرح گنبد کے بناتے ہیں کبھی ناکامیاب بھی نہیں رہ سکتی ہے چونکہ صنعت کے اعتبار سے بھی آج تک چھت کی سب سے خوشنما صورت گنبد ہی ایجاد

ہوئی ہے، لہذا مناسب ہوگا کہ بیجاپور کے اس عظیم الشان قبے کا جو اس وقت تک دنیا کا سب سے غیر معمولی اور پیچیدہ ترین ساخت کا گنبد ہے، ذکر ختم کرتے وقت ہم گنبد سازی کے اصول پر ذرا تفصیل سے غور و بحث کریں۔

فرض کیجئے ذیل کی شکل ایک بالکل چپٹے گنبد کا خاکہ ہے جس کا قطر سو فیٹ اور سہم یا پٹیاں دس دس فیٹ چوڑی ہیں۔ اب سہولت کی غرض سے فرض کیجئے کہ کل گنبد کا وزن ۷۸۵۰ ٹن ہے۔ اس صورت میں بیرونی پٹی ۲۸۲۶ ٹن کی یا



تصویر نمبر ۱۸۴

اندر کی اکٹھی تین پٹیوں کے وزن کے برابر ہوگی۔ دوسری ۲۲۰۴ تیسری ۱۵۶۸، اس کے بعد کی ۹۴۲ اور اندر کی صرف ۳۱۴ ٹن وزن کی ہوگی۔ گویا اس آخری یا اندر کی دو پٹیوں کی دبازت زیادہ رکھنی پڑے گی اور یہ بھی اہتمام کرنا ہوگا کہ اس زائد دبازت سے گنبد کی مضبوطی پر برا اثر نہ پڑے لیکن حقیقت میں یہ خواہی نخواہی کی دشواری پیدا کرنا ہے اور ہمیں اس مفروض کی بجائے گنبد کو نیم کروی قیاس کرنا چاہیئے جس کا پہلا سہم عرض میں صرف دس لیکن بلندی میں ۳۰ فیٹ اور وزن میں ۹۴۲۰ ٹن ہوگا۔ دوسرے کی بلندی ۱۰ ا تیسرے کی ۶ فیٹ ہوگی ان کا وزن بھی علی الترتیب ۳۱۴۰ اور ۱۰۸۰۴ ٹن ہوگا چوتھا سہم ۹۴۲ اور مرکزی حصہ پہلے مفروضہ گنبد کی آخری پٹی کی مثل صرف ۳۱۶ ٹن کا ہوگا۔

اب اس نیم کروی گنبد کا سب سے پہلا سہم جو سب سے سیدھا

واقع ہوا ہے ظاہر ہے کہ اس کے ڈھلکنے یا چال کرنے کا احتمال سب سے کم ہے اور چونکہ گنبد کا دو تہائی وزن یہیں ہے، لہذا اسے مضبوطی سے درست تعمیر کر دیا جائے تو باقی ایک تہائی وزن کو پوری طرح سنبھال سکتا ہے جس میں باقی سارا گنبد بنا ہوا ہے"

اوپر کی شکل، یا کسی گنبد کے اصلی خاکے کو دیکھکر صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سہم کو گنبد کے قاعدے سے مضبوط اٹھانا سہل بات ہے اور جب یہ قوت کے ساتھ اصل بنیاد پر بن گیا تو پھر معمار باقی حصے کو جس طرح چاہے ڈھال سکتا ہے اور کوئی بہت ہی اناڑی معمار ہوگا جو اسے بخوبی سنبھلے رہنے کے لائق نہ بنا سکے۔ ممالک مشرق میں تو کاریگروں نے عجیب عجیب وضع سے ان گنبدوں کو بنایا ہے اور تعمیری قواعد سے کہیں زیادہ خوشنمائی کا لحاظ کیا ہے باوجود اس کے شاذ و نادر ہی کوئی نظیر اس امر کی ملے گی کہ تعمیر کے نقص سے کوئی گنبد گر پڑا ہو"

برخلاف مشرقی معماروں کے، یورپ کے معمار گنبد بنانے میں ہمیشہ کے کم ہمت اور اناڑی تھے البتہ اب ہمارا علم اتنا ترقی کر گیا ہے کہ محمد عادل شاہ کے اس گنبد سے بھی کہیں بڑے گنبد بلا خطر اور زیادہ دلیری کے ساتھ بنانے آسان ہوں گئے"

یہ عمارت اندر سے جتنی خوبصورت ہے اسی قدر حسن اس کی بیرونی آرائش میں پایا جاتا ہے۔ ہر زاویئے پر ایک ہشمن برج آٹھ منزل کا بنایا ہے جس کے اجزا سادہ اور نہایت رفیع الشان ہیں اور سب سے اوپر بہت ہی نفیس و خوشنما قبہ بنا دیا ہے۔ عمارت کا زیریں حصہ سادہ اور سنگین ہے اور اس میں مناسب روشنی اور ہوا کے واسطے صرف روشندان چھوڑ دیئے ہیں۔ ۸۳ فیٹ کی بلندی پر دیوار کے آگے ایک چھجہ ۱۲ فیٹ چوڑا نکالا ہے اور یہ چوڑائی اس قدر ہے کہ یورپ کے کسی باہمت سے باہمت معمار نے بھی اس کے نصف سے زیادہ عرض کا چھجہ کبھی نہیں تیار کیا۔ اس کے اوپر ایک کھلی ہوئی غلام گردش پوری عمارت کو زینت و تکمیل بخشتی ہے اور اس کے ہر رخ پر دو چھوٹے چھوٹے

مینار بنا کے مزید خوشنمائی پیدا کر دی گئی ہے۔

دوسری سرکاری عمارتوں میں بھی بیجاپور کے معماروں نے ایسی ہی اولوالعزمی دکھائی ہے۔ مثلاً وہاں کے دیوان عام یا آگن محل (۱۵۶۱ء) کی وسطی محراب ہی ۶۰ فیٹ ۹ انچ عریض ہے اور اگر آگے تو اچھی طرح نکلی ہوئی ہوتی تو بجائے خود فن تعمیر کی ایک یادگار چیز سمجھی جاتی بحالت موجودہ اس میں صرف معمار نے اپنا کمال دکھانے کی کوشش کی ہے اور اس لیئے زیادہ کامیاب نہیں کہہ سکتے۔ اس کا سائبان یا چھجہ چوبی تھا جس کے بعض ٹیکے اب تک اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ یہ بھی بیجاپور کی خصوصیت ہے کہ گو ہندوستان کے دوسرے مقامات میں چھتوں کو لکڑی سے بنانے کا رواج مدّت سے متروک ہو چکا تھا مگر یہاں (انگلستان کی طرح) برابر چوبی سائبان وغیرہ بنتے رہے۔ آثار مبارک یا آثار محل کی عمارت بھی ایک طرف سے بالکل کھلی ہوئی ہے اور ساری چھت صرف دو چوبی ستونوں پر جن کے اوپر بڑی دیوار گیریاں بنا دی ہیں، قائم ہے۔ اندر بھی تمام آرائشی کام چوبی کیا ہے۔ اس طریقے سے بیجاپور میں بھی وہی عمدہ نتیجے برآمد ہوئے جو انگلستان میں ہوئے تھے کہ زیادہ عریض چھت بنانے میں سہولت ہو گئی اور تعمیری زیب و زینت میں کہیں زیادہ تکلف و تجمل سے کام لیا جانے لگا۔ دوسری یہ ضرورت نہ رہی کہ عمارت کا بھدّا بھدّا ہونا بھی، چار و ناچار گوارا کیا جائے۔

شہر کی عمارات میں ایک سات منزل کا محل سات منزلہ نامی ہے۔ اس قسم کی عمارتیں دنیا کے دور دست گوشوں میں عجب طرح ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں اسی کے ساتھ آثار مبارک کے محل کو شامل کر لیجیے جسے مسلمانوں نے اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے موئے مبارک کی درگاہ قرار دے لیا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ تاتاریوں کی عمارات کو ان کے نسلی تعصبات سے جدا کر کے مشاہدہ کرنا کس درجہ دشوار معاملہ ہے۔

ان دو کے علاوہ شہر پناہ کے اندر پانچ محل اور تھے اور ان میں سے بعض بڑی شان و شوکت کی عمارتیں تھیں۔ نیز امرا اور دربار کے متوسلین کے

صدہا مکانات تھے مگر بیس سال ہوتے ہیں، حکومت بمبئی نے ان میں سے بہت سی قدیم عمارتوں کو جدید ضروریات کے موافق بنا لیا۔ نخار مسجد، ڈاک خانہ اور محمد عادل شاہ کے مقبرے کی مسجد سرکاری آرام خانہ (ریسٹ ہوس) بنا لی گئی تھی۔ یہ دونوں تو بعد میں واپس دے دی گئیں لیکن عدالت محل کو صاحب ضلع کا مسکن اور سورج محل کو اس کے بیوتات قرار دیا گیا چینی محل میں سرکاری دفتر آ گئے۔ انند محل میں مددگار صاحب ضلع نے سکونت اختیار کی۔ یاقوت دبلی (؟) کا محل مسافر بنگلہ بنا لیا گیا۔ خواص خاں کے مقبرے اور مسجد میں صدر مہتمم تعمیرات کا مکان اور کچہری قائم ہوئی۔ چھوٹے چینی محل کو مہتمم صاحب کوتوالی کا مکان قرار دیا گیا اور عرش محل، سول سرجن صاحب کی سکونت گاہ بن گیا؎

بیجاپور کی سب سے عجیب عمارتوں میں ایک وہ ڈیوڑھی ہے جسے مہتری خانہ کہتے ہیں۔ یہ ہندی اور اسلامی مخلوط طرز کی بنی ہوئی ہے اور اس کے ہر گوشے اور چپے چپے پر صناعی کی ہے لیکن کہیں بھی حسنِ تناسب اور نفاست کے اعلیٰ معیار سے گرتی ہوئی نہیں ہیں۔ یہ ۲۴ فیٹ مربع اور تین منزل کی عمارت ہے جس کے سامنے چھت پر دو سبک دمدمے بنے ہوئے ہیں۔ نیچے کی منزل میں چاروں طرف دو دو دریچے دیئے ہیں اور ان پر کمال خوبی سے سائبان بنائے ہیں۔ پہلی اور دوسری منزل کی چنائی اسی طریقے سے کی گئی ہے، جیسی ابراہیم عادل شاہ کے روضے کی۔ اصل میں یہ ایک مسجد کا دروازہ تھا اور ہندوستان میں اس سے بہتر ڈیوڑھی شاید کہیں نہ ہوگی اگرچہ عمارت کی خود یہ قسم کچھ اعلیٰ نہ سمجھی جائے؎

شہر کی زبردست فصیل کا محیط ۶¼ میل ہے جو بجائے خود ایک عظیم الشان کام ہے اسی کے ساتھ بانیوں کے مقبرے اور نواح بیجاپور کے کھنڈر، جو کبھی دنیا کے ایک بڑے شہر کا حصہ ہوں گے، ملا کر دیکھئے تو عجب شاندار ویرانی نظر آتی ہے جو ہندوستان میں ہر کسی جگہ کے آثار قدیمہ کی مد مقابل ہو سکتی ہے[۱]؎

۱؎ چند صفحہ قبل جن دو ماخذوں کا ذکر آیا، ان کے علاوہ مصنف کتابچۂ ادارۂ شاہی معماران برطانیہ کی

اگر کافی مواد میسر آئے تو تاریخی حیثیت سے یہ مطالعہ کرنا کمال دلچسپی کا موجب ہوگا کہ دکن کے شاہی خاندانوں نے جو ایک دوسرے کے بعد میدان میں آئے اور شان و شوکت میں اسلاف سے سبقت لیجانے اور اپنے اپنے صدر مقامات کو پہلے سے زیادہ آراستہ و پیراستہ کرنے کی کوشش کرتے رہے، طرز تعمیر میں کیا کیا تبدیلیاں کیں لیکن بیجاپور کو چھوڑ کر باقی دکنی شہروں میں جو جو عمارتیں ہیں، وہ اپنے ماحول اور تاریخی اہمیت سے قطع نظر، بجائے خود جہاں تک ہمیں علم ہے حسن صنعت کی کوئی بہت خاص اور گراں بہا یادگار نہیں ہیں ؏

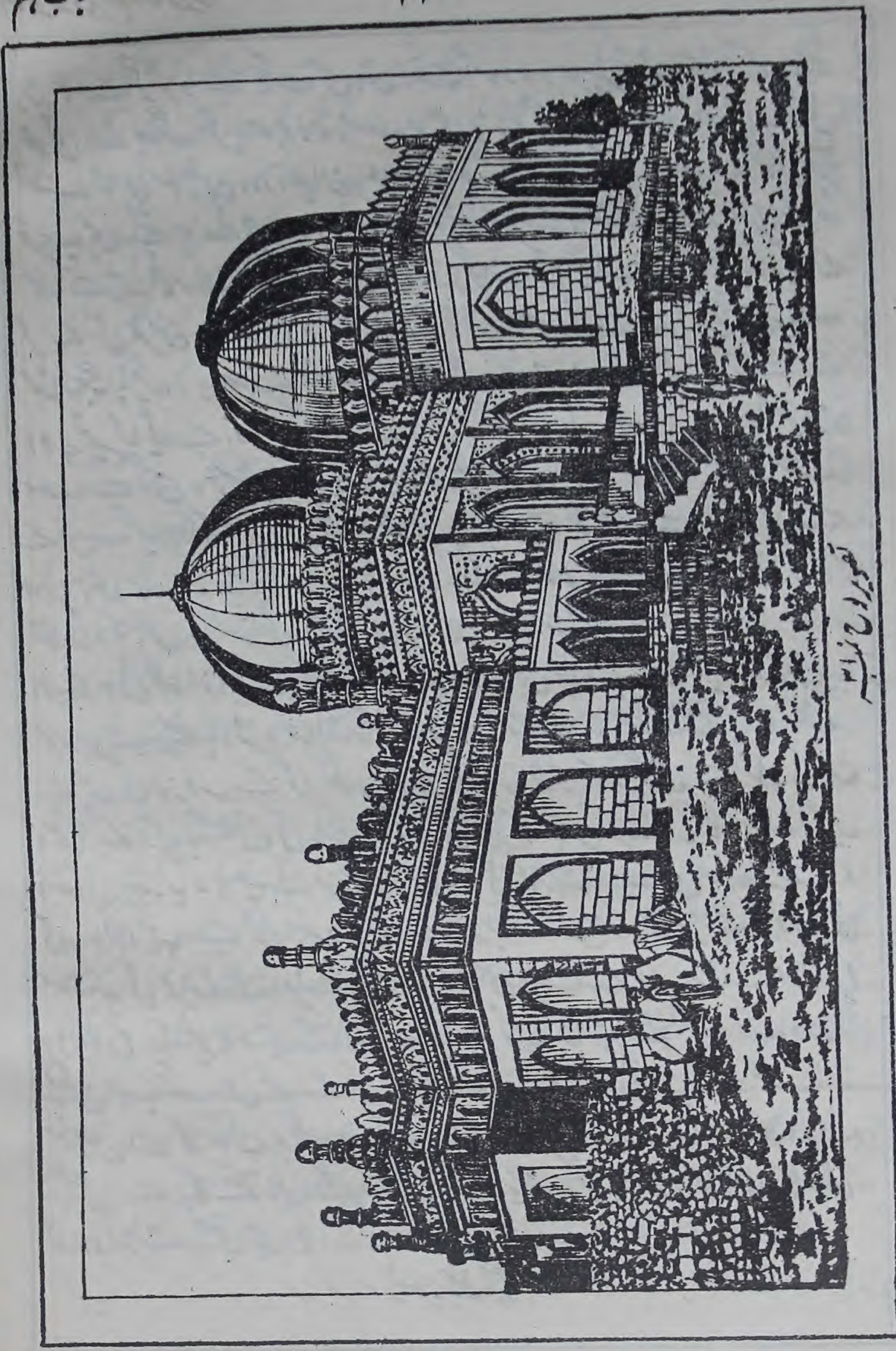
خاندیس کے فاروقی خاندان کا پائے تخت (۱۳۷۰ء سے ۱۵۹۶ء تک) برہانپور رہا اور یہاں بے شبہ وسعت اور عبرت آموزی کے اعتبار سے بعض آثار قدیمہ قابل لحاظ ہیں لیکن ان کی فنی قدر و قیمت کم ہے اور بہت سی خاص کر زمانۂ مابعد کی عمارتیں حسن ذوق سے عاری نظر آتی ہیں۔ نظام شاہی خاندان کا صدر مقام ۱۴۹۰ء سے ۱۶۰۰ء تک احمد نگر رہا مگر اتنی باوقعت مملکت کا اتنے زمانہ تک مستقر حکومت رہنے کے باوجود اس کی عمارتوں میں تعمیری شان و شکوہ اس قدر کم ہے کہ تعجب ہوتا ہے ؏

قطب شاہی خاندان کا پائے تخت ۱۵۱۲ء سے ۱۶۸۷ء تک گولکنڈہ رہا جو شہر حیدرآباد سے ۶ میل شمال مغرب میں واقع ہے اس بادشاہی کی بناء محمود شاہ ثانی بہمنی کے ایک ترکمان یا ایرانی عہدہ دار قلی قطب الملک نے ڈالی جو ترقی کر کے اضلاع تلنگانہ کا صوبہ دار ہوگیا تھا اور ۱۵۱۲ء میں خود مختار بادشاہ بن بیٹھا۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ اس خاندان کا تیسرا بادشاہ ابراہیم

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ روئیداد (دسمبر ۱۸۵۵ء) کے لیئے دو مضمون بیجاپور کی عمارتی عظمت و شان اور سلطان محمد عادل شاہ کے گنبد پر لکھے تھے۔ مسٹر کوزنز کی رہنمائے بیجاپور (۱۹۰۵ء) مفید رسالہ ہے گر چند سال ہوئے بیجاپور کی عمارات کی جو پیمائشیں انھوں نے کی تھیں ان کے نتائج ابھی تک شائع نہیں ہوئے ؏

بڑا عمارت گر گزرا ہے، ملک بھی اس وقت آسودہ و سرسبز تھا۔ اسی کے بیٹے محمد قلی نے بھاگ نگر یا موجودہ آصف جاہی پایۂ تخت حیدر آباد کی بنا ڈالی۔ قطب شاہی سلاطین اور اعیان و امراء کے مقبرے فصیل کے باہر جانب شمال شہر قریب ہی بنے ہوئے ہیں اور وسعت و خوشنمائی کے اعتبار سے بہترین مجموعہ عمارات میں شمار ہونے کے مستحق ہیں اور اگر ان کی ٹھیک ٹھیک کیفیت بیان کرنے کی غرض سے کافی مواد میسر آئے تو ضرور اس قابل ہیں کہ تاریخ میں ایک ممتاز جگہ پائیں۔ یہ بلند مقام پر اور ہر مقبرہ بہت اونچے چوکور چبوترے کے اوپر تعمیر کیا گیا ہے اور ہر ایک کے ساتھ متصل یا ایک چھوٹی مسجد ہے انھیں میں سب سے وسیع و خوشنما مقبروں میں محمد قلی قطب شاہ کا گنبد ہے جو ۱۶۲۵ء کے قریب تعمیر ہوا۔ اس کی بڑی منزل پر نہایت خوبصورت حاشیہ بنایا ہے۔ اور پوری عمارت سے عظمت برستی ہے۔ ایک زمانہ میں اس پر رنگین مینا کا کام تھا اور اس کی صناعی دیکھ کر تھی وینو جس نے ۱۶۶۷ء میں اسے دیکھا اور اس کا حال لکھا، دنگ رہ گیا تھا۔ انہی مقابر میں مناسب اجزا کی ایک لفریب عمارت چھٹے بادشاہ عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۵ء تا ۱۶۷۲ء) کا گنبد ہے جس کی منزلوں کے گرد کنگورے اور کنگنیاں بڑی کاریگری سے تیار کی ہیں اسی کے قریب اس کی ماں حیات بخش بیگم کا مقبرہ ہے جس کا ۱۶۷۱ء میں انتقال ہوا۔ یہ ۶۵ فیٹ مربع اور اسی طرز کی عمارت ہے جیسی عبداللہ قطب شاہ کی۔ ان میں سے کئی مقبروں کی سر سالار جنگ مرحوم نے مرمت کرادی تھی شہر کی نواح میں امرائے دربار کے اور بھی بہت سے مقبرے مختلف اوضاع و اقطاع کے موجود ہیں جن میں سے دو نمونوں کی ہم نے تصویر دے دی ہے۔ لیکن جب تک اس مجموعے کی پوری تصویریں کھینچ کر واقفیت کے ساتھ مفصل ان کا حال نہ لکھا جائے، ہم ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ مشکل سے لگا سکتے ہیں۔ اگرچہ اجمالی طور پر یہ معلوم ہے کہ یہ عمارتیں کافی قدر و منزلت رکھتی ہیں۔

تصویر بر صفحۂ دیگر



تصویر ۲ باب نہم

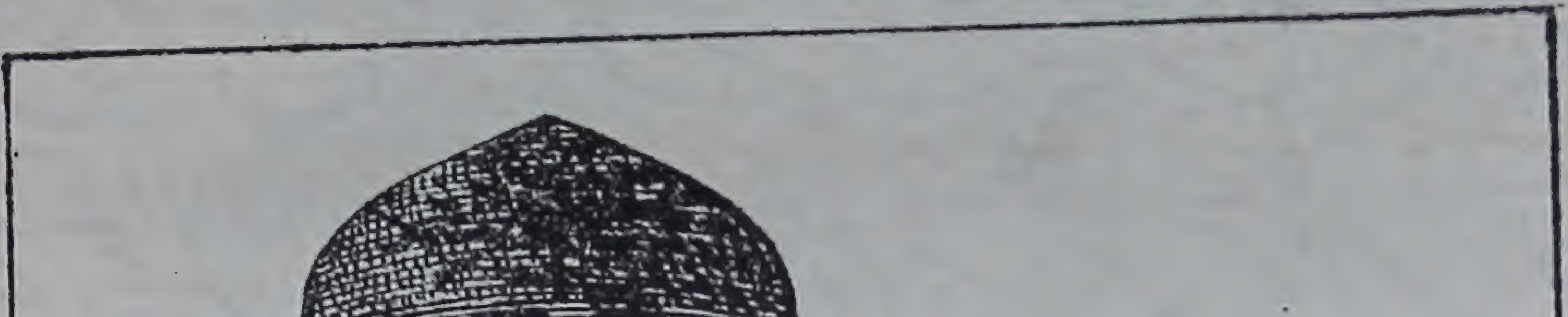
سندھ

ہندوستان میں اسلامی فن کے طرزہائے خود، میں ایک طرز ایسا ہے کہ اگر اس کو تفصیل سے بیان کرنے کے لیے کافی نمونے موجود ہوتے اور وہ اتنے قدیم بھی ہوتے کہ اس کا مغربی ملکوں کے طرز سے تعلق ثابت کیا جاسکتا، تو تاریخی اعتبار سے وہ بیان سب سے بڑھکر دلچسپ ہوتا۔ چونکہ محل وقوع کے لحاظ سے سندھ قریب قریب ہندوستان کے باہر ہے لہٰذا اس صوبے کا ہمیشہ سے ایران اور دریائے سندھ کے پار کے ملکوں سے علاقہ رہا ہے۔ اگر اس کی عمارات کی تاریخ کا ہمیں علم ہوتا تو بہت ممکن ہے کہ ہم اکثر اوضاع و اشکال کے اصلی ماخذوں کا جن کی اب توجیہ ممکن نہیں ہے، پتہ چلا لیتے اور مشرق و مغرب کے طرزوں میں ایسا ربط پیدا کرسکتے جس کے اسباب اس وقت ہمارے علم میں نہیں ہیں۔

صوبۂ سندھ کی عمارتیں تقریباً ہر زمانے سے اینٹ کی بنائی جاتی رہیں کیونکہ پتھر کی بہت کمی ہے۔ بنگالے کی طرح یہاں روئیدگی کی تو وہ آفت نہیں ہے جو مکانوں کو منہدم کردیتی تھی لیکن چونا اچھا نہیں دوسرے زمین کا شورہ ریہ بن کے اینٹ کو خراب کردیتا ہے۔ ان کی جڑیں آسانی سے ہل جاتی ہیں اور دہقانی عوام الناس انھیں بے تکلف نکال کر اپنی جھونپڑیوں میں لگا لیتے ہیں۔

اس وقت تک ہمیں جو کچھ علم ہے وہ بیشتر نواح ٹھٹہ کے ایک سلسلۂ مقابر سے متعلق ہے جو شاہان مغلیہ کے زمانے میں سندھ کے صوبہ داروں یا اُمرا نے بنوائے تھے۔ کم سے کم آج کل تو سب سے قدیم وہی مقبرہ مانا جاتا ہے جسے جام نظام الدین نے ۱۵۰۸ء میں قریب قریب اسی زمانے میں بنوایا جب کہ ڈب گیر کی مسجد تعمیر ہوئی (۱۵۰۹ء) اس کے بعد کی عمارت امیر خلیل خاں

کا مقبرہ ہے جو سنہ ۱۵۷۲ء کے قریب تعمیر ہوا جب کہ اکبر نے خاندان جام کا خاتمہ کر کے سندھ کا سلطنت مغلیہ میں الحاق کر لیا تو اس سے قبل کے شاہی خاندانوں کی مساجد و مقابر کی اب تک پیمائش اور کیفیت بیان نہیں کی گئی بعد کی عمارتوں کا دور سنہ ۱۵۷۲ء سے سنہ ۱۶۴۰ء تک ہے اور یہ سب اسی زمانے یا کچھ قبل کے ایرانی طرز تعمیر سے نمایاں مناسبت رکھتی ہیں۔ ان کی عام صورت بتانے کے لیئے سردست ایک ہی نمونہ پیش کرنا کافی ہوگا۔ یہ امیر خاں کے وزیر یا نواب شرفا خاں



تصویر نمبر ۴۲

کا مقبرہ ہے اور امیر خاں شاہجہاں کے زمانے میں سنہ ۱۶۲۷ء سے سنہ ۱۶۳۲ء تک اور پھر سنہ ۱۶۴۱ء سے سنہ ۱۶۵۰ء تک سندھ کا صوبہ دار رہا۔ مقبرے کا سنہ بنا بظاہر سنہ ۱۶۳۸ء ہے۔ یہ ۳۸ فیٹ ۴ انچ مربع اور رنگین روغنی اینٹ کی عمارت ہے۔

بنیاد اور کرسی پتھر سے بنائی ہے۔ اس قسم کی دوسری عمارتوں اور عموماً ایرانی ابنیہ کی مثل رنگین چوکوں سے اسے آراستہ کیا ہے جو حقیقت میں نہایت خوبصورت اور رنگ کے کمال تناسب کے ساتھ جمائے گئے ہیں[۱]۔ عمارت کی زیب و زینت کے واسطے یہ کچھ بہت پائے دار تدبیر نہیں ہے لیکن جیسا کہ سولھویں صدی کے وسط میں بیت المقدس کے قبۃ الصخرہ میں یا تیرھویں صدی کے آغاز میں تبریز کی مسجد[۲] اور عام طور پر ایرانی عمارتوں میں نظر آتا ہے اِس طرزِ تزئین میں کمال دلفریبی ضرور ہے۔

صوبے کے دوسرے مقبروں کی طرح شرفا خاں کا یہ مقبرہ بھی ہمعصر ایرانی عمارات سے اس قدر مشابہ اور ہندوستان خاص کی ہمعصر عمارات سے اس درجہ متبائن ہے کہ ہم بلا شائبہ شک بنانے والوں کی قومیت معلوم کر سکتے ہیں۔

---

[۱] ٹھٹہ کی جامع مسجد جو ۱۶۴۶ء کے قریب تعمیر ہوئی، اور صوبے کی دوسری مساجد و مقابر کے رنگین چوکوں کی کثرت سے مثالیں کوزنز کے مضمون Port folio of...Sind tiles "۱۹۰۶ء" میں پچاس تصاویر کے ساتھ پیش کی گئی ہیں مگر جامع مسجد ٹھٹہ یا دوسری عمارتوں کے جن کے چوکوں کی یہ تصویریں ہیں، نقشے وغیرہ کچھ نہیں دیئے گئے کہ ان کے مقام وغیرہ کا صحیح پتہ معلوم ہو جاتا۔

[۲] "ہسٹری اوف... آرکی ٹیکچر" جلد دوم ۳۷۔۵

باب دہم

مُغلیہ طرزِ تعمیر

شاہی خاندان۔ مقبرۂ محمد غوث گوالیاری۔ مسجد فتحپور سیکری۔ اکبر کا مقبرہ۔ دہلی کا محل۔ روضۂ ممتاز محل۔ موتی مسجد۔ دہلی کی مسجد۔ مارٹی نیری بیگم کوٹھی اور لکھنؤ کا امام باڑہ۔ سُورت کی انگریزی مقابر۔ جوناگڑھ کا مقبرہ۔

سنین

بابر	سنہ ۱۵۲۶ء	اکبر	سنہ ۱۵۵۶ء
ہمایوں	سنہ ۱۵۳۰ء	جہانگیر	سنہ ۱۶۰۵ء
شیر شاہ	سنہ ۱۵۳۹ء	شاہجہاں	سنہ ۱۶۲۸ء
اسلیم شاہ	سنہ ۱۵۴۵ء	اورنگ زیب (عالمگیر)	سنہ ۱۶۵۸ء
وفات	سنہ ۱۵۵۲ء	بہادر شاہ اول	سنہ ۱۷۰۷ء

نصف صدی پہلے تک اس طرز تعمیر کی جسے مغل بادشاہوں نے رواج دیا، کیفیت لکھنا پورے اسلامی طرز تعمیر کی تاریخ سمجھا جاتا تھا اسی طرز پر تامس رو

برنیر اور بعد کے سب سیّاح خامہ فرسائی کرتے رہے۔ ڈانیل کے نقشوں نے اسے اہلِ یورپ میں روشناس کر دیا اور جب آگرہ اور دہلی عملاً انگریزوں کے قبضے میں آئے تو یہاں کی تصویریں اور نقشے قریب قریب اسی طرح مقبول و مروّج ہو گئے جیسے خود یورپ کے کسی شہر کے نقشے۔ احمد آباد، بیجاپور وغیرہ دوسرے شہروں کی مقابر و مساجد کی عکسی تصاویر بھی کہیں ایک عرصہ میں جا کے لوگوں کو اُن عمارات کی خوبیوں سے اتنا واقف بنا سکیں گی۔ حالانکہ یہ دعویٰ کرنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ دوسرے بادشاہوں کی عمارتیں (جن کا آغاز قطب اور اجمیر کی مسجدوں سے اور اختتام سلاطینِ دکن کی عمارات پر ہوتا ہے جب کہ ان کی بادشاہی کا چراغ گل ہوا) مجموعی طور پر اسی قدر بڑی اور وسیع ہیں جس قدر کہ مغل بادشاہوں کی تمام عمارتیں بلکہ تاریخی اعتبار سے مغلیہ عمارات سے بھی زیادہ دلچسپی کا سامان رکھتی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان مُغلیہ ابنیہ میں ایک ایسا تسلسل اور تاریخی طور پر وہ تکمیل کی شان پائی جاتی ہے جس سے ان کا مطالعہ بہت ہی دلکش ہو گیا ہے دوسرے ان میں بعض عمارتیں اس پائے کی ہیں کہ دنیا کے کسی مُلک کے کسی تعمیری کارنامے سے بھی ان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ بعض اعتبار سے ان میں جو ندرت اور فن کے اعجاز نمایاں ہیں، وہ انھیں سب سے ممتاز اور کچھ ایسا لاثانی بنا دیتے ہیں کہ کسی دوسری عمارت کو ان کے مقابلے میں لانا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ مثلاً، پارتھی نون کی عمارت کا روضۂ ممتاز محل سے کیا مقابلہ کیا جائے؟ عرض و طول یا شان و شکوہ میں دونوں تقریباً برابر ہیں۔ دونوں سنگ مرمر سے بنائی گئی اور اپنے اپنے اغراض کے لیے نہایت موزوں بھی ہیں، مگر اس کے علاوہ اور کونسی بات ان میں مشترک ہے؟ ایک تو سیدھے سادہ خطوط کی عمارت ہے جس کی بیرونی زیب و زینت کا انحصار صرف ستونوں پر ہے۔ مگر دوسری (یعنی تاج) میں ایک بھی ستون نہیں بلکہ اس کی ساری دلکشی نقشے کے حیرت انگیز سپاٹ و بلند اور مختلف اجزاء کے عجیب طریقے پر ترتیب دینے میں پائی جاتی ہے کہ بعض حصے اصل عمارت سے بالکل جدا ہیں۔ یہ سچ ہے کہ پارتھی نون فنونِ لطیفہ

کی زیادہ اعلیٰ قسم کا نمونہ پیش کرتا ہے اور اس کی بُت گری نے اسے اظہار جذبات کی سب سے کامل صناعی کی جو ذہن انسانی نے ایجاد کی ہے یادگار بنادیا ہے۔ لیکن دوسری طرف تاج میں جواہرات سے جو لاجواب نگینہ کاری کی گئی ہے، وہ صنعت کے اعتبار سے اتنی خوبصورت ہے کہ محض عمارت کی حیثیت سے اُسے قریب قریب یونانی شاہکار کے مرتبے تک لے آتی ہے۔[1]

اگرچہ اس طرح ان کی معنوی قدر وقیمت قریب قریب مساوی مان لی جائے لیکن صورت میں وہ ایک دوسرے سے اصولاً اس قدر مختلف ہیں کہ انھیں فنونِ لطیفہ کی ایک ہی شاخ سے منسوب کرنا مشکل ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ فنِ تعمیر اصولاً اور یقیناً ایک رسمی فن ہے اور اگر اس کی ہر جدید وضع سے پوری واقفیت اور ابتدا اور استعمال سے کامل آگہی نہ ہو تو کوئی اجنبی آسانی سے ان حقیقی محاسن کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا جو کہ اکثر عجیب اور نرالی اوضاع کی تہ میں پنہاں ہوتی ہیں۔ لہٰذا فن کے دو بالکل مختلف نمونوں کے مقابلے میں اور بھی دشواری واقع ہوتی ہے۔ بایں ہمہ ان سب دشواریوں سے عہدہ برآ ہونے کے بعد، غالباً یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ مشرقی طرزہائے عمارت میں سب سے زیادہ توجہ اور فائدہ بخش مطالعے کے قابل سلاطینِ مغل ہی کا طرزِ عمارت ہے؛

اس سرگزشت کے ابتدائی مراحل میں شیر شاہ اور اس کے بیٹے سلیم یا اسلام شاہ کے بیچ میں آگھسنے سے قدرے انتشار پیدا ہو گیا کہ یہ ہمایوں کے زمانے میں سلطنت پر ابدی

[1] اپنی "تاریخ قدیم و وسطی فن عمارت" (جلد اول) میں میں نے وہی عددی معیار اختیار کیا ہے جو فرگوسن "ٹروپر سپلز آف بیوٹی ان آرٹ" کے مقدمے میں درج ہے اور اس کے حساب سے اندازہ لگایا ہے کہ پارتھی نون میں ۱۴ فنی ۱۲ ذوقی اور ۲۰ اظہار جذبات کی خوبیاں ہیں اور اس کے محاسن کی مجموعی تعداد ۴۶ ہوتی ہے جو دنیا کی کسی اور عمارت کو حاصل نہیں ہیں۔ اس کے مقابلہ میں روضۂ ممتاز محل میں ۱۴ فنی، ۱۵ ذوقی اور اظہار جذبات کی ۲ خوبیاں میں شمار کرتا ہوں گو اس میں براہ راست کسی پیکر تراشی سے یہ کام نہیں لیا گیا تاہم اس کے اجزا کی عجیب ترتیب میں اس انس و سوگواری کی پر درد شان موجود ہے جس کے اظہار کی غرض سے یہ عمارت بنائی گئی تھی اس حساب سے روضے کے محاسن کی عددی قوت

قابض ہوگئے اور نسلاً افغان اور مولداً ہندی تھے اور اگر اپنے حسب مذاق کام کرنے کا موقع پاتے تو ضرور ہندوستان کے انہی سلاطین کے طرز تعمیر کا تتبع کرتے جو مغلوں کے حملے سے پہلے دہلی و آگرہ میں بہت سی عمارتیں بنا چکے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ تغلق شاہ کے انتقال اور بابر کے پہلے حملے کے درمیان ۷۰ برس کا جو زمانہ گزرا ہے اس کی کوئی ایسی یادگار موجود نہیں ہے کہ ہم ٹھیک ٹھیک اس عہد کے طرز تعمیر سے واقف ہو سکیں لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ سادہ اور مستحکم اور اس پرتجمل صناعی سے بالکل مختلف تھا جو سلاطین مغلیہ نے اختیار کی یا جس سے خود شیر شاہ اور اس کے بیٹے نے بظاہر ہندوستان کے نئے (مغل) فرمانرواؤں کی رقابت کے جوش میں کام لیا۔ خلاصہ یہ کہ شیر شاہ کے طرز تعمیر اور اکبر کے طرز میں اتنا کم فرق رہ گیا ہے کہ ان دونوں کو ایک ہی سمجھ سکتے ہیں جو کمال متانت و نفاست سے شروع ہوا اور آخر کار اس میں تکلف و تزئین کی بہت ہی افراط ہوگئی اگرچہ اس کا حسن پھر بھی بدرجۂ کمال باقی رہا بلکہ بعض اعتبار سے وہ مغلوں کے بعد کے طرز پر بھی (جس میں پاکیزگی کے باوجود شان و شوکت میں کمی آگئی تھی) فائق سمجھا جا سکتا ہے۔

ایک اور خفیف دشواری اور پریشانی یہ بھی لاحق ہوتی ہے کہ بابر و ہمایوں نے جس طرز سے کام لیا اس کی مثالیں ہمارے سامنے موجود نہیں رہیں۔ ہمایوں کا مشہور مقبرہ یقیناً اس کے بیٹے اکبر نے بنوایا۔ بابر کی تدفین کابل میں ہوئی اور اس کے نام کی کوئی عمارت ہندوستان میں نہیں پائی گئی۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اس نے عمارتیں بنوائیں۔ اپنی تزک میں خود تحریر کرتا ہے، کہ "آگرہ میں صرف سنگتراش جو میرے محلات میں روزانہ کام کرتے ہیں، ان کی تعداد ۶۸۰ ہے اور سیکری، بیانہ، دھولپور، گوالیار اور کول سمیت ان سنگ تراشوں کا

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ ۲۰ ہوگی جو اسکے لیئے انتہائی ہے اور اسے پارتھی نون کے اس قدر قریب لے آتی ہے کہ کم سے کم دونوں کا موازنہ کیا جا سکتا ہے ۞

شمار جو روزانہ مصروف بکار رہتے تھے، ۱۴۹۱ ہے[1]۔

آگے چل کے وہ ان میں بعض عمارات، خصوصاً ایک عظیم الشان باؤلی کا ذکر کرتا ہے جو قلعۂ آگرہ میں کھدوائی تھی۔ یہ سنہ ۱۵۲۶ء کا ذکر ہے اور آئندہ وہ پانچ سال تک زندہ رہا جو ان کی تعمیر وتکمیل کے لیے بہت کافی زمانہ ہے آئندہ دس سال کے متعلق جس میں ہمایوں حکمرانی کرتا رہا فرشتہ اور دوسرے ماخذوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس بادشاہ نے بھی اپنے دار السلطنت میں بہت سی شاندار عمارتیں بنوائیں۔ مثلاً سات ایوانوں یا کوشکوں کا ایک محل تھا کہ ہر ایوان سبع سیارہ سے جو ہفتے کے ایک ایک دن پر حکمران ہیں، منسوب تھا۔ ایک مسجد کے بنانے کی بھی روایتیں سنی جاتی ہیں، جو دریائے جمنا کے کنارے اس جگہ کے بالمقابل واقع تھی جہاں اب روضۂ ممتاز محل ہے۔ اسی طرح آگرہ اور دہلی کی بہت سی عمارتوں کے سلسلے میں ہم بار بار اس کا نام سنتے ہیں جس سے یقین ہوتا ہے کہ اس کے پریشان عہدِ حکومت میں جس حد تک مہلت مل سکتی تھی، اس حد تک وہ برابر تعمیر میں مصروف رہا لیکن یہ عمارتیں منہدم ہو ہو گئیں اور اب چار و ناچار مغلوں کی عمارات کی تاریخ ایک افغان خاندان کے بادشاہوں سے شروع کرنی پڑے گی جو ہمایوں کی زندگی کے آخری سولہ سال میں ہندوستان کے تخت پر متمکن رہا۔

بہت ممکن ہے کہ اگر عہد بابر سے سو برس پہلے کی عمارتوں کا مطالعہ کیا جائے جو تیمور نے سمرقند میں بنوائی تھیں (سنہ ۱۳۹۳ء تا سنہ ۱۴۰۴ء) تو سلاطین مغل کے اس طرز تعمیر کی اصل و ابتدا کا بہت کچھ پتہ چل جائے۔ جو انھوں نے ہندوستان میں رائج کیا۔ اور اب کہ یہ شہر روسیوں کے قبضے میں ہے، اہل یورپ کی اس تک رسائی بھی آسان ہو گئی ہے لیکن اس کی عمارات کی تصاویر اور نقشے لیے جانے کے باوجود کسی نے ان کی ایسی

[1] تزک بابری ترجمہ ارسکن صفحہ (۳۳۴)

کیفیت نہیں لکھی کہ علمی اغراض کے لئے ان سے کام لیا جاسکے البتہ ان تصویروں سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہم ان سے کس قسم کے افادے کی توقع کر سکتے ہیں بہت سی باتوں میں وحشی ہونے کے باوجود تیمور عالیشان عمارتیں بنانے کا خالص تورانی جذبہ ضرور رکھتا تھا جس شہر نے اس کا مقابلہ کیا وہاں کے باشندوں کا اس نے عموماً قتل عام تو کیا لیکن معماروں اور کاریگروں کی اس نے ہمیشہ جاں بخشی کردی اور انھیں اپنے صدر مقامات کی تزئین و آرائش کی غرض سے ادھر بھجوادیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ سمرقند عالیشان عمارات سے معمور ہوگیا لیکن جو مصالحہ میسر آیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارتیں ہندوستان کی موجودہ عمارات کی بجائے زیادہ ایران کے طرز سے ملتی تھیں۔ مثلاً وہاں شلغمی وضع کے گنبد ہر جگہ نظر آتے ہیں حالانکہ ہندوستان میں ان دنوں بجز سندھ کے اس وضع کی کوئی مثال نہیں ملتی اور سندھ خود اس معاملہ میں نیم ایرانی صوبہ تھا۔ آرائش کے لئے رنگین چوکے بہت مقبول تھے اور مجموعی طور پر ہندوستان کی بعد کی افغانی عمارات کی ثقاہت کے مقابلے میں یہ طرز بہت ہی پُرتکلف اور شوخ تھا۔

شیر شاہ

(سنہ ۱۵۳۹ تا سنہ ۱۵۴۴ء)

کوئی شبہ نہیں کہ یہ بادشاہ شمالی ہندوستان کے سب سے ممتاز حکمرانوں میں ہے اگرچہ اس کا عہد حکومت صرف پانچ سال کی مدت میں محدود رہا۔ اس قلیل زمانے میں بھی اسے طرح طرح کی پریشانیوں سے سابقہ پڑا جو اس کے غاصبانہ قبضے کا لازمی نتیجہ تھیں۔ بایں ہمہ نظم و نسق کے ہر شعبے پر وہ اپنا نقش چھوڑ گیا۔ نظام مالگزاری، فوجی تنظیم، کوتوالی غرض تمام اصلاحات جن کی اکبر نے کامیابی سے تکمیل کی حقیقت میں انھی شیر شاہ نے جسے مغل

غاصب کے نام سے یاد کرتے تھے شروع اور کسی حد تک مکمل بھی کردی تھیں۔ ہمیں سب سے زیادہ فن تعمیر سے تعلق ہے، سو اس شعبے میں بھی اسی نے وہ راستہ دکھایا جس پر چل کر اس کے جانشین اس رتبہ کمال تک پہنچ گئے۔

جہاں تک مجھے واقفیت ہے شیر شاہ کی سب سے کامل عمارت، دہلی کے پرانے قلعے کی مسجد ہے۔ قلعے کی مرمت ہمایوں نے ۱۵۳۳ء میں کی تھی اور تازہ ترین تحقیقات یہ ہے کہ شیر شاہ نے یہ مسجد ۱۵۴۱ء میں تعمیر کی تھی[1]۔ یہ پانچ در کا ایک وسیع دالان ہے جس کی محرابیں اس شکل کی ہیں جنہیں ہم "ٹیوڈر وضع" سے منسوب کرتے ہیں لیکن ان کے نقشے میں غضب کا خوشنما تنوع اور جو کھٹوں کے اندر، جن کو رنگین سنگ مرمر سے آراستہ کیا ہے بے مثل گلکاری کی ہے۔ اس کا طول ۱۶۸' عرض ۴۴ ½ اور بلندی ۴۴ فٹ ہے۔ چھجوں کے نیچے کے توڑے اس نمونے کے پیشرو ہیں جو قلعہ آگرہ کے بھر بھرے پتھر کی صراحیوں میں خاص طور پر ممتاز ہوا۔ اور گنبد کے نیچے اندرون مسجد کے آویزے بھی بہت نمایاں بنائے ہیں۔ ایک ہی گنبد وسط میں سب سے بڑا ہے جس میں ۱۲ روشندان کھول دیئے ہیں۔ چار دیواری یا مینار کوئی نہیں مگر ان لوازم کے نہ ہونے کے باوجود ہندوستان کی یہ سب سے پسندیدہ مساجد میں داخل ہے۔

قلعہ آگرہ کو جب میں نے دیکھا تو اس کے اندر محل کا ایک حصہ شیر شاہ یا اس کے بیٹے سلیم شاہ کا بنا یا ہوا نظر آیا جو آرائشی صنعت کی ایسی ہی کامل یادگار تھا جیسی کہ ہندوستان کی اس صنف کی عمارت میں اور کہیں مل سکتی ہے چونکہ اس مقام پر یہ سب سے پہلا محل بنا لہٰذا اس کی جگہ سب سے بلندی پر تھی اور ہماری انگریزی حکومت نے اسے دیکھ کر بارکوں کے لئے سب سے موزوں خیال کیا اور اسے تڑوا کر اپنی خشتی عمارت چنوا دی جو معمولاً تو بدصورت ہوتی ہی ہے لیکن یہاں اور بھی زیادہ بھیانک بنی۔ کچھ عرصے بعد اس سے

[1] کننگ ہیم۔ رپورٹس۔ اوّل ۲۲۲ وغیرہ۔ فنشاء "دہلی" صفحہ ۲۲۰ جس سے میں نے تصویر لی ہے۔

مال خانے کا کام لینے لگے اور اب بھی یہ آہک زدہ، زشتی مجسم مکان، سلاطین مغل کے مرمریں محلات کے اوپر استادہ ہے اور ہر دو قوموں کے ذوق میں جو فرق ہے، اس کی نہایت عمدہ شہادت پیش کرتا ہے[لے]؛

بہر حال محل کا جو ٹکڑا سلامت رہ گیا ہے اسے دیکھ کر اور مقامی روایات سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ ترک و افغان سلاطین کی جو ستائش بار بار کی گئی ہے کہ وہ اپنی عمارتیں "عفریتوں کی طرح اٹھاتے اور جوہریوں کی طرح اتمام کو پہنچاتے تھے" وہ کس حد تک بجا ہے۔ کیونکہ چنائی میں جو پتھر لگائے ہیں وہ بہت ہی بڑے بڑے ہیں اور عمارت پر جو کاریگری کی ہے اس میں نازکی اور باریکی کا کمال دکھا دیا ہے مگر اس قسم کی صدہا حسین و جمیل عمارتوں کی طرح یہ بھی ہماری (= انگریزی حکومت) کی بے پناہ بربریت کی سیل فنا میں بہ گیا۔ مساجد کو عموماً اور بعض اوقات مقابر کو بھی ہم نے سلامت رہنے دیا کیونکہ وہ ہماری معاشی ضروریات کے مناسب نہ تھے اور دیسیوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنا بھی قرین مصلحت نہ ہوتا لیکن جب حکمرانوں کو ہم نے معزول کیا اور ان کے ملک و مال پر قبضہ جمایا تو ان کے شاندار محلات و قصور بے کار پڑے رہ گئے جن کی وراثت کا دعویٰ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ پس انہیں قائم رہنے دینے کی بجائے کفایت اور فائدہ اسی میں نظر آیا کہ یا انھیں منہدم کرا دیا جائے اور یا ان سے سکونت گاہ اور باروت خانوں وغیرہ کا کام لیا جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آئندہ نسلوں کے دیکھ کر خوش ہونے کے لئے بہت کم چیزیں ان میں سے سلامت رہ گئی ہیں؛

شیر شاہ کے مقبرے کا ہم اوراق ماسبق میں تذکرہ کر چکے ہیں کیونکہ

لے کین کی آگرے پر کتاب میں جہاں قلعے کی کیفیت بیان کی ہے وہاں اس عمارت کا کوئی سراغ مجھے نہیں ملا، لہٰذا یہ فرض کئے بغیر چارہ نہیں کہ میرے دیکھنے کے بعد اس (حصہ محل) کو بھی کسی کام میں لے آیا گیا ہو گا بجز اس کے کہ ہم اسے وہ عمارت تصور کریں جسے یہ مصنف اکبر کا نوبت خانہ موسوم کرتا ہے۔ مگر اس مقام کی عکسی تصاویر میں کہیں میں نے یہ عمارت نہیں دیکھی ؛

وہ اصولاً پٹھان طرز کی عمارت ہے۔ یہ اس کے وطن (ملک بہار) میں گنگا کے جانب جنوب اور اس عہد کے مغلیہ اثرات سے بہت فاصلے پر بنائی گئی۔ اس کے طرز تعمیر میں وہی خشک سادگی نمایاں ہے جو تغلق اور صحیح معنی میں آخری آزاد افغان بادشاہ۔ بہلول لودھی (سنہ ۱۴۵۱ تا سنہ ۱۴۸۹ء) کے درمیان کے زمانے میں نسل افاغنہ کی تعمیری خصوصیت تھی۔

یہ صاف طور پر معلوم نہیں کہ اس مقبرے کا کتنا حصہ خود اس نے بنایا اور کتنا اس کے بیٹے سلیم شاہ نے، جس نے بے شبہ اس کی تکمیل کی۔ اسی بادشاہ نے جمنا کے ایک ٹاپو پر سلیم گڑھ بنایا جسے شاہجہاں نے اپنی نئی دہلی کے قصر سے ایک پل کے ذریعے ملا لیا تھا مگر یہ یقینی طور پر معلوم نہیں کہ اس قلعے کے اندر بھی کوئی عمارت اس نے بنوائی تھی۔ کم سے کم آج کل تو کوئی قابل ذکر عمارت موجود نہیں ہے۔ بظاہر وہ زیادہ تر اپنے باپ کی ابنیہ ہی کی تعمیر و تکمیل کرتا رہا۔ بہرحال ان باپ بیٹوں نے مل کر جو آثار اپنی یادگار چھوڑے ہیں، ان سب کو اگر جمع کیا جائے اور ان کی باتصویر کیفیت بیان کی جائے تو ہندی مسلمانوں کے طرز ہائے عمارت کی تاریخ میں یہ مجموعہ ایک دلچسپ باب کا اضافہ کر دے گا[1]۔

اکبر

سنہ ۱۵۵۶ تا سنہ ۱۶۰۵ء

اس نامور شخص نے اپنے ۴۹ سال کے طویل عہد حکومت میں جو عمارتیں

---

[1] صراحت کے ساتھ یہ کہنا دشوار ہے کہ قلعہ رہتاس کی شان و شوکت کس قدر اکبر کی رہین منت ہے اور کتنی شیر شاہ کی۔ یہ تحقیق ہے کہ دونوں نے وہاں تعمیر کی اور اس مقام پر پہنچکر آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ انکا کتنا کتنا حصہ ہے۔ کمال افسوس کی بات ہے کہ انگریزوں نے "اس خوبصورت دیوان خانے کو جس کا ڈینیل نے نقشہ بنایا تھا، گھوڑوں کے بچے لینے کے واسطے اب سانڈھ خانہ بنا رکھا ہے"۔ ہیملٹن: "گزیٹیر" عنوان۔ رہتاس گڑھ۔

بنائیں، ان کا حال لکھنے کے لئے ایک پوری جلد درکار ہے اور سو تصویریں بھی ان کی جملہ خصوصیات دکھانے کے لئے مشکل سے کافی ہونگی۔ اگر اکبر اس طرز کے "تتبع" پر قناعت کر لیتا جو ترک و افغان سلاطین ہند نے اختراع کیا اور شیر شاہ کے زمانے میں اس کی تکمیل ہوئی، تو اس کے نتائج کا سراغ آسانی سے لگایا جا سکتا تھا لیکن اکبر کے مزاج کی بڑی خصوصیت وہ مذہبی رواداری تھی جو اس کے جملہ افعال سے ثابت ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کے دل میں اپنی ہندو رعایا کی ایسی ہی سچی محبت و قدر تھی، جیسی اپنے ہم مذہبوں کی۔ اور خواہ طبعی میلان سے خواہ مصلحت کی بناء پر، وہ ہندو فنون کی بھی ایسی ہی سرپرستی کرتا تھا جیسی خالص اسلامی فنون کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تمام آثار میں دو طرزوں کی آمیزش موجود ہے۔ یہ آمیزش اکثر خوشنما مگر خلاف اصول پائی جاتی ہے۔ البتہ امید تھی کہ اگر آدھی صدی اور یہی سلسلہ جاری رہتا تو یہ دو رنگی گھل مل کے ایک جدید مستقل طرز کی صورت اختیار کر لیتی۔ لیکن رواداری کا جذبہ اسی کے ساتھ دفن ہو گیا۔ جہانگیر و شاہجہاں کی عمارتوں میں ہندو پن کا مطلق اثر نہیں پایا جاتا اور اورنگ زیب تو محض یہ خیال سنکر خوفزدہ ہو جاتا کہ اس کے کسی کام میں کفار کے فنون کا دخل جائز رکھا جائے۔

غالباً اکبر کے سب سے ابتدائی کارناموں میں وہ مقبرہ ہے جو اس نے اپنے باپ ہمایوں کی قبر پر تعمیر کرایا۔ ہرچند اس کی تکمیل یقیناً اکبر نے کی لیکن اس کی بنا ہمایوں کی بیوہ ملکہ مریم مکانی (حاجی بیگم) نے رکھی تھی اور ۱۵۶۵ء میں پندرہ لاکھ روپے کے خرچ سے یہ عمارت اتمام کو پہنچی۔ یہ قیاس کہ شروع ہی میں اکبر نے اسے بنایا ہوگا اس واسطے بھی قرین صواب ہے کہ جیسا کہ اس کتاب کے گزشتہ اوراق میں بارہا جتایا جا چکا ہے تاتاری یا مغلیہ اقوام کی ایک بڑی تعمیری خصوصیت مقبرہ سازی کا میلان ہے جو متمدن دنیا کی باقی دو بڑی نسلوں یعنی آریہ اور سامی نسل کے لوگوں سے نمایاں طور پر تاتاریوں کو "متمیز" کرتی ہے۔ اس خصوصیت کا اظہار اس قوت کے ساتھ

اور کہیں نہیں ہوتا جس قدر کہ ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کی آمد کے ابتدائی سنین سے لے کے آج تک ترک، افاغنہ اور مغلوں کے مقبرے آثار قدیمہ کا ایک غیر منقطع اور مکمل سلسلۂ عمارات پیش کرتے ہیں۔

پٹھانوں کے مقبرے اتنے شاندار نہیں۔ بر ایں ہمہ پورا سلسلہ حد سے زیادہ دلچسپ ہے اور ان کی تعداد بھی مسجدوں سے زیادہ ہے۔ ساخت کے اعتبار سے وہ عموماً صناعی کا بہتر نمونہ ہیں اور بیشتر صورتوں میں نہ صرف زیادہ بڑے بلکہ تجمل و آراستگی میں بھی ان عمارتوں سے بڑھ چڑھ کر ہیں جو صرف عبادت کے واسطے بنائی گئی تھیں۔

تاتاری نسل کے بادشاہوں نے شوق مقبرہ سازی کے باعث یہ بھی معمول کر لیا تھا کہ اپنی زندگی ہی میں اپنے مقبرے تعمیر کریں اور جو لوگ بعد مرگ شہرت و شان دکھانے کے خواہش مند ہوں انھیں لامحالہ یہی کرنا پڑتا ہے۔ مگر مغلوں نے یہ عمارتیں بنوانے میں مصری طریقے کی تقلید نہیں کی کہ بڑے بڑے اہرام یا پہاڑ کی چٹانوں کے اندر تاریک و عمیق حجرے بنواتے۔ اس کے برخلاف انھوں نے اپنے مدفن اس شان کے بنوائے کہ زندگی میں تو وہ اور ان کے دوست وہاں سیر و تفریح میں وقت گزار سکیں اور صرف اس وقت جب کہ عیش و تفریح کا امکان نہ رہے، وہ مقام ان کے فانی اجسام کا پر عبرت مسکن بن جائے۔

ان عمارتوں کے تیار کرنے کی عام صورت یہ ہے کہ بادشاہ یا امیر جو اپنے واسطے مقبرہ بنانا چاہتا، وہ شہر پناہ کے باہر عام طور پر چار دیواری کھینچ کر (جس میں ایک یا دو شاندار دروازے ہوتے) ایک باغ نصب کراتا اور اس کے وسط میں مربع یا مثمن قبہ دار عمارت ہوتی زیادہ شان شوکت کی عمارت ہوئی تو چاروں گوشوں یا پہلوؤں میں بھی برجیاں اور لداؤ دے کے کمرے بنا دیئے جاتے اور باقی چار جانب آمد رفت کے واسطے کھلے رہنے دیتے تھے۔ یہ عمارت عام طور سے اونچے اونچے چبوتروں پر بنائی جاتی اور ہر ضلع کے وسط سے چوڑی چوڑی روشیں نکالی جاتیں۔ جن کے درمیان عموماً سنگ مرمر کی نہریں بنا دیتے اور ان کی زیب و زینت

فواروں سے بڑھا دی جاتی۔ ایک جانب مسجد کا ہونا بھی مقبرے کا لازمی جزو تھا۔ خالی گوشوں میں سرو یا دوسرے سدا بہار اور میوہ دار درخت نصب کرکے اسی مروجہ نمونے کا ایک خوشنما باغ تیار کر دیتے جیسے کہ ممالک مشرق کی ایک خصوصیت ہے۔ بانی کی زندگی میں وسطی عمارت بارہ دری کہلاتی اور اس کے اور احباب کے لئے گرمی گزارنے یا تفریح وتفنن کا مقام ہوتی اور جب اس کا انتقال ہوتا تو اس کی نوعیت بدل جاتی کہ بانی کا جنازہ بڑے گنبد کے نیچے دفن کر دیتے بعض اوقات اس کی محبوب بیوی کی قبر پہلو میں ہوتی لیکن عام طور پر بیوی بچوں کو پہلو کے گنبدوں میں دفن کر دیتے تھے۔ مدفن بن جانے کے بعد پھر عیش وتفریح کا اس عمارت سے کام نہ لیا جاتا تھا۔ اس کی نگرانی کسی ملا یا فقیر کے حوالے کر دی جاتی جو باغ کے ثمرے اور مرحوم کے عزیز واقربا سے جو فاتحہ پڑھنے آتے، خیر خیرات پر اپنی گذر اوقات کرتے تھے۔ چہل اور قہقہوں کی بجائے مقبروں میں کامل خموشی اور سناٹے کا عالم ہو جاتا اور گرد وپیش کی اشیا کا دلکش منظر سکوت وسکون کے ساتھ مل کر عجیب کیفیت پیدا کر دیتا جو اس مقام کے لئے جتنی مناسب اور پُر اثر ہے اسی قدر لطیف وخوش آیند بھی ہے۔

یوں تو اقطاع ہندوستان میں ایسے مقبرے بے شمار اور اکثر کی چار دیواری کے آثار بھی موجود ہیں لیکن غالباً ایسا مقبرہ صرف ایک روضۂ ممتاز محل ہے جس کے باغ کا حسن کسی حد تک اپنی اصلی اور ابتدائی حالت میں محفوظ رہ گیا ہے اور یہی سبب ہے کہ اس شہرۂ آفاق مقبرے کی چار دیواری میں جمال فطرت اور حسن صنعت نے کمال خوبی سے مل کر حسن لطیف کا وہ کامل نمونہ بہم پہنچایا ہے جس کی نظیر شاید ساری دنیا میں کہیں نہ ملے گی۔

ہمایوں پہلا مغل بادشاہ ہے جو ہندوستان میں دفن ہوا۔ پرانی دہلی کے کھنڈروں میں اس کا مقبرہ ابھی تک خاصی طرح صحیح سالم حالت میں ہے

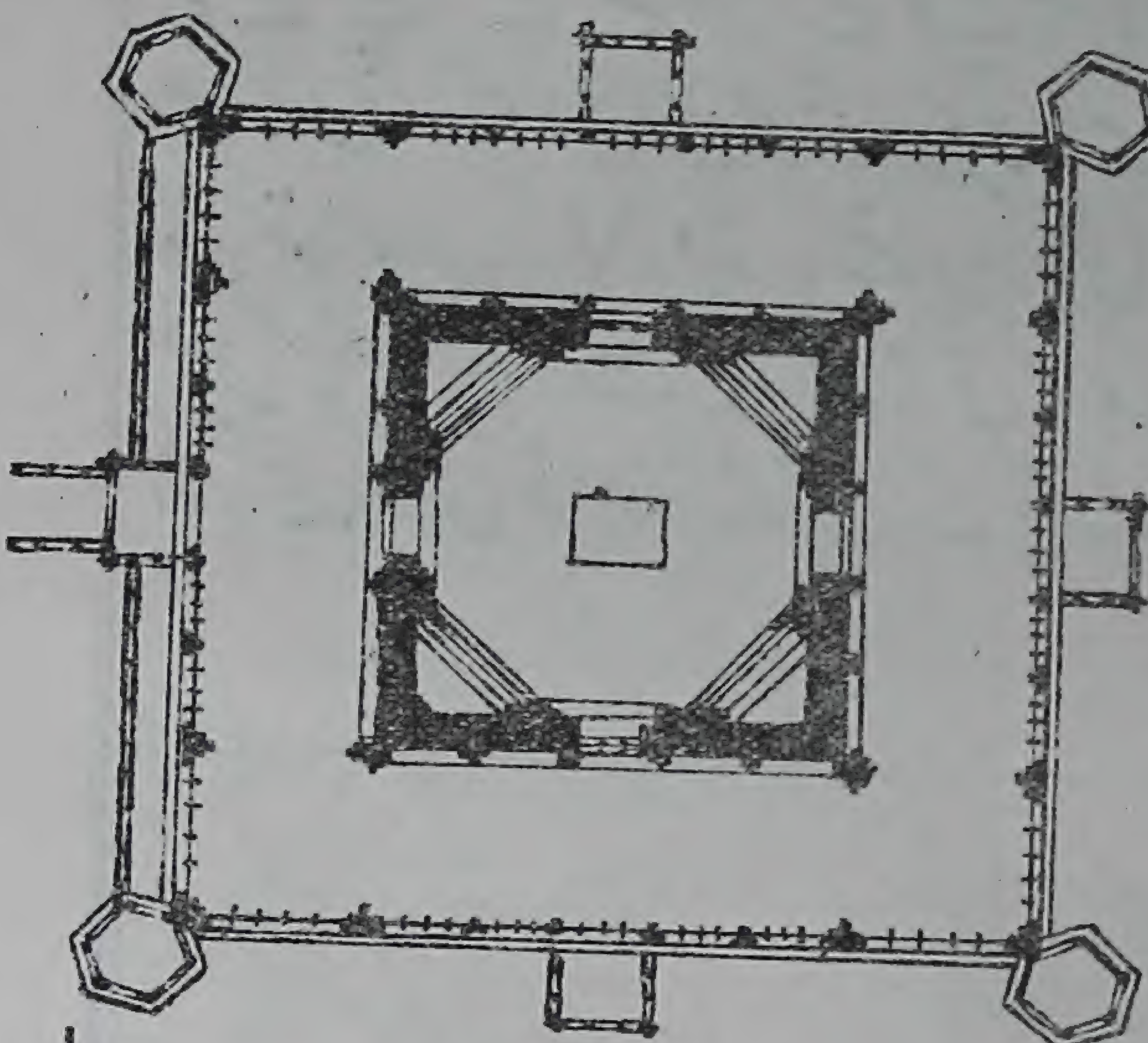
بلکہ ان آثار قدیمہ میں سب سے زیادہ قابلِ دید اور بڑی عمارت یہی ہے۔ یہ نہایت وسیع ۲۲ فیٹ بلند اور مربع چبوترے پر بنی ہے جس کی خوشنما محرابوں کے پائے سنگ مرمر کی پچی کاری سے اور بھی خوبصورت ہوگئے ہیں۔ خود مقبرہ نیچے سے مثمن ایوان ہے جس کا عمود ۴۷ فیٹ ہے اور اوپر سنگ مرمر کا گنبد بہت ہی دلکش ڈھلاؤ دے کے بنایا ہے۔ مثمن کے چار ضلعوں پر دروازے اور باقی چار کے ساتھ چھوٹے چھوٹے مثمن کمرے ۲۳ فیٹ عریض بنا دیئے ہیں۔ یہ ہر رخ کی وسطی محراب کے آگے کو بڑھے ہوئے ہیں اور ان کو جا بہ جا سنگ مرمر لگا کے خوب ممتاز کر دیا گیا ہے۔ ان گوشوں کے حجروں میں ملکہ مریم مکانی (حاجی بیگم) اور شاہی خاندان کے کوئی نو اور افراد کی قبریں ہیں۔ یہ سب گوشے اور بڑا وسطی کمرہ مل کر پوری عمارت قریب قریب مربع بن گئی ہے جس کا ہر ضلع ۱۵۵ فیٹ اور زاویئے قدرے کٹے ہوئے ہیں۔ حقیقت میں اسی مقبرے کے نقشے پر بعد میں روضۂ ممتاز محل تیار ہوا لیکن اس کی گہ زیادہ رہی گئی۔ دوسرے اس میں جو عجیب حسن تناسب پیدا ہو گیا ہے اس مقبرے میں کہاں؟ بلکہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہی نقشے کی حد سے زیادہ سادگی ہے اسی لئے اکبر نے جو دوسری عمارتیں بنوائیں یہ اُن سب سے اس قدر کم ملتا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا نقشہ بھی اکبر نے بنوایا ہوگا۔ قدیم ترک و افغان سلاطین کے مقبروں کی خوشنما رفعت اور اولو العزمی بھی اس میں نہیں اور حقیقت میں اپنے زمانہ بنا سے ایک صدی بعد کی عمارت معلوم ہوتا ہے ان سب باتوں کے باوجود یہ نہایت شاندار مقبرہ ہے اور کسی دوسرے ملک میں ہوتا تو ضرور وہاں کے عجائبات میں شمار ہوتا۔

لیکن اس عہد کے طرز تعمیر بتانے کی غرض سے بہتر ہوگا کہ ہم

ﻠﮧ گنبد کے گرد اوپر کی منزل میں جو حجرے اور برجیاں ڈھولنے کی مضبوطی کے واسطے بنائی ہیں۔ ان میں کسی وقت ایک مشہور مدرسہ تھا جو مدت سے اُجڑ چکا ہے۔

محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ گوالیاری کے مقبرے کی کیفیت لکھیں جو عہد اکبری کی ابتدا میں تعمیر ہوا اور اسی زمانے کے مقابر کا بدرجۂ غایت دلچسپ نمونہ ہے۔

نقشہ مقبرہ شاہ محمد غوث گوالیاری



تصویر ۲۱ء

اس مربع عمارت کا ہر ضلع سو فیٹ بنتا ہے بشرطیکہ گوشوں کے مسدس برجوں کو چھوڑ دیا جائے۔ اصل قبر کا حجرہ ۴۳ فیٹ مربع ہے جس کے زاویے کاٹ کر وہاں نوکدار محرابیں اس طرح قائم کی ہیں کہ مثمن حجرہ بن گیا ہے۔ ان محرابوں پر گنبد تیار کیا ہے اور حجرے کے گرد غلام گردش بنائی ہے۔ جو پایوں کے درمیان ۲۰ فیٹ چوڑی اور ہر طرف سے ایک جالی سے گھری ہوئی ہے جس میں پتھر تراش کر بے مثل نقش و نگار بنائے ہیں اور ہر رو کار پر آگے کو نکلا ہوا گمانچہ دار دروازہ رکھا ہے۔[۲]

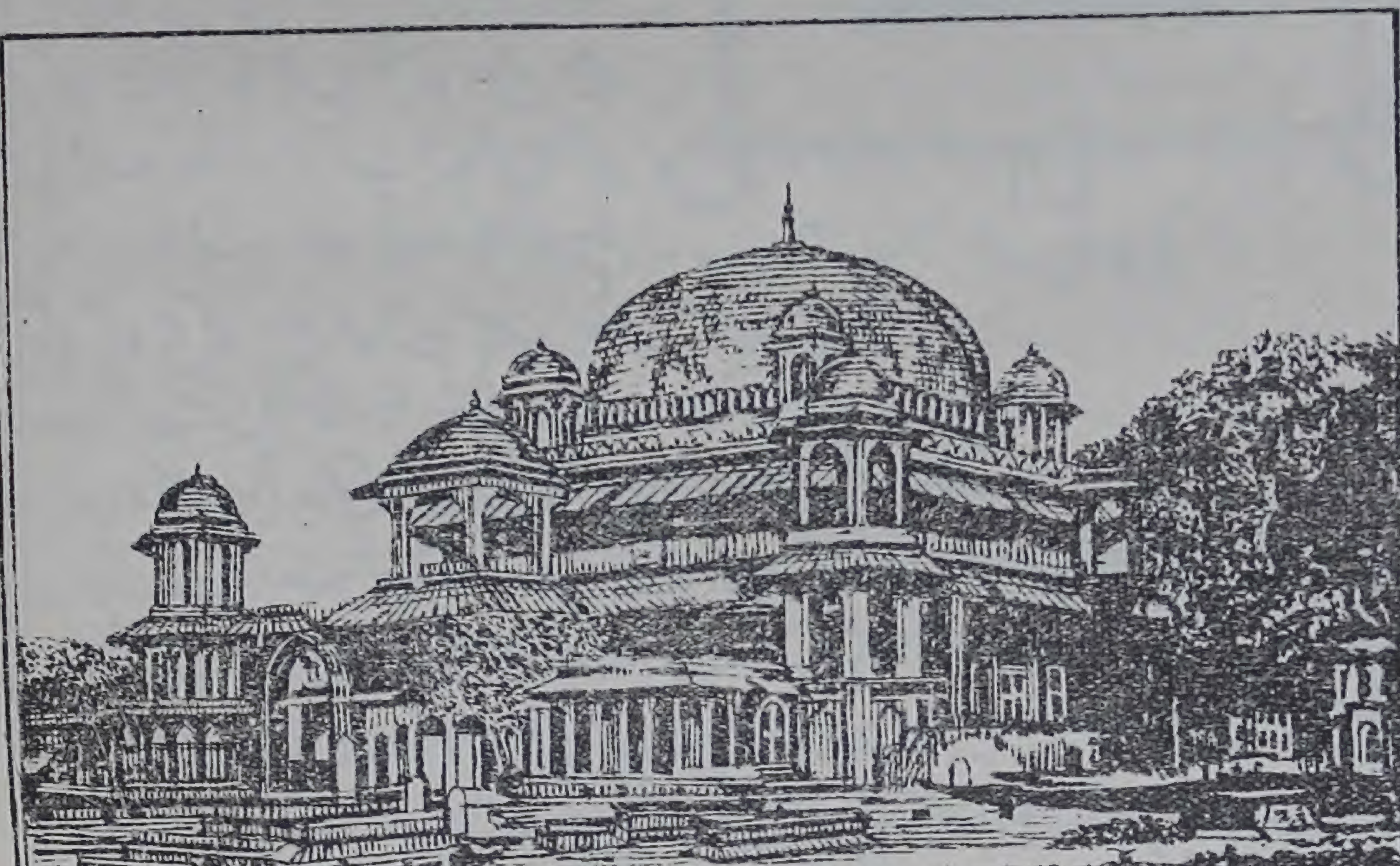
یہ عمارت شیر شاہ کے مقبرۂ سہسرام سے کئی اعتبار سے مشابہت رکھتی ہے لیکن ان دونوں کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قلیل مدت ہی کے فرق میں جو ان دونوں کی تعمیر کے درمیان گزرا، مقبرہ سازی میں کافی ترقی ہوئی۔ مربع کے مقابلے میں مثمن شکل کی عمارت میں ایک طبعی کمزوری ایسی ہے کہ افاغنہ بھی پوری طرح اس کی تلافی نہیں کر سکے دوسرے باہر کے رخ جالی کا

---

[۱] شاہ محمد غوث العالم گوالیاری قدس سرہ کا انتقال ۱۵۶۲ء میں ہوا (آئین اکبری۔ ترجمہ بلوخ مین۔ جلد اول، ۴۵۷)

[۲] صفحہ ماقبل کا نقشہ جنرل کننگ ہیم کی رپورٹس (دوم لوح ۹۱) سے لیا گیا ہے مگر اس نے مربع دروازوں کو چھوڑ دیا تھا جنہیں تصاویر کی بناء پر میں نے بڑھا دیا ہے۔

جو کام کیا گیا ہے وہ سہسرام والے مقبرے کے کھلے ہوئے دالانوں کی نسبت کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ اِس فرق کا کسی حد تک یہ سبب بھی ہوگا کہ گوالیار ایسا شہر تھا جہاں آرائشی قسم کے عمارتی کام ایک مدّت سے ہوتے چلے آتے تھے اس لئے عجب نہیں کہ وہاں بہت اعلیٰ درجے کے معماروں اور کاریگروں کا گروہ ہمیشہ سے موجود ہو۔ بخلافیکہ سہسرام ایک دور دست قریہ تھا جہاں یہ فوائد میسّر نہ تھے۔ بہرحال، جو کچھ بھی سبب سمجھئے اِس میں شک نہیں کہ اتنی سی مدت میں ایسی ترقی کا ہو جانا انہی اکبری ذہانت کے طاقت افزا آثار میں داخل تھا جو آگے چل کے بڑے بڑے اعجاز دکھانے والی تھی۔



تصویر ۴۲۲

عہد اکبری کی ایک بہت ہی ممتاز اور خاص یادگار قلعہ آگرہ کا پرانا یا لال محل ہے جس کا یہ نام اس لئے مشہور ہوا کہ وہ سنگ سرخ یا بھُر بھُرے پتھر سے بنایا گیا ہے جو افسوس ہے اچھی قسم کا نہ تھا اور اسی لئے اس کا بہت سا آرائشی کام فرسودہ ہو کے اڑ گیا ہے۔ اگرچہ قرینۂ غالب یہی ہے کہ اسے اکبر نے بنوایا تھا لیکن عرف عام میں اسے جہانگیری محل بھی کہتے ہیں اور یہ انگوری باغ اور خاص محل کے جنوب کی طرف واقع ہے۔ یہ خاص محل وہ عمارت ہے جس کا بیشتر حصہ غالباً شاہجہاں کا کارنامہ تھا۔ القصہ یہ لال محل ایک چوکور عمارت ہے جس کا عرض ۲۴۹ اور طول ۲۶۰ فیٹ اور بیچ میں اندر کا صحن ۷۱ × ۷۲ فیٹ ہے۔ صحن کے دونوں طرف ایک دوسرے کے مقابل دو دو ایوان بنے ہوئے ہیں جن میں سب سے بڑا ۶۲ × ۳۷ فیٹ کا ہے۔ اس کی چھت چپٹی اور سلوں سے پاٹ دی ہے جس کے دلوں کے نیچے جو شہتیریاں لگائی ہیں وہ بالکل ہندوانی وضع کی اور بہت کچھ ویسی ہیں جیسی گوالیار کے ورکر ما شاہی یا مان سنگھ کے محلوں میں استعمال کی گئی ہیں حقیقت میں صحن کے گرد ساری عمارت کا طرز ہندوانی ہے کہیں محرابوں سے کام نہیں لیا بلکہ عمودی ساخت اختیار کی گئی ہے یہ چپٹی سطح پر ہر جگہ سنگ تراشی کی ہے اور یہ طرز آرائش خاص اکبری ہے جو دوسروں کی عمارتوں میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ سارے محل میں محرابوں اور کمانوں سے اس قدر کم کام لیا ہے اور ہندی وضاع اور ہندوانی طرز تعمیر اسقدر نمایاں ہے کہ یہ محل گوالیار یا چتوڑ میں ذرا بھی بے جوڑ نہ معلوم ہوتا اگرچہ عمارت میں جدت اور قوت کا وہ نقش برابر موجود ہے جو اکبر اور صرف اکبر اپنی ہر یادگار پر منقش کر دینا جانتا تھا۔[۱]

لیکن بنّا کی حیثیت سے اکبر کا رتبہ جانچنا ہو تو آگرے سے ۲۲½ میل جنوب مغرب میں فتحپور سیکری جانا چاہئے جو آخر تک اس کے عہد

[۱] اس محل کا ایک خاکہ جنرل کننگ ہیم کی رپورٹس جلد چہارم لوح ۱۳ میں موجود ہے ۱۲

بادشاہی کا سب سے مطبوع مقام سکونت رہا۔ بظاہر اس جگہ کو سب سے پہلے اسی نے آباد کیا اور یہاں عمارت بنانے والا آخری بادشاہ بھی وہی تھا کہ جہاں تک معلوم ہے اس کے اخلاف کی بنائی ہوئی کوئی عمارت وہاں نہیں پائی گئی ؎

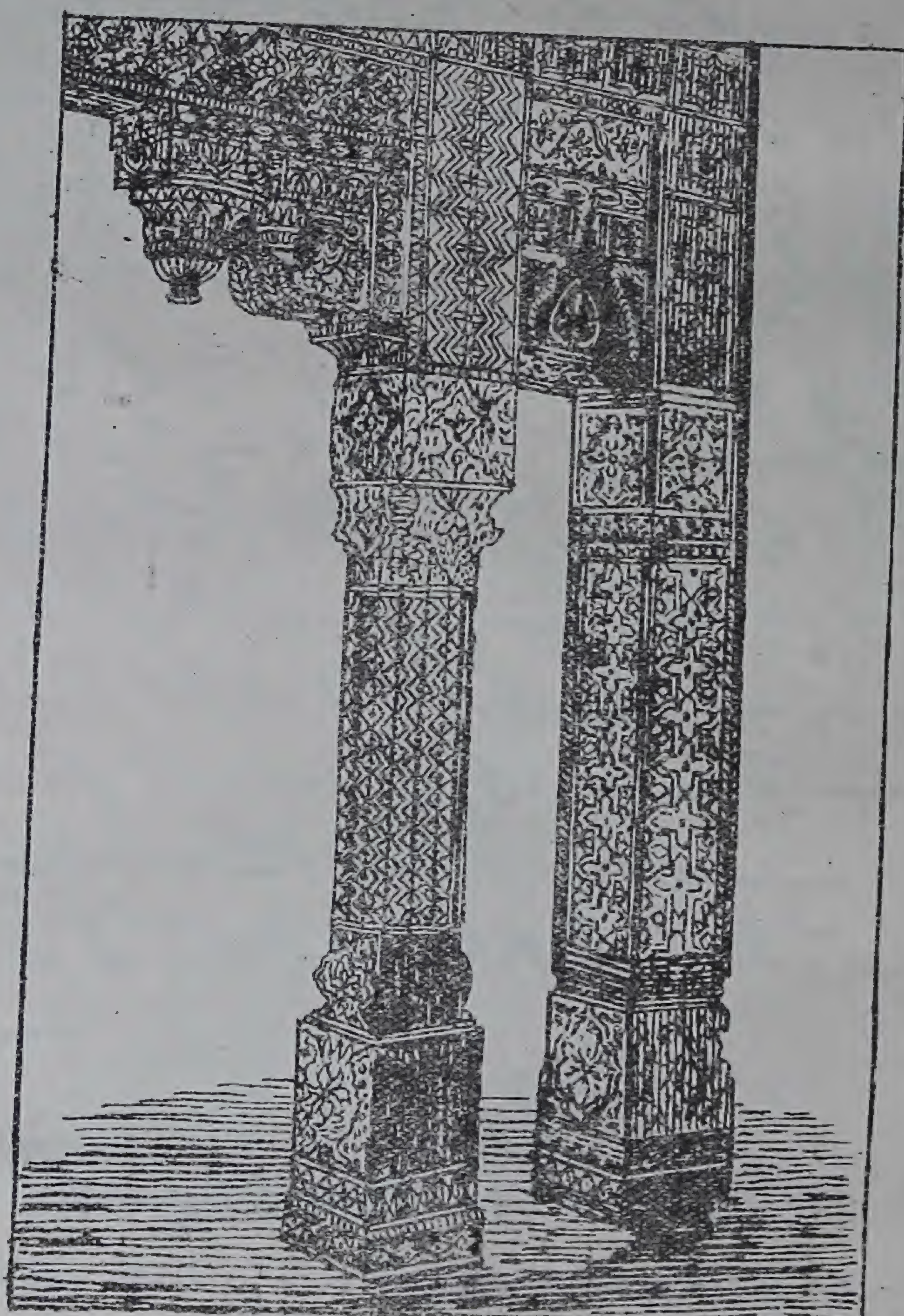
معلوم ہوتا ہے یہاں اپنا سلسلۂ تعمیر شروع کرتے وقت کوئی خاص نقشہ یا منصوبہ اکبر کے پیش نظر نہ تھا۔ ظاہراً ابتدائی عمارت محل خاص کی تھی جو مسلسل ۲۷۰×۳۹۰ فیٹ تک چلا گیا ہے اور اس حساب سے آگرے کے لال محل سے زیادہ وسیع ہے۔ مگر اس میں دو بڑے بڑے صحن ہیں اور اس کے گرد کے مکانات بھی آراستگی اور تنوع کے اعتبار سے ادنیٰ درجے کے ہیں لیکن ان کی کافی سے زیادہ تلافی ان کوشکوں اور چار دیواریوں سے ہو گئی ہے جن کا وہ وقتاً فوقتاً اضافہ کرتا رہا۔ انہی میں ایک تو وہ چوکور عمارت ہے جسے دیوان خاص کہتے ہیں اور جس میں بہت بڑی گلدستہ نما دیوار گیری دے کے ایک بلند تخت بنایا ہے اور اس کے نیچے کے ستون پر کمال تکلف سے نقاشی کی ہے۔[۱] ایک اور مکان جو دفتر خانہ کہلاتا ہے رواق نما بہت کچھ اسی طرز پر بنایا ہے جیسا الہ آباد میں ہے اور اس کا ذکر آگے آئیگا۔ ایک پانچ منزل کی حویلی ہے جس کے تمام ستون نقش و نگار سے مملو ہیں اور جس کے لمبے دالان اور دیواریں ایک کو دوسرے سے ملاتی ہیں۔ پھر ان سب سے بڑھکر خوبصورت اور اس کے خاص طرز کی سب سے ممتاز یادگار تین چھوٹی چھوٹی حویلیاں ہیں جو کہا جاتا ہے کہ اس کی تین محبوب بیگموں کی خوشی اور سکونت کے لئے تعمیر کی گئی تھیں اور اسی لئے ایک بیربل کی بیٹی کا محل کہلاتی ہے[۲] جس میں جہانگیر کی ماں ملکہ مریم زمانی کا مکان بھی (جس پر تمام سونے کا پانی پھرا ہوا تھا اور وہ اسی لئے سنہیلا محل موسوم تھا) شامل کر لیا گیا۔ ایک حویلی اکبر کی پہلی بیوی اور چچا ہندال مرزا کی بیٹی سلطانہ رقیہ بیگم کا مکان تھا جسے رومی یا ترکی سلطانہ کا محل کہتے ہیں۔ اور مقامی رہبر غلطی سے اسے جودھ بائی[۳]

۱؎ اس تخت کا ڈھلا ہوا نمونہ ساؤتھ کینسنگٹن میوزیم میں موجود ہے ؎

۲؎ بیربل بادشاہ کے دربار کا بھاٹ اور ظریف مصاحب تھا اس کی بیٹی کا کوئی تذکرہ تاریخوں میں نہیں ملتا اور عام طور پر یہ مکان بھی صرف "بیربل کا محل" کہلاتا ہے ؎

۳؎ جودھ بائی جودھپور کے راجہ اودے سنگھ کی بیٹی اور جہانگیر کی بیوی تھی ؎

کا محل بتاتے ہیں یہ تینوں چھوٹی چھوٹی حویلیاں ہیں لیکن نقشے کے اعتبار سے اتنی عجیب و نگار ہیں چیز کا تصور بھی محال ہے اور پتھر پر اتنا نادر کام اور نقش و نگار اس کثرت سے کسی دوسری عمارت میں نہیں مل سکتے طرفہ تر یہ کہ کسی جگہ یہ کثرت نہ حد سے بڑھنے پائی ہے نہ اس کی نفاست اور حسن مذاق پر حرف گیری ہو سکتی ہے جس حویلی کا ہم نے آخر میں ذکر کیا، ذیل میں اس کے دو ستونوں کے ڈھلے ہوئے نمونے کی تصویر ہے۔ یہ قالبی نمونے کننگ ٹن وغیرہ مقامات کے عجائب خانوں میں موجود ہیں۔ خود یہ حویلی تینوں حویلیوں میں غالباً سب سے



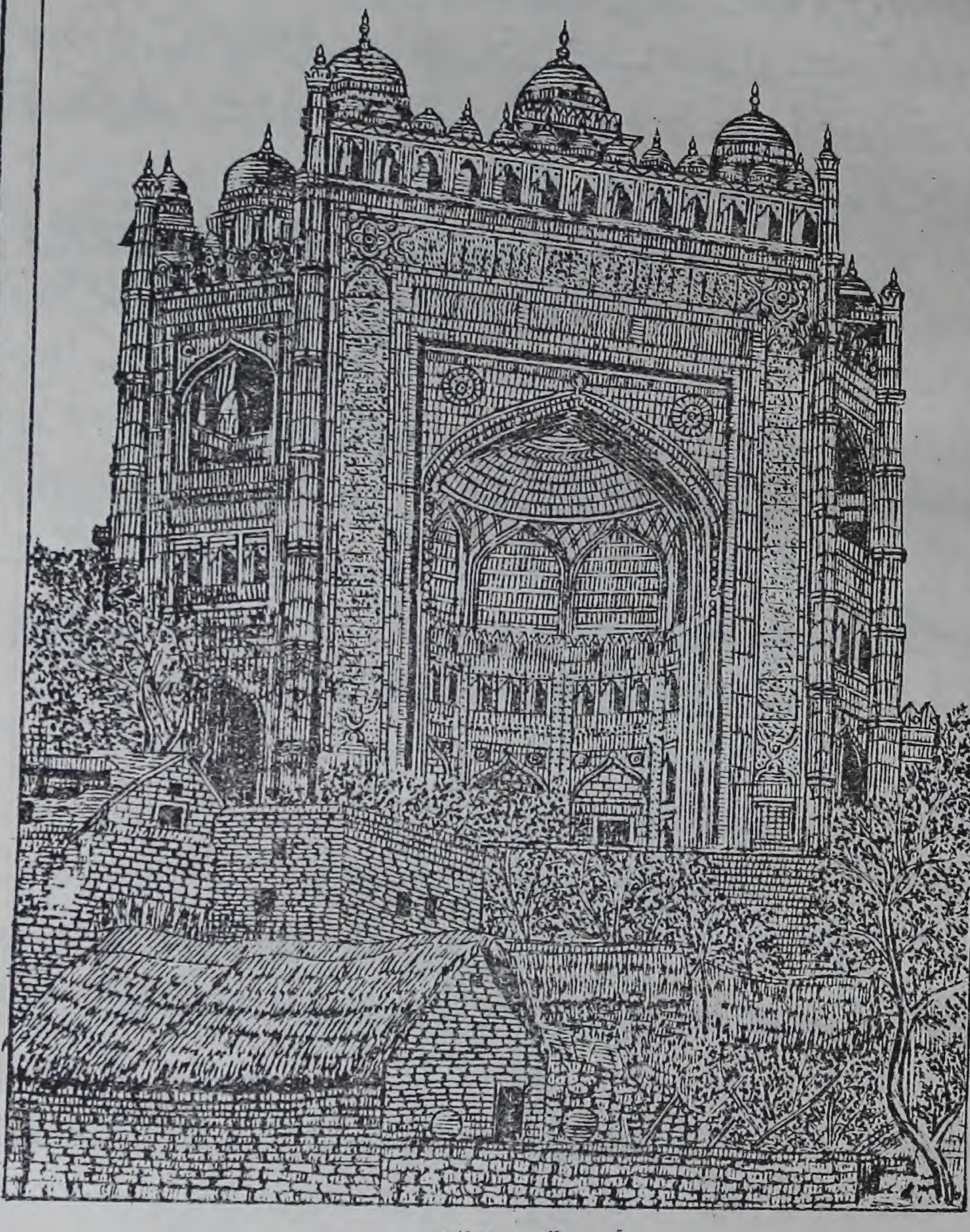
تصویر ۱۲۳

زیادہ منقش و مزین ہے مگر اجمالی طور پر ان دو کو حسن ذوق کا بہتر نمونہ قرار دینا چاہیئے ؂

لیکن فتحپور سیکری کی اصل شان و عظمت اس کی مسجد سے ہے اور ہندوستان میں کوئی دوسری مسجد مشکل سے اس پر فوقیت رکھتی ہے۔ یہ آثار ثمیت شرقاً غرباً ۵۴۴ فیٹ اور شمالاً جنوباً ۴۷۴ فیٹ ہے لیکن اصل مسجد کی عمارت کا طول ۲۸۸ اور عرض ۶۶ فیٹ ہے اور اس پر تین گنبد بنے ہوئے ہیں۔ صحن کا رقبہ ۳۵۹ فیٹ ۱ × ۴۳۸ فیٹ ۹ ہے اور اس کے اندر دو مقبرے ہیں۔ ایک شیخ سلیم چشتی رح کا جو تمام و کمال سنگ مرمر کی عمارت ہے، اور جس کے روشندان اور جالی میں بے مثل اشکال ہندسی تراشی ہیں۔ واضح رہے کہ پتھر پر دار پار کاٹے بغیر اس قسم کی نقاشی بعد کی ایجاد ہے۔ مقبرے میں سنگ مرمر کا ایک چھجا بھی ہے جس کے نیچے نہایت پر تکلف ساخت کی دیوار گیریاں لگائی ہیں۔ بلکہ تکلف حد سے بڑھ گیا ہے اور ساری عمارت میں یہی چیز ہے جو بد مذاقی کے قریب تک پہنچ گئی ہے ؂ دوسرا مقبرہ اسلام خاں کا ہے جو نقاہت اور حسن ذوق کے اعتبار سے پہلے سے بڑھ چڑھ کر ہے لیکن گرد و پیش سے بالکل دب گیا ہے[۵۱] مگر مسجد کا جنوبی یا بلند دروازہ ان عمارتوں پر بھی فوقیت رکھتا ہے[۵۲] یہ پوری عمارت ۱۳۰ فیٹ طویل اور ۸۸ فیٹ عریض اور اسی کے مناسب بلند ہے۔ اس کی ۱۵۷۵ء میں تکمیل ہوئی۔ اسے اونچی کرسی دے کے بنایا ہے اور نیچے سے کھڑے ہو کے دیکھئے تو ایسا عالیشان اور خوبصورت دروازہ ہندوستان کی کسی مسجد بلکہ شاید دنیا بھر میں کہیں نظر نہیں آتا۔ دوسرے ہر زمانے کے

نقشہ بر صفحہ دیگر

[۵۱] شیخ اسلام خاں، شیخ سلیم چشتی رح کے پوتے اور ابوالفضل کے بہنوئی تھے ۱۶۰۸ء میں بنگالے کے صوبہ دار مقرر ہوئے اور ۱۶۱۳ء میں انتقال کیا ؂ [۵۲] مشرقی سمت کی ڈیوڑھی بادشاہی دروازہ کہلاتی ہے۔ ہر چند یہ مسجد کے بالمقابل ہے لیکن بلند دروازے کی نسبت بہت چھوٹی ہے ؂



تصویر ۴۲۵

معمار جس مسئلے کے حل کرنے پر اپنی ذہانت صرف کرتے رہے، اور اس میں زیادہ تر کامیابی پائی تو اسلامی معماروں نے پائی، اس عقدے کے حل کر لینے کی سب سے بہتر مثال میں اس دروازے کو پیش کیا جاسکتا ہے ؛

واضح رہے کہ کسی بڑی عمارت میں اسی کے مناسب عرض و ارتفاع کا دروازہ تیار کرنا ہمیشہ سے ایک دقت طلب معاملہ رہا ہے۔ آدمی کا قد ۶ فیٹ سے زیادہ نہیں ہوتا لہذا ایسے دروازے جو ہاتھیوں کے لئے موزوں ہوں، اسے مناسب نہیں معلوم ہوتے۔ بایں ہمہ یونانیوں کو کبھی ہمت نہ ہوئی کہ اپنے بڑے بڑے دروازوں کے پیمانے میں کمی کریں۔ البتہ وہ قریب قریب ہمیشہ صرف نیچے کا حصّہ کھلا چھوڑ دیتے اور اوپر کا نیچے بناکے دروازے میں ایسی شان پیدا کر دیتے تھے جو ان کے عرض و ارتفاع سے بھی پیدا نہ ہوتی تھی ؛ غوطی معماروں نے کوشش کی کہ اپنے بڑے دروازوں کو اوپر سے خوب جھکاوُ دے کے بنائیں اور اعلیٰ درجے کی نقاشی اور تصاویر سے انھیں مزین کریں جس سے اصل دروازے کا پیمانہ بڑا کئے بغیر وہ حسن و شوکت پیدا ہوسکے جو ان کی بڑی بڑی عمارتوں کے شایان شان ہو۔ بایں ہمہ اس مشکل سے پوری طرح عہدہ برآ ہونا اسلامی معماروں کے حصے میں آیا جنھوں نے ایک نیم گنبد بناکے عقبی رخ میں ایک یا تین یا پانچ پانچ آمد و رفت کے راستے چھوڑنے شروع کئے جو بجائے خود متوسط عرض و ارتفاع کے ہوتے تھے لیکن اس گنبد کے اضافے سے مجموعی طور پر جو دروازہ مرتب ہوتا، وہ اصل راستے کے عرض و طول کو بھلا دیتا اور پورے دروازے کو بڑی سے بڑی عمارت کے شایانِ شان بنا دیتا تھا۔ اب دیکھنے والا پہلی ہی نظر میں یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ صرف دروازے کے کام کے واسطے ہے اور اسی کے ساتھ نیچے جو اصلی راستے چھوڑے گئے ہیں، ان کے چھوٹے یا بڑے پیمانے کا اسے کچھ خیال بھی نہیں ہوتا کیونکہ دروازے کا پیمانہ اوپر کا نیم گنبد بن جاتا ہے اور اسی کے پیمانے کے مطابق دیکھنے والے کا تصور پورے دروازے کی عظمت و شان کا اندازہ کرتا ہے ؛

مسلمانوں کے قریب قریب ہر بڑے دروازے اور ہر عہد میں اسی اصول سے کام لیا گیا ہے اور ہمیشہ حسب دلخواہ نتیجہ برآمد ہوا ہے بلکہ بعض مقامات پر اس فتحپور سیکری کے دروازے سے بھی زیادہ کامیابی ہوئی ہے اگرچہ بجائے خود اس عمارت میں ایسا حسن تناسب موجود نہ ہو جیسا کہ یہاں پیدا ہو گیا ہے۔ بہر حال اس وقت تک جتنے طرز ایجاد ہوئے، ان سب میں اچھا یہی اسلامی اصول ہے اور اصول کی صحت نے ناکامیابی کو ایسا ہی دشوار بنا دیا ہے جتنی غلط اصول کی صورت میں کامیابی محال ہوتی ہے۔

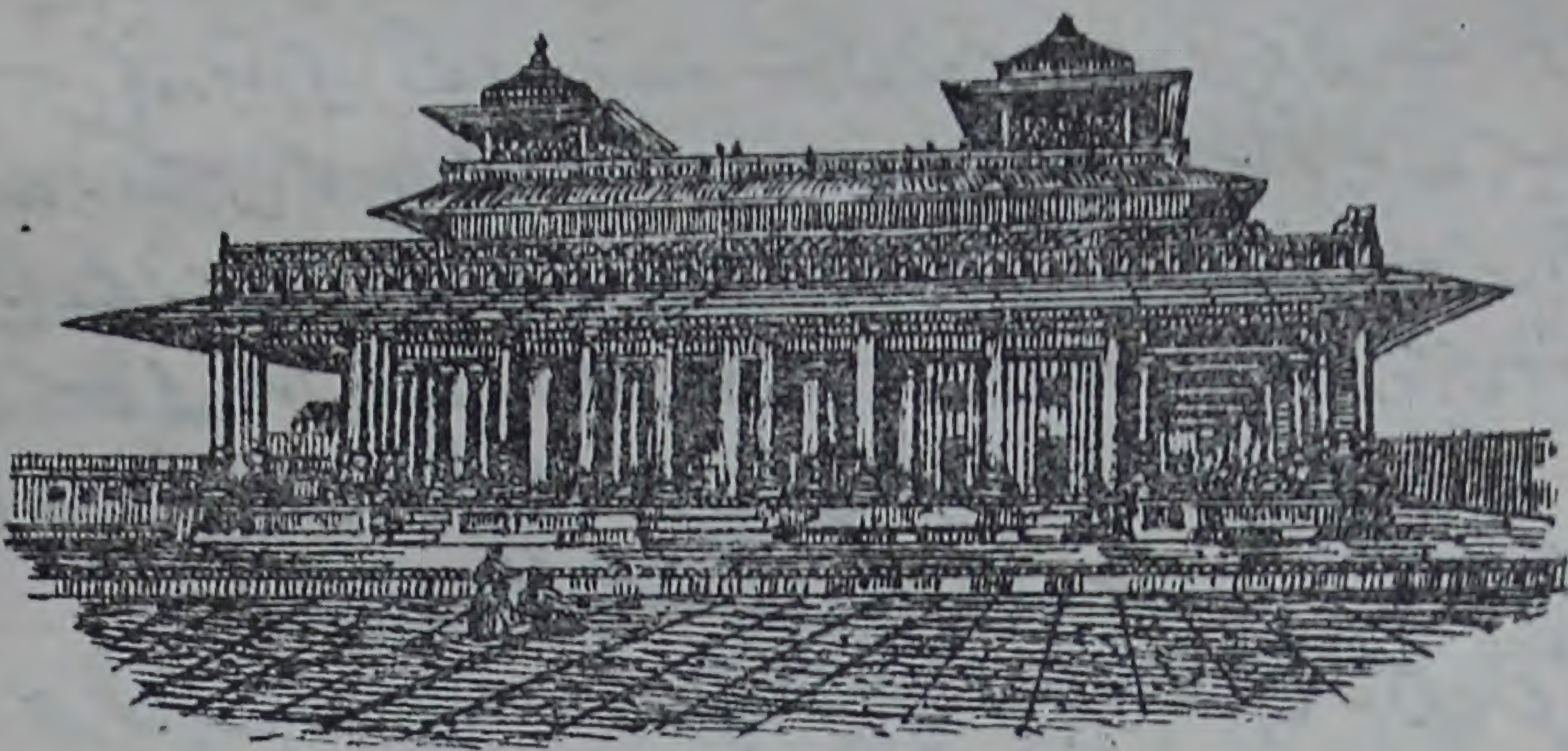
غرض مجموعی طور پر فتحپور سیکری کی یہ نفیس عمارت ایک شاعری ہے جو پتھر میں کی گئی ہے اور جس کی نظیر یا کم، بلکہ بہت ہی کم کہیں مل سکتی ہیں۔ پھر یہ کہ کسی اور ذریعے سے بانی کی عظمت اور طبیعت کا ایسا واضح اندازہ نہیں ہو سکتا جتنا کہ اس عمارت سے بلا دقت ہو جاتا ہے[۱]۔

اس بادشاہ کا آگرے سے بھی زیادہ اور عجب نہیں کہ فتحپور سیکری ہی کے برابر پسندیدہ مقام الہ آباد تھا لیکن انگریزوں نے قلعے پر قبضہ کر لیا جس سے یہاں کے قابل دید آثار قریب قریب محو و نابود ہو گئے۔ ان میں سب سے خوبصورت چیز چالیس ستون نامی عمارت تھی جس کے نیچے کی منزل میں اندر کی گہ میں ۱۶ اور گرد کے بیرونی دالان میں ۲۴ ستونوں کی قطاریں تھیں۔ دوسری منزل، اندرونی دالان کے اوپر اتنے ہی (یعنی ۱۶) ستون اٹھا کے بنائی اور ان پر گنبد قائم کیا تھا۔ یہ عمارت بالکل محو ہو چکی ہے اور اس کے سنگ و خشت قلعے کی مرمت میں لگا دیئے گئے ہیں البتہ مسخ حالت میں، ایوان شاہی ابھی تک سلامت ہے جس کی

---

[۱] فتحپور سیکری کی عمارات کی پیمائش اور تصویر کشی وغیرہ نہایت خوبی سے ایڈمنڈ اسمتھ نے چار جلدوں میں کی ہے جس میں ۔۔۴۰ سے زیادہ لوحیں اور منقوشات شامل ہیں۔ اس کتاب کو حکومت ممالک شمال مغربی (= موجودہ یوپی) نے ۹۷-۱۸۹۴ء میں الہ آباد سے شائع کیا تھا۔ نیز ملاحظہ ہو (Lesmonuments de L, Inde) از جی لے بوں۔

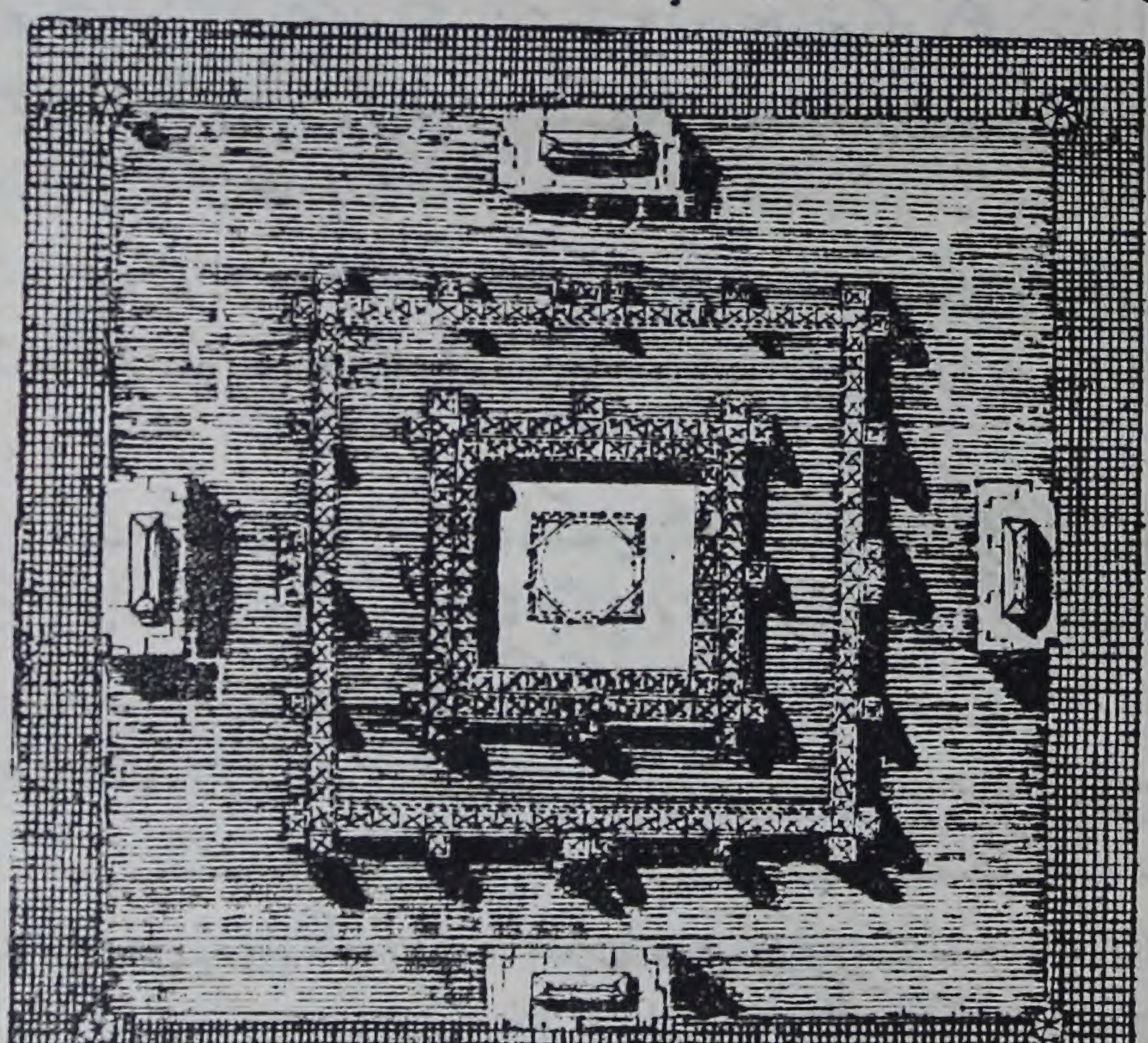
ذیل میں ہم نے تصویر دی ہے۔ انگریزوں نے اسے اسلحہ خانہ



تصویر ۴۲۶

بنا دیا تھا اور اس کے پیش دالان کے درمیان اینٹ سے چن دیئے تھے ان میں انگریزی نمونے کی کھڑکیاں بنائیں اور اس کے قدیم اور قابل دید کٹہرے توڑ پھوڑ دیئے۔ اندر بھی جس چیز کو آسانی سے توڑا نہ جا سکا اس پر بڑے اہتمام سے چونا لگا کے سفیدی پھیر دی گئی اور اصلی نقش و نگار کو بالکل چھپا دینے کی غرض سے چھت کے تختے جڑ گئے اسلحہ رکھنے کی الماریاں اور کھونٹیاں بنا دی گئیں۔ ان سب تصرفات کے باوجود اس کا نقشہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ ستونوں کی آٹھ قطاروں کا مربع ایوان ہے جس کی ہر قطار میں ۸ اور اس طرح کل ۶۴ ستون ہیں۔ گرد کے عریض برآمدے میں دُہرے اور کونوں پر چار چار ستون ملا کے نصب کئے ہیں اور ہر ایک کے سرے کو دیوارگیری کی صورت میں پھیلا دیا ہے جو انتہا درجے کی خوبصورت اور پر تکلف نمونے کی بنائی ہیں اور مجموعی طور پر ان کی وضع ایسی عمدہ اور نقش و نگار اتنے اعلیٰ درجے کے ہیں کہ ہندوستان بھر میں کہیں ان سے بہتر نہ ہوں گے؛
لیکن اکبر کے عہد کی سب سے خاص و ممتاز عمارت غالباً اس مقبرے کو سمجھنا چاہیئے جو اس نے آگرے سے پانچ میل شمال مغرب میں بمقام

سکندرہ اپنے واسطے بنانا شروع کیا اور ہندوستان کے تمام مقبروں سے جو پہلے یا بعد میں بنے اس کا طرز جداگانہ رکھا۔ میرے نزدیک اس نے یہ وضع ہندوؤں کی یا زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ، بدھوں کی تقلید میں اختیار کی تھی۔ کہتے ہیں یہ بیس برس تک بنتا رہا اور ۱۶۱۳ء میں تکمیل کو پہنچا۔ یہ ایک وسیع باغ میں ہے جس کا دروازہ بھی دیکھنے کے قابل بنایا ہے۔ باغ کے وسط میں ایک اونچے چبوترے پر مقبرہ، مخروطی وضع کی عمارت ہے جس کی زیرین منزل گوشوں کے برج چھوڑ کر ہر جانب سے ۳۲۰ فیٹ ہے۔ یہ منزل ۳۰ فیٹ بلند ہے اور اس کے ہر رُخ پر دس دس بڑی کمانیں ہیں جس کے وسط میں رنگین سنگ مرمر کے چار خانے سے ایک کلاں تر کمان داخلے کے لئے بنائی ہے۔



(تصویر نمبر ۱۴۷)

لہ اس مقبرے کا کوئی نقشہ یا خاکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے شایع نہیں ہوا۔ حالانکہ اسے ہمارے

یہ منزل گویا ایک اور چبوترہ ہے جس پر دوسرا درجہ تعمیر کیا ہے۔ اس کا ہر ضلع ۴۶ فیٹ کا اور بلندی ۱۴ فیٹ ۹ انچ ہے۔ اس کے اوپر تیسری منزل، ۱۵ فیٹ ۲ انچ اور پھر چوتھی منزل ۱۴ فیٹ ۶ انچ اونچی بنائی ہے اور یہ سب سرخ (بھربھرے) پتھر کی ہیں مگر اس آخری منزل کے اندر اوپر سنگ مرمر کا احاطہ کھینچ دیا ہے جس کا ہر ضلع ۷۰ فیٹ، یا نیچے کے چبوترے سے ٹھیک نصف ہے اور اس کے بیرونی جانب پورے دور میں نہایت دلکش نقش و نگار کی مرمریں جالی بنادی ہے۔ اس کے اندر اسی قسم کے مصاحبیں کا دالان یا حجرہ بنایا اور اس کے وسط میں اونچا چبوترہ تیار کیا ہے جس پر بانی مقبرہ کی قبر کا تعویذ ہے اور یہ خود نفیس ترین خطاطی اور سنگ کاری کا بے مثل نمونہ ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ مدفن نہیں بلکہ عین اس مقام کے نیچے جو مقبرے کی چوٹی کا سامان زینت ہے اور عمارت کی بالکل بنیاد میں ۳۵ فیٹ مربع کا ایک محرابی حجرہ بنا کے، اس بادشاہِ بزرگ کے جسم خاکی کو سپرد خاک کیا گیا تھا۔

پہلی نظر میں خیال ہوتا ہے کہ اس عجیب اور خلاف معمول مقبرے کا نقشہ یا تو بنانے والے بادشاہ کی محض ترنگ تھا یا کسی بیرونی ملک سے لایا گیا ہوگا۔ لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ براہ راست کسی قدیم بدھ وہارا کی نقل ہے جو ممکن ہے اکبر کے زمانے میں سلامت رہی ہو اگرچہ اس سے بجائے خانقاہ کے اور کوئی کام لیا جاتا ہو۔ مثلاً اگر ہم تالا پورم کی بڑی رتھ کی تصویر سامنے رکھیں جو اس کتاب کی گذشتہ جلد میں پیش کیجا چکی ہے، تو معلوم ہوگا کہ اس عمارت میں اتنی ہی منزلیں اور ان میں وہی تناسب

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ (یعنی انگریزوں کے) قبضے میں آئے ہوئے ایک صدی کے قریب زمانہ گزر چکا ہے۔ مذکورۂ متن پیمائشیں خود میری لی ہوئی ہیں اور گو یہ بجائے خود درست ہوں لیکن اتنی تفصیلی نہیں ہیں جتنی کہ ایسی یادگار عمارت کی ہونی چاہئے تھیں اور اگر یہ کسی دوسری فرنگی قوم کے ہاتھ میں ہوتی تو اس صورت میں ہم پہنچ سکتیں۔

رکھا ہے جو اس سنگتراشیدہ رتھ کا ہے۔ اکبر کے مقبرے کی بالائی منزلوں پر جو خوبصورت برجیاں بنی ہوئی ہیں وہ صاف صاف ان حجروں کی یاد دلاتی ہیں جو مذکورۂ بالا رتھ کی ہر چھتابی کے کنارے پر موجود ہیں! اگر مقبرے کی سب سے اوپر کی منزل (یعنی تعویذ قبر کے اوپر) قبہ دار حجرہ ہوتا تو رتھ سے مشابہت اتنی کامل ہو جاتی کہ ہر شخص بلا دقت اسے پہچان لیتا اور مجھ کو تو پورا یقین ہے کہ اس قسم کا گنبد اصل نقشے کا جزو تھا۔ کیونکہ ہندوستان کے کسی شاہی مقبرے میں سنگ مزار کہیں اس طرح زیر سما کھلا ہوا رہنے نہیں دیا گیا ہے۔ دوسرے اوپر کے احاطے کے وسط میں ۳۸ فیٹ مربع کا جو اونچا چبوترہ بنا ہوا ہے یہ اسقدر نمایاں طور پر گنبد کی بنیاد معلوم ہوتا ہے کہ ہیں یہ خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کی غرض یہی ہوگی۔ موجودہ حالت میں مقبرے کی چوٹی بھی منڈی منڈی اور بے معنی نظر آتی ہے۔ عمارت کی پوری بلندی گوشوں کی برجیوں کی چھت تک سو فیٹ ہے۔ اب اگر اس بنیاد کے تناسب سے جیسے میں نے گنبد کا آثار فرض کیا ہے وسط میں گنبد بنتا تو عمارت ۳۰ یا ۴۰ فیٹ اور بلند ہو جاتی اور اس کے حسن و تناسب میں جو کمی معلوم ہوتی ہے وہ نہ رہتی بلکہ وہ جزئیات کے اعتبار سے جتنی خوبصورت ہے اتنی ہی پوری شکل کے لحاظ سے خوبصورت ہو جاتی[1] اور اس طرح مکمل ہو کر ہندوستان کے مقبروں میں روضۂ ممتاز محل کے بعد سب سے بہتر مقبرہ شمار ہوتی[2]

جہانگیر ۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۸ء

جہانگیر کے باپ اور پھر بیٹے نے جتنا کچھ کام کیا ہے اس پر نظر کیجیے تو حیرت ہوتی ہے کہ جہانگیر نے ہندوستان کی عمارتی شان و شوکت میں اتنا کم حصہ کیوں لیا۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہوگا کہ اس بادشاہ کے دل میں تعمیر کا وہ ولولہ نہ تھا جو اکبر و شاہجہاں کی خصوصیت ہے لیکن ایک سبب یہ بھی سمجھنا چاہئیے کہ اس نے اپنے زمانے میں لاہور کو پائے تخت

---

[1] اس کے رنگین نقش و نگار کی گیارہ تصویریں "فوٹوگرافس اینڈ ڈرائنگز اوف ہسٹوریکل بلڈنگز" (از گریفتھ، ۱۸۹۶ء) میں شائع ہوئی ہیں۔ [2] اوپر کی تحریر لکھنے کے بعد مجھے مسٹر فنچ کے روزنامچے میں ذیل کی عبارت ملی جسے دیکھ کر مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ یہ شخص کئی سال تک آگرے میں رہا اور اس نے یہ مقبرہ بظاہر آخری مرتبہ ۱۶۰۹ء میں دیکھا تھا۔ اوپر کی منزل تک اس کی سب کیفیت صحت اور تفصیل سے بیان کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے کہ "جب میں آخری مرتبہ یہاں آیا تو مقبرے کے اوپر صرف ایک قیمتی شامیانہ لگا ہوا تھا لیکن اب اس پر محرابدار

بنا لیا تھا اور ۱۶۲۲ء سے اپنی وفات یعنی ۱۶۲۷ء تک اس کا دربار آگرہ و دہلی کی بجائے زیادہ تر اسی شہر میں رہا[1]۔

عہد جہانگیری کی عمارتوں میں سے قلعۂ آگرہ کے جہانگیری محل کا اوپر ذکر آچکا ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اوائل عہد حکومت میں جہانگیر نے بنوایا۔ نور محل کی سرائے کا، جو جالندھر سے ۱۶ میل جنوب میں ہے، خوشنما دروازہ بھی اسی نے ۱۶۲۰ء میں تعمیر کرایا[2]۔ شالامار باغ اور سری نگر کے قریب کے گرمائی مکانات ۱۶۲۴ء میں بنے۔ لاہور میں انار کلی کا مقبرہ تعمیر ہوا۔ یہاں کے قلعے میں اکبر نے جو عمارتیں بنوائی تھیں ان میں مشرقی خوابگاہ اور تین گنبد والی سنگ مرمر کی وہ موتی مسجد بھی اسی نے بنوائی جو اگرچہ سیدھی سادی ہے لیکن فن تعمیر کے اعتبار سے دلچسپ ہے۔ خوابگاہ ایک مستطیل ایوان ہے جس کا طول تقریباً ۸۰ فیٹ اور شمالی حصے کے وسط میں ایک بلند کمانچہ بنا دیا ہے، جہاں سے اس وقت دریائے راوی سامنے نظر آتا تھا اور گوشوں میں دو کمرے ہیں جن کے ستون ہندوانی وضع کے نقش و نگار سے بھرپور ہیں۔ باقی تین جانب دالان بنے ہوئے ہیں جن کے ستون سنگ سرخ کے ہیں۔ اور ان کی دیوارگیریوں پر ہاتھی، مور وغیرہ مقبول عام جانوروں کی تصویریں بنائی ہیں جیسی کہ آگرے کے لال محل میں نظر آتی ہیں مگر اس کا اور قلعے کے اندر کی دوسری شاہی عمارتوں کا (انگریزوں نے) مطلق پاس و لحاظ نہیں کیا بلکہ فوجی معاشرت کی آسانیوں کے لحاظ سے ان میں سرتاپا تغیر و تصرف کر دیا گیا ہے۔

جہانگیری محل کے جنوب میں شاہجہاں نے اپنا دیوان عام تیار کیا اور مغرب میں جہانگیری محل کو بڑھا کر ایک چھوٹی خوابگاہ بنوائی جس میں مرمریں محرابوں اور جالی کے کام کی وہ حسین بارہ دری ہے جو ایک زمانہ تک چھاونی کے گرجا کا کام دیتی رہی۔ قلعے کے شمالی رخ پر

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ (گنبد یا) چھت بننے والی ہے جس میں نہایت نادر سفید و رنگین سنگ مرمر کی چنائی ہوگی اور اندر تمام چھت سونے کی اور مرصع بنائیں گئے''۔ (پرچاس۔ جلد اول۔ ۴۴۰)

[1] اس کے باپ اکبر کا بھی ۱۵۸۴ء سے ۱۵۹۸ء تک چودہ برس مستقر یہیں رہا۔ اسی نے قلعے کی مرمت کرائی۔ مشرقی سرے پر اکبری محل اور دیوان عام بنایا جو اب منہدم کرا دیا گیا ہے۔ شہر کا بڑا دروازہ ''اکبری دروازہ'' بھی اسی بادشاہ کی یادگار ہے۔ اس کے عہد کے دوسرے آثار بھی لاہور میں مل سکتے ہیں اگرچہ بعد کے تصرفات نے ان کو بہت کچھ مسخ کر دیا ہے۔

[2] گول کی ''بلڈنگز آف دی پنجاب'' میں اس کی عکسی تصویر موجود ہے۔

"سمن برج"[۱] اور اسی میں شاہجہاں و اورنگ زیب کا بنوایا ہوا شیش محل ہے اس میں سکھوں نے بھی کچھ اضافہ کیا تھا اور وہ نولکھا بارہ دری جس میں جواہرات جڑ کے پھول بنائے تھے اور بے شبہ زر کثیر خرچ کیا گیا ہوگا۔ قلعے کے مغرب میں ایک چوک حضوری باغ کہلاتا ہے جس کے اندر رنجیت سنگھ کی بارہ دری بنی ہوئی ہے اور جس سے بادشاہی مسجد کو راستہ جاتا ہے۔ یہ مسجد ۱۶۷۴ء میں اورنگ زیب نے تعمیر کرائی اور اس کا ذکر آگے آئے گا۔

شہر لاہور میں بڑی مسجد وزیر خاں کی ہے جو پنجاب کے صوبہ دار حکیم علیم الدین نے شاہجہاں کے عہد میں بنوائی۔ یہ ایرانی طرز کی ہے اور اوپر چینی کے چوکے چن دیئے ہیں جو مختلف گہرے رنگوں کے ہیں لیکن کچھ خوش وضع نہیں البتہ اس کی خشتی دیواروں پر بڑی خوبصورتی سے قلم کاری کی ہے۔ جسے "کشی" کہتے ہیں اور جو دراصل چینی کے چارخانے ہی کی ایک قسم ہے[۲]۔

خود جہانگیر کا مقبرہ، لاہور سے کوئی ۶ میل دور شاہدرے میں اس کی سلیقہ مند و عالی دماغ ملکہ نورجہاں نے بنوایا اور اس بادشاہ کی دوسری عمارات سے شان و شوکت میں کچھ گرا ہوا نہ تھا مگر دوسری عمارتوں کی طرح اس نے بھی بہت آفتیں جھیلی ہیں۔ مقبرے کے گرد ایک وسیع باغ ساٹھ ایکڑ تک چلا گیا تھا۔ ابتدا میں اس کی چار دیواری کے ہر رخ بڑے بڑے دروازے بھی بنے ہوئے تھے اور ان میں سرائے کے صحن سے گزر کے جانب مغرب جو دروازہ کھلتا تھا اس کی سنگ مرمر کی محراب تقریباً ۵۰ فیٹ بلند تھی۔ اصل مقبرہ ایک نیچی کرسی دے کے بنایا ہے یہ ۲۶۵ فیٹ مربع اور اس کے اوپر پھر ۲۰۹ فیٹ مربع کی ایک مہتابی کوئی $20\frac{1}{2}$ فیٹ بلند ہے اور اس پر تین تین درجے کے ہشت پہلو مینار اٹھائے ہیں

---

[۱] "سمن" "ثمن" کا بگڑا ہوا ہے۔ روایت مشہور ہے کہ پہلے اس جگہ نہایت عالیشان ہشت پہلو برج بنا ہوا تھا۔

[۲] جے، ایل، کپلنگ نے اس قلمکاری کی کیفیت لکھی ہے اور مسجد کے خوبصورت دروازے اور بعض نقش و نگار کی رنگین تصویریں بھی بنائی ہیں (جرنل اوف انڈین آرٹ اینڈ انڈسٹری۔ دوم، ۱۷)

جن کی برجیاں سنگ مرمر کی ہیں۔ کرسی سے برجیوں کے کلس تک ان میناروں کی بلندی ۸۵ فیٹ ہوگئی ہے۔ مقبرے کے ہر طرف محرابی دالان ہیں جن کے وسط میں ایک بڑی کمان اور اس سے ملے ہوئے اندر جانے کے راستے اور پھر دونوں طرف پانچ پانچ بغلی کمانیں ہیں۔ دالانوں کے عقب میں کل ۲۰ حجرے ہیں جن کا ایک ایک رُخ دوسرے دو دو مستطیل نما حجروں میں جانے کا راستہ ہے اور ان مستطیل حجروں سے گزر کر اصل قبر کے حجرے تک پہنچتے ہیں۔ اس طرح قبر کے ہر طرف ۵۶ ۵٫۶ فیٹ آثار کی ٹھوس دیواریں محیط ہوگئی ہیں۔ قبر کا تعویذ سنگ مرمر کا ہے جس میں قیمتی نگینے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ وسطی حجرہ ہشت پہلو ہے۔ اور اس کا عمود ½۵۶ فیٹ اور بلندی ۱۲ فیٹ ہے۔ اس حجرے کی چھت پر سنگ مرمر کے چار خانے کی ۲۳ فیٹ مربع مہتابی بنائی ہے جس کی مرمریں منڈیر کو رنجیت سنگھ توڑ کر لے گیا تھا مگر اب وہ پھر اپنی جگہ نصب کردی گئی ہے[1] ساری عمارت سُرخ (بھر بھرے) پتھر کی ہے مگر جا بجا سنگ مرمر کی پچی کاری کی گئی ہے اور تمام کام حسنِ مذاق کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں اگرچہ میناروں کے درمیان کی نیچی پیشانی حسن تعمیر کے اعتبار سے کچھ زیادہ موثر نہیں ہے[2]

اس عمارت کے مغرب میں سرائے اور اس کے آگے نورجہاں کے بھائی آصف خاں کا، جس کا سنہ ۱۶۴۱ء میں انتقال ہوا، ہشت پہلو مقبرہ ہے۔ پھر ریل کی پٹڑی کے دوسری طرف خود ملکہ نورجہاں کا مقبرہ ہے مگر ان دونوں کے سنگ مرمر اور قیمتی نگینوں کو رنجیت سنگھ نے اکھڑوا لیا تھا۔

---

[1] اگرچہ بہت چھوٹے پیمانے پر ہے تاہم مقبرے اور باغ کا خاکہ میجر کول کی لوح سے گرگوشے اپنے مجموعہ تصاویر عمارات تاریخی میں شائع کردیا ہے (لوح ۶۸ نمبر ۶۹ تا ۷۶)

[2] تھورن ٹن کی کتاب لاہور اور سید محمد لطیف کی کتاب لاہور میں اس مقام کے تفصیلی حالات درج ہیں۔

ممالک محروسہ کے دوسرے سرے پر جہانگیر نے گوڑ کو چھوڑ کر ڈھاکے میں نیا صدر مقام تیار کیا اور کافی وسعت و شان کی متعدد عمارتوں سے اس کی زیب و زینت بڑھائی۔ مگر یہ بیشتر خشتی تھیں اور سنگ مرمر پس کران کی لپائی کر دی گئی تھی۔ صرف ستون اور توڑے البتہ پتھر کے لگائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ سب بہت شکستہ و ریختہ ہو گئے ہیں اور گو کثرت اشجار میں بھی جن کی جڑیں دیوار و در کے ٹکڑے اڑائے دیتی ہیں، جھانک کر دیکھئے تو ان کے حسنِ تنوع کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے، بایں ہمہ یہ آثار اس قابل نہیں ہیں کہ شمالی صدر مقامات کی سنگین و مرمریں عمارات کے مقابلے میں پیش کئے جائیں؛

مگر جہانگیر کے زمانے کی ایک عمارت ایسی ہے کہ گو اس بادشاہ نے تعمیر نہیں کرائی تاہم اسے دو سبب سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک تو حسن عمارت کی بنا پر اور دوسرے اس لئے کہ یہ جس عہد میں بنا اس کے طرزِ تعمیر کے کمال کی یادگار ہے۔ یہ آگرے میں اعتماد الدولہ کا مقبرہ ہے جسے نورجہاں نے اپنے باپ کی یادگار میں تعمیر کرایا تھا اعتماد الدولہ کا انتقال ۱۶۲۱ء میں ہوا اور مقبرہ ۱۶۲۸ء میں اتمام کو پہنچا۔ یہ دریا کے بائیں کنارے پر ایک باغ کے وسط میں بنا ہوا ہے جس کی چار دیواری کا ہر ضلع ۵۴۰ فیٹ ہے۔ بیچ میں اونچے چبوترے پر مقبرے کی اصل عمارت ہے جس کا ہر ضلع ۶۹ فیٹ ہے۔ اس کی دو منزلیں ہیں اور ہر زاویے پر ہشت پہلو برج بنا کے اس کے اوپر کھلی ہوئی برجیاں بنا دی ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ برج کچھ پست پست رہ گئے ہیں اور یوں بھی دیکھئے تو عمارت کی شکل میں اتنی خوشنمائی بھی بمشکل پائی جاتی ہے جتنی کہ اسی نواح کے اور معمولی سے مقبروں میں موجود ہے۔ حقیقت میں اگر کہیں یہ عمارت سرخ پتھر کی ہوتی، یا اس میں ہمایوں کے مقبرے کی طرح سنگ مرمر کی پچی کا کام بھی ہوتا، تو بھی اس پر چنداں توجہ نہ کی جاتی۔ لیکن اس کی اصلی خوبی یہی ہے کہ سراپا سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے اور اوّل سے آخر تک قیمتی نگینوں سے وہ پچی کاری کی گئی ہے،

جو بظاہر پہلے کبھی نہ ہوئی تھی اور اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ ہندوستان بھر میں اس طرزِ آرایش کی ایک بہترین مثال مہیا کرتی ہے[1]۔

معلوم ہوتا ہے کہ سترھویں صدی کے ابتدائی حصے میں اطالوی، خاص کر فلورنس کے کاریگر ہندوستان میں روشناس ہوئے اور کہا جاتا ہے کہ انہی نے ہندوستانیوں کو سنگ مرمر میں نگینے یا جواہرات جڑنے سکھائے[2]۔ فتحپور سیکری میں نگینے کی پچی اور منبت کاری دونوں کی

---

[1] اس صنعت کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، ای، ڈبلیو اسمتھ کی کتاب "مغل کلر ڈیکوریشن اوف آگرہ" (صفحات ۸، ۱۰ و ۲۰ وغیرہ) اور جرنل اوف انڈین آرٹ اینڈ انڈسٹری" جلد ششم، ۹۰ تا ۹۴ وغیرہ۔

[2] ایک زمانہ میں یہ بات یورپ میں بالکل مسلم تھی مگر اس کی کوئی بلاواسطہ شہادت پیش نہیں کی گئی۔ صرف ایک فرنگی کاریگر، آسٹن یا اوسٹن (دبوردو) کا نام ان تعمیری کاموں کے سلسلے میں مل سکتا ہے جسے شاہجہاں نے دہلی میں نوکر رکھا اور گمان کیا جاتا ہے کہ رفائیل کی تصویر کے نمونے پر آیا لو کے جانوروں سے کھیلنے کی تصویر جو دہلی میں تخت شاہی کی زینت تھی اور جو بی کنگسٹن کے متحف ہند میں ایک عرصہ تک رہی اور پھر لارڈ کرزن نے اسے وہاں سے لاکے اپنی اصلی جگہ پر جموا دیا، وہ اسی کاریگر کی نگینہ کاری تھی۔ لیکن رسالہ "دی ٹائن ٹینتھ سینچوری اینڈ آفٹر" (بابت ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۹۰ و مابعدہا) میں کلکتہ اسکول اوف آرٹ کے استاد مسٹر ہیول نے دلائل پیش کی ہیں کہ یہ نگینہ کاری اصل میں عربی اور ایرانی صناعی ہے اور خاص عربی طرز کے باریک مرغولوں اور ایرانی صنعت کے متداول موضوعات جیسے گلاب، پانچ، سرو و صنوبر وغیرہ اشیا کا حوالہ دیا ہے جو اس صنعت کی خصوصیات ہیں۔

جہانگیر کے ابتدائی دس سال (۱۶۰۵ء تا ۱۶۱۵ء) یعنی سکندرے میں مقبرۂ اکبر کے دروازوں کے تیار ہونے تک رنگین سنگ مرمر کی پچی کاری کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں مگر نگینہ کاری یا جڑت کے نمونے کم ہیں۔ اعتماد الدولہ کے مقبرے میں دونوں صنعتیں کامل صورت میں موجود ہیں (۱۶۱۵ء تا ۱۶۲۰ء) روضۂ ممتاز محل اور اکبرآباد و دہلی کے محلات میں جو شاہجہاں نے بنوائی، سنگ مرمر کی پچی کاری بالکل غائب ہے۔ اور نگینہ کاری نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ اس سے کچھ پہلے یہ صنعت جسے (Pietra "dura") کہتے ہیں، فلورنس میں ایجاد اور نہایت درجہ مقبول عام ہوئی بلکہ فی الواقع سارے یورپ میں پھیل گئی۔ یہ بھی سچ ہے کہ جہانگیر و شاہجہاں کے زمانے میں اطالوی کاریگران کی ملازمت میں تھے، لیکن اس کی کوئی قطعی شہادت

مثالیں موجود ہیں اور سکندرے کے مقبرے میں جا بہ جا پچی کی ہوئی ہے۔ لیکن عہد شاہجہانی میں یہ شے طرز تعمیر کی خصوصیت بن گئی اور اس کے محلات و مقابر دونوں کا سب سے بڑا امتیاز ہی یہ ہے کہ اس جدید صنعت سے ان میں نہایت خوشنما طریق سے کام لیا گیا ہے ۔

اس امر میں شبہ کیا گیا ہے کہ یہ نئی صنعت واقعی باہر سے آئی یا ہندوستان ہی کی ایجاد تھی۔ لیکن فن تعمیر کے ایک اساسی نکتے کو اچھی طرح سمجھ لیا جاتا تو شاید یہ سوال پیدا ہی نہ ہوتا۔ مثال کے طور پر ہم (انگریز) جو خود اپنا فن نہیں رکھتے۔ اگر کسی یونانی یا رومی ستون کی نقل یا کسی عہد وسطی کی اطالوی کمان کی جزئیات اخذ کرتے ہیں، تو ہم اسے اپنے ملک کے موسم یا اپنی ضروریات کے مطابق بنانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ بعینہ نقل اُتار لیتے ہیں۔ لیکن جس وقت کوئی قوم جس کا اپنا ایک مستقل طرز ہے، دوسرے طرز کی کوئی خاص چیز یا طریق کار اختیار کرنا چاہتی ہے تو محض نقل نہیں کرتی بلکہ اپنے مناسب حال اس کو ڈھال لیتی ہے۔ ہم اہل اطالیہ کی پچی کاری کا رواج ہونے دیتے تو اس کے ساتھ ان کے (Cinque-cents) سولھویں صدی کے تعمیری نقش و نگار تک بجنسہ قبول کر لیتے۔ مگر ہندیوں نے نئے مصالحے اور نئے طریقوں کو، خواہ وہ کہیں سے آئے ہوں، ہاتھ میں لیا تو وہ نمونے تیار کرنے لگے جو عہد اکبری کے معماروں کے مقبول عام پتھر کے نقش یا سنگ مرمر میں پچی کے کام میں نظر آتے ہیں۔ پھر ہر وضع اس مقام کے مناسب اختیار کی، جہاں اس سے کام لیا جا رہا تھا۔ طرز عمارت وہی (ہندوستانی) اور نقوش تک سب وہی رہے البتہ مصالحہ بدل گیا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ نہیں ملتی کہ انھیں کوئی با اثر عہدہ دیا گیا تھا بحالیکہ روضہ ممتاز محل کی جس کا نقشہ غالباً ایران کے پناہ گزیں امیر علی مردان خاں نے مرتب کیا تھا۔ تعمیر کے زمانہ میں شیراز، بغداد، سمرقند اور قنوج کے صناعوں کا ذکر آتا ہے کہ وہ بڑی شہرت و ناموری رکھتے تھے ۔

اور گل بوٹوں میں بھی نئے مصالحے کے نازک و خورد تر ہونے کے باعث ضروری ترمیم و تبدیلی کر لی گئی[1]۔

اعتماد الدولہ کا مقبرہ اس وضع کا پہلا نمونہ تھا اور اس لئے یقیناً سب سے کم کامیاب رہا۔ نئے نقش و نگار اپنے مقام پر کچھ بہت موزوں نہیں نظر آتے اور بیچ میں جو فصل دیئے ہیں وہ ہر جگہ اسکی وضع تزئین کیلئے سب سے اچھے نہیں ہیں۔ مگر دوسری طرف دیکھئے تو دریچوں کی مرمریں تختیوں میں جالی کا جو خوبصورت کام کیا ہے، وہ شیخ سلیم چشتی رح کے فتحپور سیکری کے مقبرے کے کام سے ملتا جلتا ہے۔ پھر اسکی بے حرم مرمری دیواریں، اس کے نقش و نگار کی بوقلمونی، یہ سب اوصاف مل کر ایک ایسا خوبصورت مجموعہ بناتے ہیں کہ اس پر خردہ گیری کی مجال صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ ہم اس کا مقابلہ شاہجہاں کی عمارات سے کریں۔

شاہجہاں ۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۸ء

فن عمارت کی ساری تاریخ میں یک بہ یک اتنے بڑے تغیر کی نظیر ملنی مشکل ہے جتنا کہ اکبر اور اس کے پوتے شاہجہاں کے طرز تعمیر کے درمیان واقع ہوا۔ نہ اتنا بڑا فرق کہیں نظر آسکتا ہے جتنا کہ پہلے بادشاہ کی تعمیر کی مردانہ قوت اور بے اندازہ جدت طرازی اور دوسرے کی انتہائی بلکہ قریب قریب نسائی نازکی اور نفاست میں نمایاں ہے۔ واقع میں ایک ہی قوم کے افراد، جو ایک ہی دین کے متبع تھے اور ایک ہی مقام پر

[1] ترکوں نے استنبول پر قبضہ کیا تو کچھ اسی قسم کی تبدیلی وہاں واقع ہوئی یعنی انھوں نے نصاریٰ کے طرز تعمیر میں اپنی ضروریات کے مناسب تصرف کر لیا اور محض نقالی نہیں کی۔ دیکھو، ہسٹری آف ۔۔۔ آرکی ٹیکچر، طبع سوم جلد دوم، ۷۰۵ وغیرہ۔

انھوں نے اپنے معابد و محلات بنائے ان کے مابین اتنا بڑا فرق جہاں تک ہمیں علم ہے کسی ملک کی تاریخ میں کبھی نہیں واقع ہوا ؛

یہ فرق بھی آگرے کے محل سے بڑھکر نمایاں نہیں ہے کہ ایک طرف تو اکبر یا جہانگیر کی بنوائی ہوئی سرخ پتھر کی حویلیاں کھڑی ہیں، جن میں کثرت سے پیکر تراشی اور جو کورہ ہندوانی ساخت نظر آتی ہے اور دوسری طرف دروازہ کھلتے ہی شاہجہانی حرم سرا کی سفید مرمریں چار دیواری سامنے آجاتی ہے (سنہ ۱۶۳۶ء تا ۱۶۴۴ء) جس میں لطافت و دلکشی کی پوری شان ہے اور اسی کے ساتھ اس خاص نفاست کا نقش بھی موجود ہے جو سوائے مشرق کے اور کہیں نہیں ملتی ؛ یہ صحن کچھ بہت لمبا چوڑا نہیں۔ بلکہ صرف ۱۷۰ × ۲۳۵ فیٹ ہے تاہم اس کو انتہائی محنت و اہتمام کے ساتھ مکمل کیا گیا ہے اس کے تین رُخ بیگمات کے مکانات ہیں جن میں کوئی خاص وسعت نہیں نہ موجودہ حالت میں کوئی تعمیری حسن رکھتے ہیں۔ لیکن چوتھا رُخ جو دریا کے اوپر چھایا ہوا ہے، ادھر تین سنگ مرمر کی کمال دلاویز حویلیاں ہیں۔ اکثر اسلامی محلات کی مثل اس محل میں بھی سب سے نفیس اور کمال تجمل کے ساتھ آراستہ حصہ حمام کا ہے جو صحن کے ایک جانب بنا ہوا ہے۔ حمام اب منہدم ہو چکے ہیں لیکن دیواروں اور چھتوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھیں کس سلیقے سے مزین کیا گیا تھا[1] ؛

اس کے عقب میں اور محل کے وسط میں ایک اور بڑا چوک ہے جس کا

---

[1] یہاں کے بڑے حمام کو مارکوئیس اوف ہیسٹنگز نے اس غرض سے توڑا تھا کہ لے جاکے جورج چہارم کی نذر کیا جائے ظاہرا یہ ارادہ کبھی پورا نہ ہوا لیکن تمام واقعات کی تحقیق اب اس لئے دشوار ہو گئی ہے کہ سنگ مرمر کے پورے فرش اور حمام کے باقی ساقی اجزا کو لارڈ ولیم بینٹنک نے ہراج کرادیا اور شاید اصلی لاگت کی صرف ایک فیصدی قیمت وصول کر لی۔ البتہ ہندوستان کے ماننے میں تو فرکی تدبیر نکالنے کا ایک ایسا عمل ضرور تھا جو اس ملک کے ارباب حکومت کی سرشت و طینت سے کمال درجے مناسبت رکھتا تھا ؛

طول ۵۰۰ اور عرض ۳۷۰ فیٹ اور ہر طرف دالانوں کی قطار بنی ہوئی ہے اس میں پہنچنے کے لئے مقابل کے سروں پر چھوٹے چھوٹے کئی خوش وضع چوکوں سے گزرنا پڑتا ہے جن کے دروازے بڑی شان کے بنائے ہیں۔
بڑے چوک کے ایک جانب محل کا صدر ایوان یا دیوان عام، ۲۰۸×۷۶ فیٹ تین گز کے دالان در دالان کی صورت میں بنایا گیا ہے جس کی محرابیں خوبصورتی میں لاجواب ہیں۔ یہ تین طرف سے کھلا ہوا ہے اور عقب کی جانب تخت کے لئے شہ نشین نکالا ہے[1]۔ اس عمارت سے آگے بڑھئے تو پھر دو چھوٹے چوک ملیں گے جن میں سے ایک میں دیوان خاص ہے اور دوسرا حرم سرا کی چار دیواری میں ہے۔ ان میں سے دیوان خاص کا ایوان عہد شاہجہانی کی جمیل ترین عمارات میں داخل ہے کہ سر سے پاؤں تک اسے بے جرم سنگ مرمر سے بنایا اور رنگ برنگ کے جواہرات جڑے ہیں اور یہ تمام کام اس عہد کی بہترین وضع میں تیار کئے گئے ہیں۔
دیوان میں ایک کھلا ہوا پیش دالان اور پیچھے گھرا ہوا کمرہ بنا ہوا ہے اس کا طول ۶۵ عرض ۳۴ اور بلندی ۲۲ فیٹ ہے۔ پتھر تراش کر جو نقش کھودے ہیں، وہ نہایت خوب ہیں اور کچھ یاقوت سرخ (جمست) وغیرہ جواہرات سفید مرمر میں جڑ کر جو پھول بنائے ہیں، وہ دیکھنے کے قابل ہیں۔
اس محل کی ایک اور منظر فریب عمارت، وہ دو منزلہ مرمریں کوشک ہے جو دریا کے رخ ایک گول برج پر، دیوان خاص و حرم سرا کے درمیان تعمیر کی ہے۔ اس کا طرز شاہجہاں سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے اور اگر جہانگیر نے کوئی چیز یہاں بنائی تو وہ یہی عمارت ہوگی۔ اگرچہ پیمانہ چھوٹا ہے لیکن یہاں اس کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو الہ آباد کے قلعے میں چالیس ستون کا ہے اور بڑی عمارتوں سے بھی زیادہ اسے دیکھ کر ان محلات کے بانیوں کی

[1] اب پوری توجہ اور روپیہ صرف کیا جا رہا ہے کہ اس صوبے میں جو کچھ پرانی عمارتیں باقی رہ گئیں ہیں ان کی حفاظت کی جائے۔

انتہائی لطافت ذوق اور نفاست پسندی کا ثبوت ملتا ہے[1] ؛

دہلی کا لال قلعہ

ہرچند آگرے کے قلعے کو غالباً بہ اعتبار تنوع اور تاریخی اہمیت کے لحاظ سے قلعۂ دہلی پر یقیناً فوقیت حاصل ہے لیکن اس میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وقت واحد میں ایک ہی نقشے کے مطابق تعمیر ہوا دوسرے یہ کہ فنِ تعمیر کے لحاظ سے اسے ہندوستان کے سب سے عالی رتبہ و تجمل پسند بادشاہ نے تعمیر کرایا۔ اسی کے ساتھ، چونکہ یہ آگرے کی عمارتوں کے کچھ بعد بنا اس لئے ایک سقم بھی آگیا ہے۔ ظاہرا اکبر آباد کی سب عمارتیں مکمل ہو چکی تھیں جب کہ نئے شہر شاہجہاں آباد اور لال قلعے کی تعمیر آغاز ہوئی اور جو کچھ اس نے آگرے میں بنایا ان میں عمارات دہلی کی نسبت زیادہ متانت اور بہتر ذوق کی شہادت ملتی ہے۔ مگر ان اسقام کے باوجود دہلی کا لال قلعہ یا قصر شاہی ممالک مشرق میں، بلکہ شاید ساری دنیا میں سب سے شاندار و پرشکوہ محل ہے یا کبھی تھا۔ دوسرے کم سے کم ہندوستان بھر میں تو یہی شاہی قصر ہے جسے دیکھکر ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک مکمل قصر کی جب کہ وہ پہلے سے سوچ بچار کے یکساں نقشے پر بنایا جائے، ترتیب و ترکیب کیا ہوتی تھی ؛ (دیکھو نقشہ آئندہ)

یہ قلعہ جو آگرے کے قلعے کی طرح جمنا کے کنارے واقع ہے،

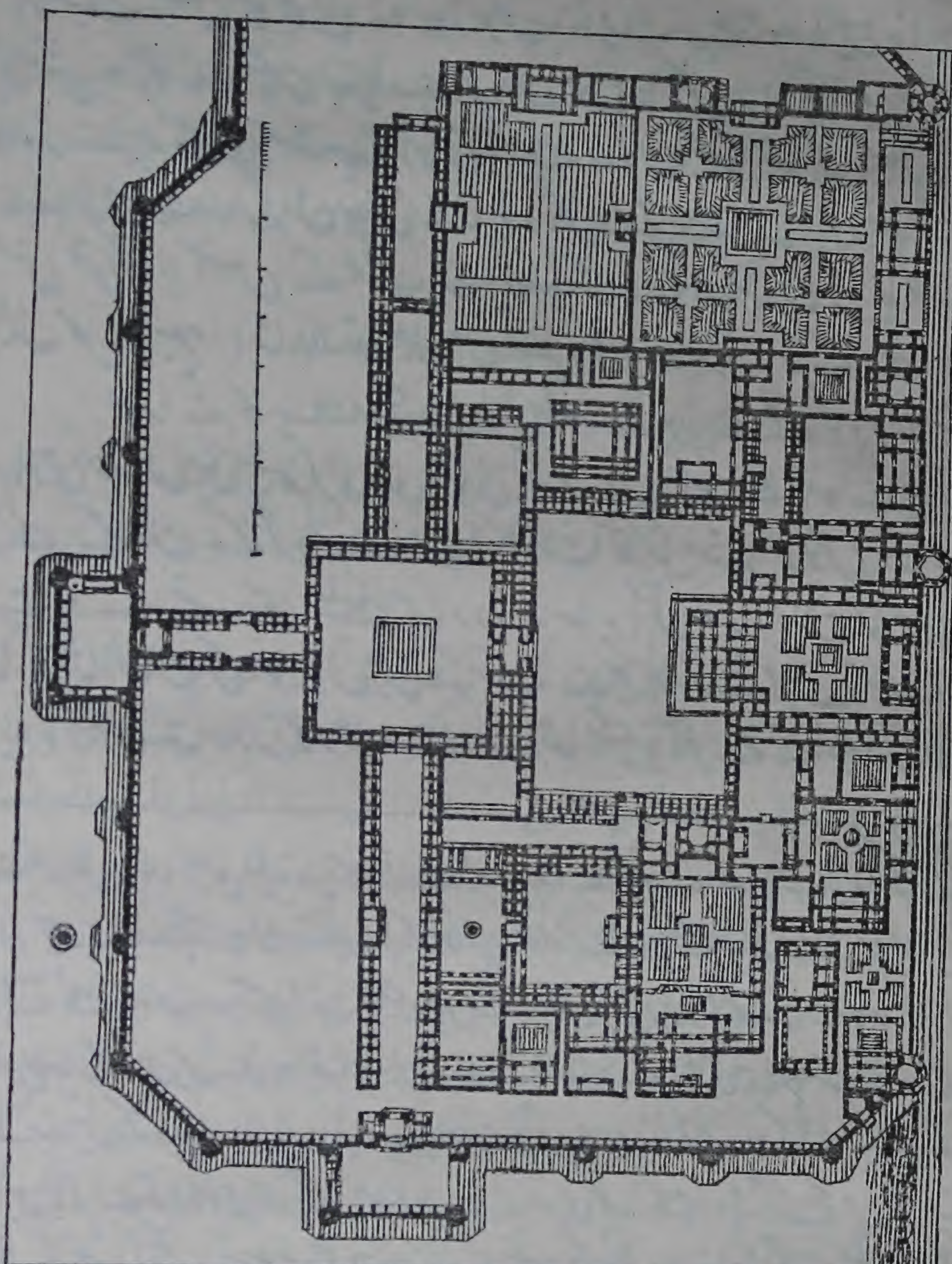
---

[1] اس محل کے مکمل نقشے ہندوستان کے محکمۂ فوج میں موجود ہیں۔ انہیں سامنے رکھے بغیر ان کی کیفیت کو ذہن نشیں پیرائے میں لکھنا نہایت دشوار ہے۔ کین کی کتاب "ہنڈ بک اوف آگرہ" کا نقشہ گو اپنی بساط بھر مفید ہے لیکن اول تو پیمانہ بہت چھوٹا ہے دوسرے فنِ تعمیر کی ضروریات کے لحاظ سے اس میں کافی تفصیل نہیں پائی جاتی ؛

قریب قریب شکل متوازی میں بنایا گیا ہے جس کے صرف زاویئے قدرے خمیدہ ہیں۔ یہ بڑے دروازے چھوڑ کر شرقاً غرباً ۱۶۰۰ اور شمالاً جنوباً ۳۲۰۰ فیٹ ہے اس کے ہر طرف سرخ (بھر بھرے) پتھر کی شاندار فصیل کھڑی ہے جس میں تھوڑے تھوڑے فصل سے قبہ دار برج آتے اور تازہ لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ اندر جانے کا بڑا راستہ، یعنی لاہوری دروازہ جانب مغرب، چاندنی چوک کے رخ کھلتا ہے جو ایک میل لمبا نہایت خوبصورت اور فراخ بازار ہے اور اس کے وسط میں نہر اور اس کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں چلی گئی ہیں۔[۱] اس بڑی گہ کے دروازے کے چھتے سے اندر داخل ہوں تو پہلے وہ لداؤ کا ایوان ملتا ہے جسے نقشے میں ہم نے ک سے دکھا دیا ہے۔ اس کے پہلوؤں کے دو درجے رکھے ہیں اور وسط میں مثمن سا بنا دیا ہے۔ ایوان کا پورا طول ۳۷۵ فیٹ ہے۔ اس کی صورت دیکھ کر بہت کچھ کسی زبردست غوطی کلیسا کا نیاز خانہ (وسطی دالان) یاد آجاتا ہے اور دروازہ ہونے کے اعتبار سے حق یہ ہے کہ دنیا بھر میں اس شان کی ڈیوڑھی کہیں نہیں ملتی، مسقف کے اندرونی کمرے دوسری طرف ایک (۳۵۰ فیٹ مربع) چوک میں کھلتے ہیں جس کے وسط میں دو طرفہ اور ایوان کی طرح دو منزلہ دوکانیں بنا کے بہت ہی خوشنما بازار تیار کیا ہے (ف۔ن) مگر اس کی چھت لداؤ کی نہیں ہے۔ بازار کا یہ سلسلہ دائیں بائیں دونوں طرف چلا گیا ہے اور ایک طرف تو دہلی دروازے (ح) میں نکلتا ہے اور دوسری (یعنی جنوب کی) طرف باغ میں، جو میرا خیال ہے کہ کبھی مکمل نہ ہونے پایا۔ داخل ہوتے وقت سامنے کے رخ نوبت خانہ تھا (ا)

تصویر بر صفحہ دیگر

۱؎ یہ نہر اب مدت سے پاٹ دی گئی اور اس کے کنارے کے درخت کاٹ کر، دکانوں کے قریب درختوں کی نئی قطاریں نصب کی گئی ہیں۔ مترجم۔



تصویر ۴۳۱

جس کے نیچے سے گزر کر قلعے کے دوسرے یا صدر چوک میں پہنچتے ہیں۔ یہ چوک شمالاً جنوباً ۰ ۵ ۵ فیٹ اور شرقاً غرباً ۲۸۵ فیٹ ہے۔ اس کے بیچ میں قلعے کی دربارگاہ یا دیوانِ عام (ب) بہت کچھ آگرے کے دیوانِ عام کی مثل لیکن شان و تجمل میں اس سے بڑھکر بنا ہوا ہے۔

آثار سمیت اس کا طول ۲۰۰ اور عرض ۱۰۰ فیٹ ہے۔ وسط میں نہایت
پُر نقش و نگار شہ نشین بنایا ہے جس میں مرصع و مکلل بہ جواہر[1] مرمریں
چبوترے پر کبھی وہ شہرۂ آفاق تخت طاؤس بچھتا تھا کہ جس کی
زیب و زینت اور گراں بہائی غالباً خود تجمل پسند ایشیا میں اپنی نظیر نہیں
رکھتی تھی[2]۔ اس کے عقب میں ایک صحن باغ اور مشرق کی جانب
رنگ محل (ج) بنا ہوا تھا جس میں حمام وغیرہ دوسرے کمرے تھے۔
عمارات کا یہ ۱۶ سو فیٹ طویل سلسلہ پورے قلعے کو دو تقریباً
مساوی حصوں میں منقسم کرتا تھا۔ شمالی نصف میں چھوٹے چھوٹے چوک
دے کے ان کے گرد بہت سے مکانات غالباً معزز مہمانوں کے لئے
بنے ہوئے تھے۔ اسی سلسلے میں دریا پر سایہ افگن وہ دیوان خاص (د)
تھا جو شاہجہاں کی عمارتوں میں اگر سب سے خوبصورت نہیں تو سب سے
زیادہ آراستہ و زرنگار عمارت ضرور تھا[3]۔ یہ آگرے کے دیوان خاص

---

[1] قلعہ دہلی پر ہمارا (یعنی انگریزوں کا) قبضہ ہوا تو معلوم ہوتا ہے ہر شخص نے آزادی سے بے روک لوٹ مار مچائی انہیں میں ایک کپتان (جو بعد میں سر کے خطاب سے معزز ہوا) جونس تھا جس نے اس مرمریں چبوترے کے بڑے حصے کو ادھیڑا اور توڑ پھوڑ ڈالا۔ مگر شکر ہے اسے یہ خیال آیا کہ ان جڑاؤ پتھروں سے کاغذ تھیموں" کا کام لیا جائے۔ ان میں سے دو پتھر وہ وطن (ولایت) لایا اور پانسو اشرفی میں فروخت کئے۔ انھیں متحف ہند میں رکھ دیا گیا۔ ان میں ایک پر جواہرات جڑ کر پرندے بنائے ہیں اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ فلورنس یا کم سے کم اطالوی کاریگروں کا کام ہے۔ دوسری شبیہ کا ہم اوپر تذکرہ کر چکے ہیں کہ یہ رافائیل کی تصویر کی نقل ہے جو خود بھی ایک دوسری تصویر کی تقلید میں تیار کی گئی تھی لیکن رافائیل کے ہاں آپالو دیوتا کے ہاتھ میں رباب (وائلن) ہے ور اصل پرانی تصویریں بربط۔ چونکہ دہلی کی تصویر میں بھی یہ ساز دکھایا گیا ہے اس واسطے دوسرے قرائن موجود نہ ہوتے تو بھی صرف یہی مشابہت اسے اطالوی ثابت کرنے کیلئے کافی ہوتی۔

[2] اسے ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ تڑوا کر لوٹ لے گیا۔

[3] اس کے جنوب میں اور اس کے اور رنگ محل کے درمیان فصیل سے آگے بڑھا ہوا مثمن برج، شمالی سرے پر شاہ برج اور جنوبی جانب اسد برج بنا ہوا ہے۔

یقیناً وسیع تر اور کہیں زیادہ مزین و مرصع تھا اگرچہ نقشۂ تعمیر کے لحاظ سے مشکل اُتنا نفیس ہوگا لیکن عام ترتیب میں جو پرکیف تناسب ہے یا قیمتی نگینوں کی جس حسن کے ساتھ یہاں ترصیع و تزئین کی ہے، اس سے بہتر کوئی چیز بنانا امکان سے خارج ہے۔ یہی ایوان ہے جس کی چھت کے گرد یہ مشہور کتبہ کندہ تھا کہ ؎

اگر فردوس بر روے زمین است
ہمین است وہمین است ہمین است

اور اس کا اگر یہ مطلب لیا جائے کہ کسی محل میں جو اس وقت دنیا میں موجود ہے، اس بے نظیر حسن و خوبی کا کوئی ایوان نہیں، تو یہ دعوی کچھ مبالغہ آمیز بھی نہ ہوگا۔

اس کے آگے شمال میں قلعے کے باغ وچمن تھے جن کو مشرق کے مقبول عام طرز کے مطابق بنایا تھا اور سنگ مرمر کی چھوٹی چھوٹی بارہ دریاں، چھتریاں اور طرح طرح کے فواروں سے ان کی زیب و زینت بڑھائی تھی کہ اس ملک کے موسم کے لئے ان سے زیادہ موزوں اور باغ میں ان سے بڑھکر خوبصورت آرائش کے اسباب نہیں ہو سکتے۔

بازار کے مشرق میں اور وسطی عمارتوں کے جنوب میں جو فصل ہے، وہاں حرم سرا اور محل کے زنانہ حصے تھے یہ ٹکڑا ہر رُخ سے ایکہزار فیٹ سے کم نہ ہوگا جس کے معنی یہ ہوے کہ اسکوریال یا یورپ کے اور کسی شاہی محل سے دُگنے سے زیادہ رقبہ اس حرم سرا نے گھیر رکھا تھا۔ قلعے کا جو نقشہ مقامی لوگوں سے مجھے ملا اور جس کی صحت میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس کی رد سے حرم سرا میں تین چمنستاں اور ۱۳ یا ۱۴ دوسرے چوک تھے جن کی عمارتوں کو مختلف اغراض سے بنایا گیا تھا لیکن یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ وہ کس قسم کی عمارتیں تھیں۔ کیونکہ اب ان کا اثر آثار تک باقی نہیں ہے۔ قلعہ آگرہ میں جو محلسرا اسی بادشاہ نے بنائی ہے، اس پر قیاس کیا جائے تو یہ دہلی کی حرم سرا شروع میں خوبصورتی اور صناعی

کے لحاظ سے دیوان عام و خاص وغیرہ سرکاری عمارات سے بھی بڑھکر ہوگی۔ اگرچہ بہت ممکن ہے کہ برابر استعمال میں رہنے کے باعث غدر ۱۸۵۷ء تک اس میں ردّ و بدل کر کے اسے بہت کچھ بدصورت بنا دیا گیا ہو۔ اس لئے کہ آخری سو سال میں لال قلعے کے اندر بھی ذوق ایسا ہی خراب ہو چکا تھا جیسا کہ باہر، جس کی شہادتیں لکھنؤ وغیرہ مقامات میں ملتی ہیں۔ بایں ہمہ اصل شاہجہانی عمارت آخر تک ضرور موجود رہی ہوگی۔ اور یہ ممکن ہو گا کہ اوپر کے کوڑے کو ہٹا کر اصل چیز اس ڈھیر کے اندر سے نکال لی جائے۔ لیکن انگریز حاکموں کے دماغ میں اس خیال کا آنا محال تھا۔ انہوں نے حرمسرائے شاہی کے سارے مکانات کو صفحہ ارض ہی سے محو و نابود کر دیا اور ان انگریزی بارکوں کے لئے جگہ صاف کرائی جن کی بدصورتی دیکھکر وحشت ہوتی ہے۔ مزید براں، جن صاحبوں نے اس خوفناک بربریت کا ارتکاب کیا تھا، انہیں اس بات کا مطلق خیال نہ آیا کہ دنیا کے شاندار ترین محل کو غارت و منہدم کرنے سے قبل اس کا کوئی نقشہ یا کیفیت ہی قلمبند کرا لیتے ؛

قلعۂ دہلی کی سرکاری عمارتوں میں بھی صرف چار یعنی نوبت خانہ، دیوان عام، دیوانِ خاص، اور رنگ محل باقی رہ گئے ہیں۔ اس محل میں ایک عرصے سے گورہ فوج کا کھانا دانا ہونے لگا ہے۔ ان کے علاوہ دو ایک چھوٹی بارہ دریاں بھی اتفاق سے بچی رہ گئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قلعے کی اصلی زیب و زینت انہی چار عمارتوں سے تھی لیکن ساتھ کے مکانات، دالان در دالان سلسلے اور چوک نہ رہنے سے یہ محض لایعنی ہو کے رہ گئی ہیں اور ان کی آدھی خوبصورتی جاتی رہی ہے[1]۔ اب بدصورت انگریزی بارکوں کے درمیان ہونے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی استاد

[1] انصاف کا مقتضیٰ ہے کہ اس بات کا بھی اقرار کیا جائے کہ ان چاروں شاہی عمارتوں پر انگریزی حکومت مرمت وغیرہ کے لئے بہت معقول روپیہ خرچ کرتی رہی ہے ؛

مشرقی جوہری کا زیور میں جڑا ہوا نگینہ، اپنی جگہ سے اکھاڑ کر محض کسی گھٹیا دیوار کے صندلے میں لگا دیا ہے[۱]۔

تاج محل

اس شکستہ اور خراب کردہ قیصر کو چھوڑ کر روضہ ممتاز محل کی طرف متوجہ ہونے سے خواہی نخواہی خوشی ہوتی ہے۔ اور لال قلعے سے بھی بڑھکر غالباً یہی عمارت ہمیشہ سے عہد شاہجہانی کا شاہکار بھی تھی۔ دوسرے اس کی خوش نصیبی تھی کہ انگریزوں کے التفات کا مرجع بن گئی اور وہ کچھ عرصہ سے اس کے متعلق کافی اہتمام کر رہے ہیں اور اسے باغ سمیت بالکل درست و بہتر حالت میں رکھتے ہیں۔

ہندوستان کی کسی عمارت کے اتنے نقشے اور تصویریں نہیں کھنچی ہونگی، جتنی اس کی اور نہ کسی کی تفصیلی کیفیت اتنے بار قلم بند ہوی ہوگی۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود جن لوگوں نے اسے نہیں دیکھا، ان کے ذہن میں اس کا صحیح نقشہ اتر آنا قریب قریب غیر ممکن ہے۔ جس کا سبب صرف یہ نہیں ہے کہ اس میں انتہا درجے کی نازکی اور چابکدستی سے کام لیا گیا ہے، یا اس میں نہایت ہی نفیس وخوشنما مصالحہ لگایا ہے بلکہ یہ کہ اس کے نقشہ تعمیر میں کمال

---

[۱] اس وحشیانہ حرکت کا بنا بنایا عذر یہ تھا کہ دہلی کی گورہ فوج کو ناگہانی حملے یا بلوے سے محفوظ رکھنے کی غرض سے قلعے میں رکھنا ضروری ہوا۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو اسے جائز تسلیم کیا جا سکتا تھا لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ دہلی کی مقامی گورہ فوج کے لئے لال قلعے کے اندر اور سلیم گڑھ میں بہت کافی جگہ موجود تھی کہ شاہی عمارتوں کو توڑے پھوڑے بغیر اپنا پورا ساز و سامان اور پہرے کے سپاہی اندر رکھ سکیں اور باقی فوج کیواسطے باہر زیادہ کھلی جگہ میں بلند و روشن بارکیں بنوالیں جہاں سے ناگہانی حملہ یا بغاوت کی صورت میں فوج بلا دقت قلعے کی پناہ لے سکتی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے انگریز انجنیروں نے خیال کیا کہ اگر محل سرا کو گرا کر چھوٹی سی دیوار کھینچ دی جائے تو روپیہ یا دردسری اٹھائے بغیر ان کے بارک خانہ کا احاطہ تیار ہو جائیگا! یہ یا اسی قسم کی کوئی ورکنجوسی کی مصلحت تھی، جس کی خاطر محلسرا کو منہدم کر دیا گیا

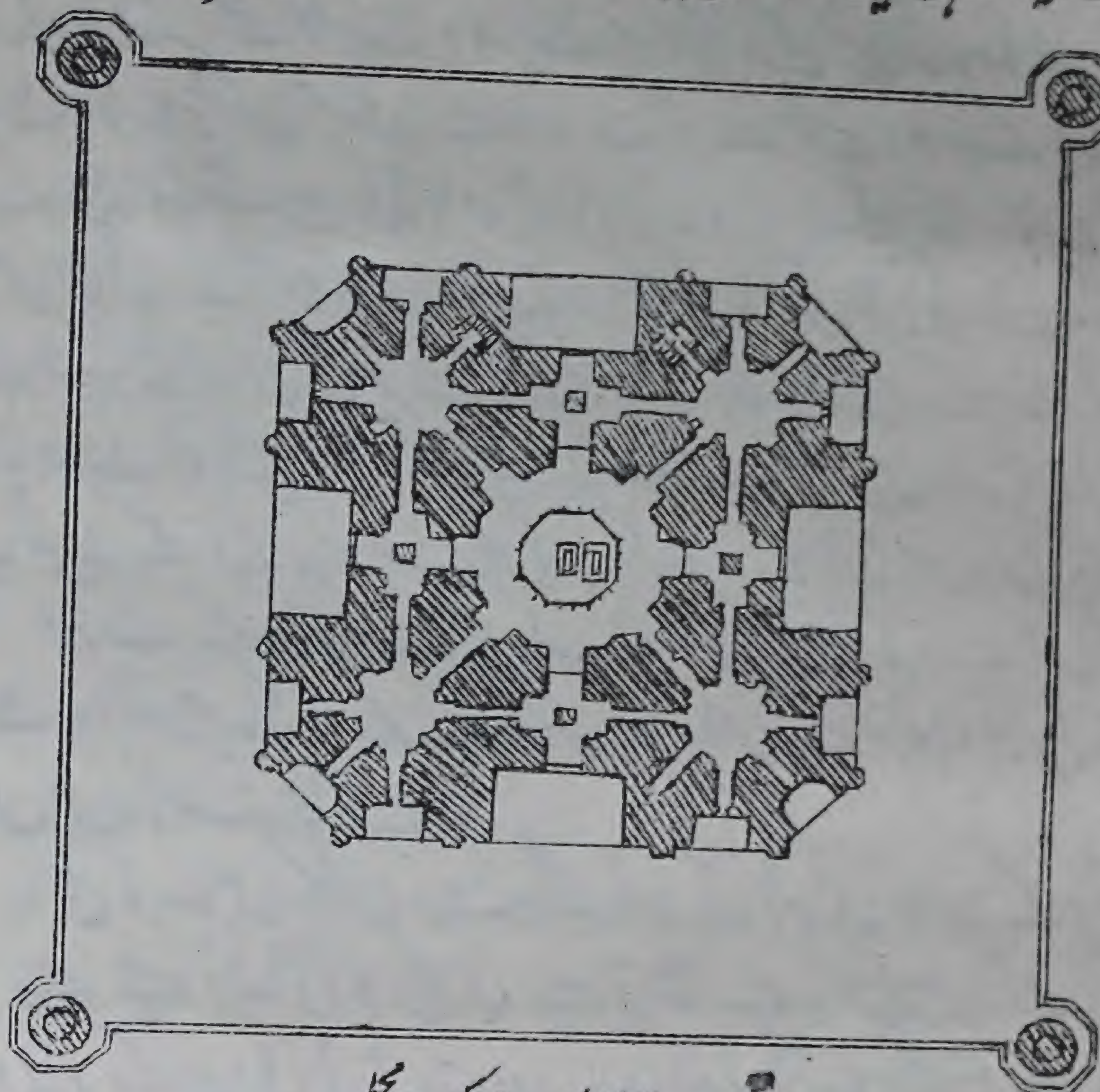
بوقلمونی اور ندرت صرف کی گئی ہے۔ اگر تاج محل صرف مقبرہ ہوتا تو بھی اس کی علیحدہ کیفیت بیان کرنے کے قابل ہوتی لیکن لمبے لمبے میناروں کے ساتھ اس کا چبوترہ بجائے خود فنِ تعمیر کا ایک کارنامہ ہے۔ علاوہ ازیں پہلوؤں میں ایک طرف وہ مسجد ہے جو اور کہیں ہوتی تو بذاتِ خود قابلِ ذکر عمارت سمجھی جاتی۔ عمارتوں کا یہ سلسلہ مقبرے کے باغ کے ایک ضلع پر پھیلا ہوا ہے اور یہ کل صحن باغ ۸۸۰ فیٹ مربع ہے۔ پھر ان عمارتوں کے دوسری جانب دوسرا صحنِ باغ، عرض میں اسی قدر لیکن گہرائی میں صرف نصف ہے۔ اس کے اندر جانے کے تین دروازے الگ بنے ہوئے ہیں اور اندرونی دیوار کے وسط میں صدر دروازہ اس شان کا بنایا ہے کہ پورے روضے کی زینت بڑھ گئی ہے[۱]۔ غرض یہ کہ ہرچند یہ مقبرہ بذاتِ خود بہت خوبصورت عمارت ہے لیکن اگر تنہا ہوتا، تو اس کا آدھا حسن بھی باقی نہ رہتا۔ انہی خوبصورتیوں کا اس طرح جمع ہو جانا اور پھر ان کا ایک دوسرے سے کامل طور پر ملازم و وابستہ ہونا ہی یہ اسباب ہیں جنھوں نے روضۂ ممتاز محل کو مجموعی اعتبار سے وہ چیز بنا دیا کہ دنیا اس کا مثیل پیش کرنے سے عاجز ہے اور جس کی وجہ سے ان اشخاص پر بھی اس کا اثر پڑے بغیر نہیں رہتا جو عموماً حسنِ تعمیر کے تاثرات سے حد درجہ بے حس ہوتے ہیں۔

ذیل کے خاکہ اور نقشے سے اس مجموعے کی صدر عمارت (یعنی مقبرے) کی ترتیب اور عمارتی خصوصیات کا صاف اندازہ ہو سکے گا۔ وہ چبوترہ جس پر عمارت قائم ہے، زمین سے ۱۸ فیٹ اونچا اٹھا ہوا ہے اس کے فرش پر اور سامنے سنگِ مرمر کی چنائی کی ہے اور ہر ضلع ٹھیک ۳۱۳ فیٹ طویل ہے۔ چبوترے کے ہر کونے پر ایک مینارہ بنایا ہے جس کا ارتفاع ۱۳۷ فیٹ اور جملہ اجزا انتہائی حسنِ تناسب کا نمونہ ہیں اور شاید ہندوستان میں سب سے

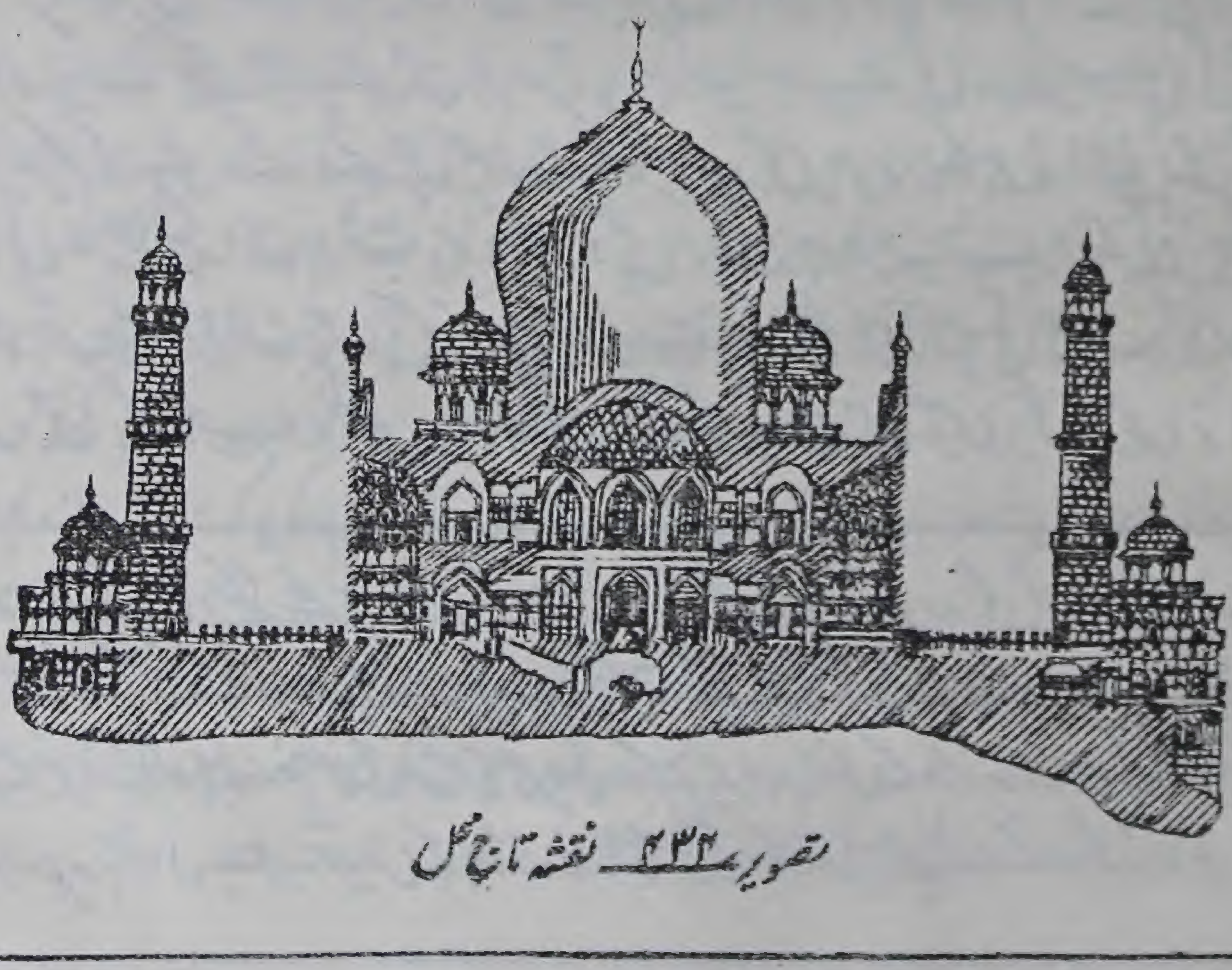
---

[۱] اس باغ کا خاکہ تاج محل اور گرد کی عمارتوں کی نشاندہی کے ساتھ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ جلد ہفتم صفحہ ۴۲۔

خوبصورت مینار بھی ہیں۔ اس چبوترے کے وسط میں مقبرے کی ۱۸۶ فیٹ



تصویر ۲۲۳ — خاکہ تاج محل



تصویر ۲۲۴ — نقشہ تاج محل

مربع عمارت ہے جس کے گوشے بقدر ۳۳ فیٹ ۹ انچ ترشے ہوئے ہیں۔ روکار کی طرف سے عمارت ۹۲ فیٹ ۳ انچ اونچی ہے۔ وسط عمارت میں، ۵۸ فیٹ قطر کا بڑا گنبد جھت سے ۸۰، یا چبوترے سے ۱۹۱ فیٹ بلند ہے۔ اسی کے نیچے سنگ مرمر کی جالی میں، جو ہندوستان کی نفاست وصنعت کی خاص مثال ہے[1] وسط میں ارجمند بانو بیگم یا ممتاز محل کی اور ایک طرف اس کے شوہر شاہجہاں کی قبر ہے۔ لیکن جیسا کہ ہندوستان کے مقابر کا دستور ہے، یہ صرف تعویذ ہیں اور اصلی سید ہے سادے مدفن زمین دوز حجروں میں ٹھیک تعویذ کے نیچے بنے ہوئے ہیں جیسا کہ اوپر کے نقشے میں دکھایا گیا ہے۔

عمارت کے ہر زاویئے پر ایک دو منزلہ برج نما کمرہ ہے اس کا قطر ۲۶ فیٹ ۸، اور جیسا کہ خاکے سے ظاہر ہے، یہاں سے مختلف غلام گردشوں اور ایوانوں میں راستہ جاتا ہے۔

وسطی کمرے میں روشنی صرف سنگ مرمر کی دوہری جالی کے ذریعے پہنچتی ہے جسے انتہائی کاریگری سے تراشا ہے۔ ان میں سے ایک جالی دیوار کے بیرونی رخ ہے اور ایک اندر جانب لگائی ہے۔ ہمارے (انگلستان کے) ملک میں اس سے بالکل اندھیرا رہ جائے گا۔ لیکن ہندوستان میں اور ایک ایسی عمارت میں جو سرتا پا سنگ مرمر سے بنی ہے، سورج کی شعاع کو مدھم کرنے کے لئے یہی صورت مناسب تھی ورنہ چکا چوند سے بڑی زحمت ہوتی۔ بحالیکہ اس وقت جو دھیمی دھیمی روشنی ہر طرف سے دوہری جالی کے ذریعے ایوان میں پہنچتی ہے اس سے مرکزی ایوان کی خفیف تاریکی میں بھی کچھ عجیب دلکشی پیدا ہو گئی ہے کہ بیان میں نہیں آسکتی۔ جس زمانے

[1] اس کی وضع دیکھکر مجھے خواہ مخواہ یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ محجر شاہجہاں کے بعد لگایا گیا ہے۔ برنیر نے اپنی کیفیت میں اس کا ذکر نہیں کیا اور یوں بھی اسے قریب زمانہ کا بتاتے ہیں جیسا کہ وہ فی الواقع معلوم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ملکہ کے تعویذ کے گرد پہلے زر خالص کی مرصع بجواہر جالی اور اس میں دو چاندی کے دروازے تھے ان کی لاگت ایک لاکھ ۲۷ ہزار روپیہ بتائی جاتی ہے جب سورج مل کے جاٹوں نے سنہ ۱۷۶۱ء میں آگرے کو لوٹا تو انہیں بھی اڑا لے گئے اور گلا ڈالا۔

میں یہ تفریح کا مقام اور صرف باغ کی بارہ دری ہوگی[1] تو اس سے بڑھکر خوبصورت اور ٹھنڈی جگہ شاید کہیں نہ ہو، اور اب جو دفن کی وجہ سے محترم ہوگئی ہے تو دنیا کا سب سے شاندار و پُراثر مقبرہ ہے ؛

یہ عمارت، جواہرات کی نگینہ کاری کا بھی، جو اکبر کے بعد سے سلاطین مغل کے طرز تعمیر کا ممتاز لازمہ ہوگئی تھی، بے مثل نمونہ پیش کرتی ہے روضے کے ہر علاقہ (اسپینڈرل)[2] ہر گوشے اور جملہ ممتاز اجزا کا حسن، یشب، سنگ ستارہ اور زبرجد وغیرہ قیمتی نگینوں کی ترصیع سے دوبالا ہوگیا ہے اور سنگ مرمر کی، جس کے اندر وہ جڑے ہوئے ہیں، سفیدی ان کی رنگینی کو اور بھی نمایاں کرتی اور مجموعی طور پر وہ حسین و گراں بہا طرز آرائش بن گئی ہے کہ عمارات میں اس سے بہتر طرز کبھی اختیار نہ کیا گیا ہوگا۔ بے شبہ اس کا یونانی آرائش کے حسن ذہنی سے تو مقابلہ ہو نہیں سکتا لیکن اسے چھوڑکر، محض عمارات کی زیب و زینت کے لئے جو طریقے مروج ہوئے، ان میں، یقیناً اسے فضیلت حاصل ہے۔ روضۂ ممتاز محل کی قبروں اور ان کے مجھر میں اس نگینہ کاری سے بے دریغ کام لیا گیا ہے۔ اگرچہ مغربی جانب کی مسجد، یا فواروں اور گرد کی دوسری عمارتوں میں ایسی دریا دلی نہیں دکھائی۔ فی الواقع جس طرح یہ تزئین حیرت انگیز ہے، اسی طرح مختلف حصوں میں جس تمیز و ہوشیاری کے ساتھ اس سے کام لیا ہے وہ بھی کچھ کم عجیب نہیں ہے، اور اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد کے ہندوستانی معمار کتنا اعلیٰ ذوق اور فن میں کس قدر سلیقہ رکھتے تھے ؛

روضے میں سنگ مرمر کی روشیں بنائی ہیں اور ان کے کنارے دورویہ سرو کی قطاریں اور عقب میں سدابہار درختوں کی کثرت سے پوری

---

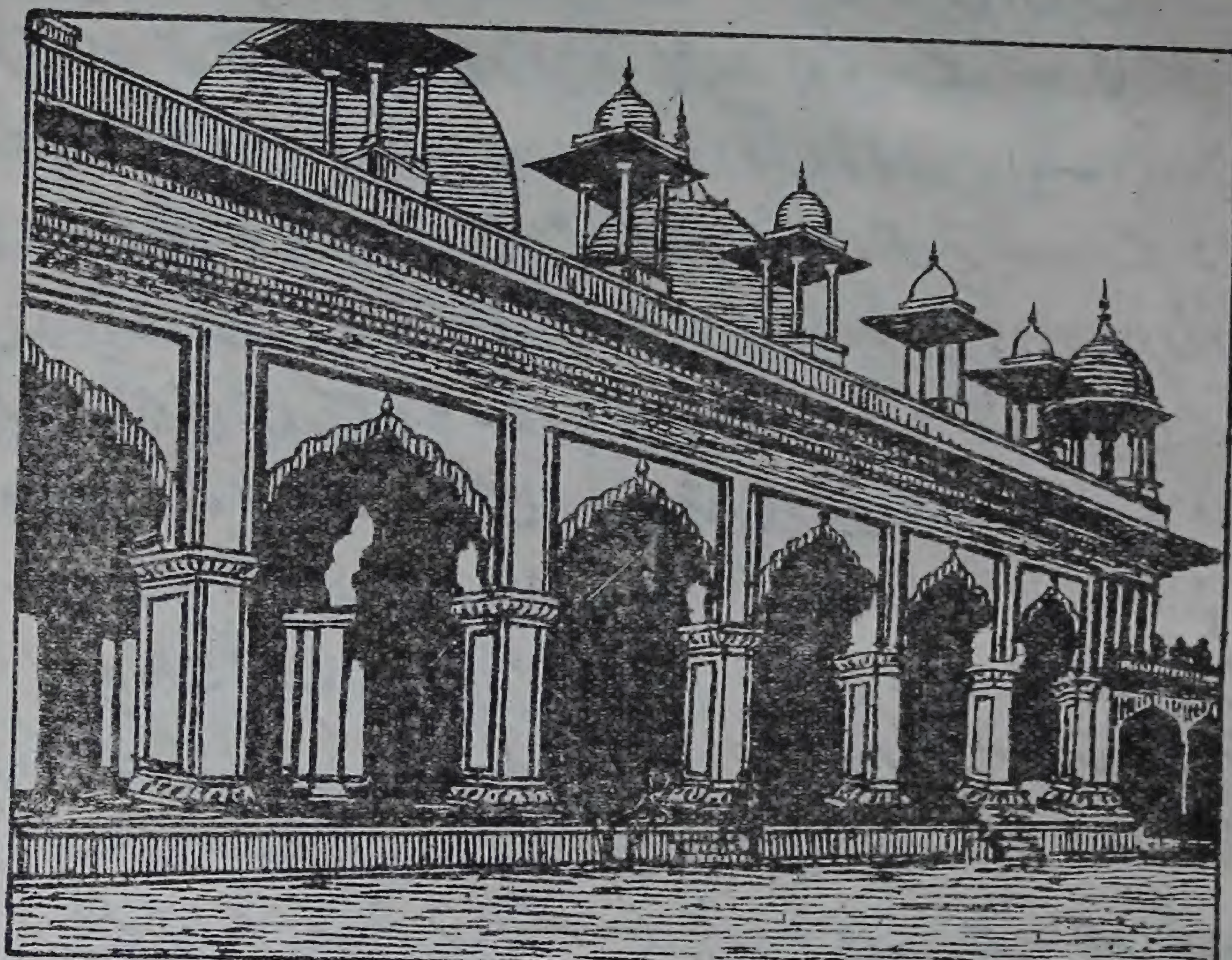
[1] اس عمارت سے بارہ دری یا تفریح گاہ کا کام کبھی نہیں لیا گیا۔ مترجم

[2] (Spandrill) یعنی دو محرابوں کے درمیان (چھت تک کا) حصہ جسے غالباً بڑھئی میں کوری بھی بولتے ہیں جیسے رآباد کے راج اسے "علاقہ" کہتے ہیں ؛ مترجم

عمارت میں ایسی عجیب کیفیت پیدا ہوگئی ہے کہ اس کا خود بانی روضہ یا اس کی اولاد کو مشکل سے اندازہ ہوگا۔ ان قطاروں کے وسط میں نہریں بنائی ہیں اور ان میں جا بہ جا فوارے نصب کردیئے ہیں اور ہر قطار کے آخر میں جہاں چوک کھلتے ہیں، وہاں کوئی خوبصورت عمارت بنی ہوی ہے سامنے جمنا اور پیچھے یہ باغ، فوارے اور اس شان کا دروازہ، پھر اس کے مصالحے کی خوبی اور تشکیل کا حسن یہ سب ایسے عناصر ہیں کہ دنیا بھر میں ایسی کسی عمارت کو بھی روضۂ ممتاز محل کے مقابلے کے لئے ٹوک سکتے ہیں۔ ان کا حسن اعلیٰ ترین قسم کا نہ ہو لیکن جس قسم کا ہے اس میں اپنا ہمسر نہیں رکھتا۔

موتی مسجد، جسے شاہجہاں نے (۱۶۴۶ء تا ۱۶۵۳ء) قلعۂ آگرہ میں بنایا، گو اتنی شاندار نہیں نہ اتنی آراستہ پیراستہ ہے جتنی اس بادشاہ کی دوسری عمارتیں، تاہم دنیا کی نفیس و جمیل ترین مساجد میں اس کا شمار ہے۔ یہ آثار سمیت صرف ۱۸۷ × ۲۳۴ فیٹ ہے یعنی کچھ بہت وسیع نہیں اور بلند چبوترے پر ہونے کے باوجود باہر سے حسن تعمیر کا کوئی ادعا نہیں رکھتی لیکن ادھر مشرقی دروازے سے مسجد میں قدم رکھا اور ادھر صحن کی خوشنمائی نظروں میں کھب گئی! پوری عمارت بے جرم سنگ مرمر کی اور جملہ اوضاع و اشکال بنہایت نفیس و حسین ہیں۔ اسباب تزئین میں صرف ایک کتبہ ایسا ہے جسے اصطلاحاً عمارتی چیز نہیں کہہ سکتے۔ یہ خود مسجد کے حاشیئے میں سنگ موسیٰ کے حروف جڑ کر مرتب کیا ہے۔ صحن مسجد ۱۵۴ × ۱۵۱ فیٹ یعنی قریب قریب مربع ہے۔ اس کے تین طرف دس دس فیٹ چوڑے اور نیچے نیچے دالان بنے ہوے ہیں مگر مغرب کی طرف مسجد کی اصل عمارت اندر سے ۱۵۹ × ۵۶ فیٹ ہے اور دونوں سروں پر شاہی محل سرا سے اس میں راستہ آتا ہے۔ صحن مسجد کی طرف اس کی سات کمانیں نہایت خوبصورت بنی ہوی ہیں، اور چھت پر تین گنبد شلجمی وضع کے ہیں، جو ان دنوں ہر جگہ مروج ہو گئے تھے۔ ذیل میں جو تصویر ہم نے دی ہے، وہ اس عمارت کا پورا حق ادا نہیں کرتی اور اس کی پوری

قدر جاننی ہو تو برائے العین دیکھنا ضروری ہے۔ بہر حال میں تو مشکل
سے کوئی دوسری عمارت جانتا ہوں جو اتنی



تصویر ۴۳۶

صاف ستھری اور نفیس ہو یا وضع میں اکبری عمارات سے جو اسی جگہ
بنی ہوئی ہیں، اس قدر حیرت انگیز فرق رکھتی ہو۔

دہلی کی جامع مسجد ۱۶۴۴ء میں بننی شروع ہوئی مگر ۱۶۵۸ء سے پہلے
تکمیل کو نہ پہنچی تھی اس کا نقشہ موتی مسجد کے نقشے سے مشابہ ہے اگرچہ
پیمانہ کہیں بڑا رکھا ہے اور دو مینار بھی اضافہ کئے ہیں جو آگرے کے نمونے
میں موجود نہ تھے۔ اسی کے ساتھ سنگ مرمر میں سنگ سرخ کی آمیزش
نے وہ نفاست و پاکیزگی یہاں نہیں رہنے دی جو موتی مسجد کا وصف ہے۔
بایں ہمہ یہ ہند یا بیرون ہند کی ان مسجدوں میں ہے جن کا نشاہی باہر
سے دلکش اثر ڈالتا ہے۔ اسے بہت ہی بلند کرسی پر تعمیر کیا ہے۔ تین

بڑے دروازے ہیں گوشوں پر چار برج اور صدر دالان پر عالیشان گنبد بنائے ہیں اور یہ سب نہایت خوبی سے ایک دوسرے کے لازم وملزوم اور اسی کے ساتھ الگ الگ وضع کے اجزائے عمارت ہیں جن سے پوری مسجد میں عجب حسن اور شانِ تنوع پیدا ہوگئی ہے۔ مسجد کا طول ۲۰۱ اور عرض ۱۲۰ فیٹ ہے۔ سامنے دونوں کونوں پر ایک ایک مینار ۱۳۰ فیٹ بلند بنا ہوا ہے۔ اس میں عمودی پٹیاں اس ترتیب سے ڈالی ہیں کہ ایک سنگ مرمر کی ہے دوسری سنگ سرخ کی اور اوپر (خشش در؟) برجیاں بنادی ہیں۔ اس کا صدر یا بادشاہی دروازہ فتحپور سیکری کے دروازے کے مقابلے کا تو نہیں مگر بڑی شان وخوبی کا دروازہ ہے اور چھوٹے پیمانے پر ہونےکی وجہ سے یہ اپنی اشیائے گردوپیش سے زیادہ تناسب رکھتا ہے؛

یہ بات تعجب سے خالی نہیں ہے کہ شاہجہاں نے اپنے قلعۂ دہلی میں کوئی مسجد نہیں تعمیر کی حالانکہ اکبر نے فتحپور کے محل میں مسجد بنائی اور خود شاہجہاں نے آگرے کے محل کی موتی مسجد سے زینت بڑھائی۔ لال قلعے میں جو چھوٹی موتی مسجد بنی ہوی ہے یہ اورنگزیب کی ایزاد کردہ ہے اور اگرچہ بطور خود بہت خوبصورت ہے تاہم بہت ہی چھوٹی یعنی آثارنمیت ۴۰ فیٹ مربع اور اس قلعے کی شان کے لائق نہیں ہے۔ غرض خود شاہجہاں نے قلعے کے اندر کوئی عبادت گاہ نہیں بنائی اور نہ ظاہرا اس کا قصد کیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کمی کو اس واسطے جائز رکھا گیا کہ خود جامع مسجد قلعے سے قریب اور بظاہر ایک ہی وسیع منصوبے کا جزو تھی۔ ایک مسجد[1] بازار کے وسط میں، قلعے کے دہلی دروازے کے سامنے ۱۱ فیٹ اونچے چبوترے پر بنی ہوئی ہے مسجد میں داخل ہونے کے لئے شمال وجنوب کی طرف زینے ہیں لیکن سامنے کا

[1] بظاہر متن کی عبارت میں کچھ لفظ سہواً چھوٹ گئے ہیں اور آگے کے بیان سے بھی صاف نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس مسجد کا ذکر ہے؟ مترجم

صدر دروازہ غدر کے زمانے میں انگریزوں نے منہدم کر ڈالا تھا۔ اس کا رقبہ کچھ زیادہ نہیں صرف ۱۳۰ × ۱۰۰ فیٹ ہے اور اس میں پانچ در ہیں۔ اس کے تین گنبد بلا گردنے کے بنائے ہیں اور یہ گویا قدیم چپٹی اور بعد کی صراحی دار وضع کے بین بین صورت نکالی ہے۔ ان کی چنائی سنگ سرخ سے کی گئی ہے لیکن دور میں سنگ مرمر کی گھگری کی دھاریاں ہیں جو خوشنمائی سے خالی نہیں اور عمارت سے بھی فی الجملہ مناسبت رکھتی ہیں۔ یہ مسجد ۱۶۴۴ء تا ۱۶۴۸ء میں شاہجہاں کی شائستہ و عالی تبار بیٹی جہاں آرا بیگم نے بنائی یا اس کے نام پر بنائی گئی تھی ؏

اورنگ زیب عالمگیر ۔ ۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء

فن تعمیر کی تاریخ میں ایسی حیرت انگیز چیزیں بھی کم ہوں گی، جیسا کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے ساتھ ہی ذوقِ عمارت میں انحطاط کا نمایاں ہونا ہے۔ اس کے عہد میں سلطنت مغلیہ انتہائے عروج کو پہنچ گئی تھی اور کم سے کم ظاہر میں تو اس کے اخیر زمانہ تک کوئی ضعف یا کمزوری نظر نہ آتی تھی۔ مانا کہ اس کی زاہدانہ مُردہ دلی اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ محلات اور سرکاری مکانات پر ملک کا بہت سا روپیہ خرچ کیا جائے، تاہم خیال ہوتا ہے کہ اس کی مذہبی وارفتگی نے اسے یہ ترغیب تو دلائی ہوگی کہ مساجد یا اور دینی مآثر اس شان و شوکت کے تیار کر جائے جو اسلاف کی یادگاروں سے بڑھے چڑھے ہوں۔ لیکن واقعہ اس کے بالکل خلاف ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اس نے بشیشور کے مندر بنارس کو تڑوایا کہ وہ شاہی مسجد تعمیر کرائے، جس کے بلند و خوشنما مینارے آج بھی شہر کے منظر کی سب سے نمایاں علامات میں داخل ہیں۔ پھر جہانگیر کے زمانہ میں بیرسنگھ بندیلے نے کیشو دیو یا کرشن کا جو مندر متھرا میں بنایا یا از سر نو تعمیر کرا لیا تھا، اور نہایت مقدس مانا جاتا تھا

اسے بھی "شاہ دیں پناہ" نے ۱۶۶۹ء میں زمین کے برابر کرادیا اور اس چبوترے پر ایک وسیع مسجد بنانے کا حکم صادر کیا۔[1]

لیکن یہ کام شوقِ تعمیر کی وجہ سے نہ تھے بلکہ اس مسجد سازی کا منشا محض ہندو رعایا کو ذلیل کرنا اور اسلام کے غلبے کا ثبوت دینا تھا۔ بایں ہمہ یہ مسجدیں بھی کوئی خاص شان و شوکت نہیں رکھتیں اور ان دو کے سوا جہاں تک مجھے معلوم ہے صرف ایک بڑی مسجد اس عہد میں (لاہور میں) اور تعمیر ہوئی۔

یہ آخری مسجد جسے لاہور کی جامع مسجد یا بادشاہی مسجد کہتے ہیں دارا شکوہ کی ضبط کردہ جاگیر کے روپے سے ۱۶۷۴ء میں بنوائی گئی اور حضوری باغ کے مغرب سے اس میں داخل ہوتے ہیں۔ خود حضوری باغ کا دروازہ جو محراب دار چبوترے پر اٹھایا اور سنگِ سرخ و مرمر سے بنایا ہے، بڑی شان کی تعمیر ہے۔ اس کے بغلی دالانوں پر جو حجرہ ہے، اس میں حضرت رسول کریم صلعم اور آپ کے اہل بیت رض کے بعض "تبرکات" محفوظ ہیں۔ مسجد کی تعمیر بادشاہ کے رضاعی بھائی فدائی خاں کوکا کی نگرانی میں ہوئی اور یہ کافی حسن و خوبی کی عمارت اور مغلیہ طرز کی آخری یادگار ہے۔ اس میں سنگِ مرمر کے اور بہت دلفریب شکل کے تین گنبد ہیں اور نہ صرف اس معاملے میں بلکہ روکار کی عام ترتیب و ترکیب میں یہ قریب قریب جامع مسجد دہلی کا ثنیٰ ہے لیکن وسطی محراب کی سنگِ مرمر کی تزئین اور صدر دالان کی سامنے کے رخ کی نقاشی بہت ادنیٰ درجے کی ہے دوسرے کونے کے مینار روکار کا سرا ہونے کی بجائے بالکل جداگانہ اور سیدھے سادے مثمن برج کی صورت میں بنادیئے ہیں جب معمول یہ تین درجے کے تھے لیکن ۱۸۴۰ء کے زلزلے سے انہیں صدمہ

---

[1] فاضل مصنف نے عام انگریز تاریخ نویسوں کی طرح ان قصوں کو بہت کچھ مبالغے اور ناواقفانہ تعصب کے رنگ میں لکھدیا ہے۔ اور ان احکام کی کوئی وجہ لکھنے کی تکلیف نہیں اٹھائی نہ یہ لکھا کہ اگر بادشاہ کی حکمت عملی ہی یہ تھی تو اور ہزاروں مندر کیوں چھوڑ دیئے گئے؟ مترجم

پہنچا تو اوپر کی برجیاں اتروادی گئیں۔ یہ صحن مسجد کے انتہائی گوشوں پر ایک دوسرے سے ۷۵ گز فاصلے سے واقع ہیں۔

ذوق تعمیر میں جتنی سرعت سے زوال آیا، اس کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ ۱۶۶۰ء و ۱۶۶۶ء کے درمیان جب کہ یہ بادشاہ اورنگ آباد میں مقیم تھا، اس کی سب سے عزیز بیوی رابعہ دورانی بیگم[۱] کا انتقال ہوا اور اس کے لئے ہو بہو روضۂ ممتاز محل کے نمونے پر مقبرہ بنانے کی تجویز ہوئی۔ یہ تعمیر بادشاہ کے تیسرے بیٹے اعظم شاہ سے منسوب ہے لیکن ان دونوں عمارتوں کو دیکھ کر جو چند ہی سال کے فاصلے سے بنی ہیں، آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ ایک تو وہ عمارت ہے کہ بعض خصوصیات میں جنہیں ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے، دنیا بھر میں اس کا نظیر نہیں اور ایک یہ اورنگ آباد کا مقبرہ ہے کہ کوئی خاص نفاست یا نقشے کی خوبی نہیں رکھتا اور بد ذوقی اور بھدے پن کا نمونہ بن جانے سے بال بال ہی بچ گیا ہے۔ تاج کی ایک اور موبمو نقل انیسویں صدی کے آغاز میں لکھنؤ میں کی گئی تھی اور وہاں کے ایک بادشاہ کا مقبرہ بالکل اسی نمونے کا تعمیر ہوا تھا مگر یہ نمونہ سر سے پاؤں تک بد مذاقی اور بھدے پن کی تصویر ہے اور حقیقت میں یہ سمجھنا مشکل ہے کہ کوئی شے صورت میں اس قدر یکساں اور معنوی اعتبار سے اس درجہ مغائر کیوں کر ہو سکتی ہے۔ مگر واقعہ یہی ہے اور یہ تینوں تاج بہترین مقیاس ہیں جن سے مغلیہ سلطنت کے عروج اور پھر سریع تنزل کے وقت فن کے انحطاط کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

خود اورنگ زیب کی قبر غارہائے آلورا کے قریب اوپر موضع خلد آباد کے مقبرہ، شیخ زین الدین رح میں بنی۔ یہ جگہ تو مقدس سمجھی جاتی ہے لیکن مقبرہ بہت گھٹیا اور ایسا ہی معمولی ہے جتنا کسی

---

[۱] اورنگ زیب کی شادی اس ملکہ سے جس کا اصلی نام دلرس بانو (بنت شاہنواز خاں صفوی) تھا، ۱۶۳۷ء میں ہوئی اور اس سے بادشاہ کے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔

بادشاہی امیر کے لئے موزوں ہوتا۔ بظاہر عالمگیر نے تاتاری شان و شوکت کا یہ لازمہ بہم پہنچانے کی پروا نہ کی اور اس کے جانشینوں نے چاہا بھی ہو تو اتنے مقتدر نہ تھے کہ اس کمی کو پورا کر دیتے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہندوؤں کے تلسی کے مقدس پیڑ نے اینٹ کے فرش میں ایک بار جڑ پکڑ لی اور بڑھکر خوب تناور ہو گیا اور اس طرح گویا اس شخص کی تحقیر کرتا تھا جس سے بڑھکر متعصب ظالم سے ہندوؤں کو کبھی سابقہ نہ پڑا تھا[1]

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، اورنگ زیب نے قلعۂ دہلی میں بھی بعض اضافے کئے اور اس کے عہد میں پائے تخت کے اندر اور دوسرے مقامات میں بہت سے عالیشان محل (اور لوگوں کے) تعمیر ہوے۔ ان میں سب سے وسیع دارا شکوہ اس کے ناکام حریف بھائی دارا شکوہ کا محل تھا لیکن اس کو انگریزی رزیڈنسی بنا لیا گیا اور چند ہی سال میں صندلے اور سفیدی سے اس کمبخت کی وہ وہ اصلاحیں کی گئیں کہ یہ پتہ چلانے کے لئے کہ یہ کلیتہً اینگلو سکسن قوم کا تعمیر کردہ نہ تھا، کافی ذہانت درکار ہے۔ خاص شہر میں عالمگیری زمانے کی بہت سی حویلیاں اور محلات اس نجاست سے مدتوں تک محفوظ رہے لیکن اب عموماً وہ کھنڈر ہو گئے ہیں، یا دکانوں کے کام آتے ہیں۔ ان میں شان و تجمل موجود ہے مگر طرز تعمیر میں جو زوال رونما ہو گیا تھا، اس کی بھی صاف صاف علامتیں نظر آتی ہیں اور یہ زوال اودھ و حیدرآباد کے جدید صدر مقامات یا دوسرے شہروں میں جو گزشتہ صدی کے اندر مشہور ہوے اور بھی زیادہ صریحی ہے۔

مگر ان شہروں میں بھی وسیع و رفیع الشان عمارتیں ایسی موجود ہیں جو اپنی وسعت و بوقلمونی کی بناء پر لائق توجہ ہیں اور ایسی آنکھ کے لئے جو صرف الحمرا کے چونے گچ کے عجائبات دیکھکر سدھی ہو، ان میں حسن و دلکشی

---

[1] فاضل مؤلف نے ان چند جملوں میں جو مفرط مبالغہ کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود لکھنے والا تعصب کی رو میں کتنی دور بہ گیا ہے؟ مترجم

کے بہت سے اسباب مہیا ہیں۔ لیکن سنگ مرمر یا پتھر کے چوکون کی چنائی ان میں بہت کم ہے اور زیادہ ترانیٹ یا انگھڑ (یا ٹوٹے پتھر) سے بنائی گئی ہیں اور گچ سے نقش و نگار بنائے ہیں جو آگرہ و دہلی کی حیرت انگیز صناعیوں کے پہلو بہ پہلو ہونیکی وجہ سے کبھی تحسین و ستائش کے مستحق نہ ہوسکیں گے۔

ہندوستان میں اسلامی فن تعمیر کی تاریخ، جسے جامعیت کا ذرا بھی دعویٰ ہو مکمل نہیں ہوسکتی جب تک شاہی عمارتوں کے علاوہ دوسری ابنیہ خاص کر مقابر کی کیفیت نہ بیان کی جائے جو ملک کے گوشے گوشے میں پائے جاتے ہیں۔ دہلی و آگرہ ہی میں بادشاہی مقبروں کے علاوہ جن کا اوپر تذکرہ ہوا، صدہا درباری اُمرا کے مقبرے ایسے ہیں کہ رفعت و سطوت میں اپنے آقاؤں کے مقبروں سے بہ مشکل کم ہونگے۔

صدر مقامات سے قطع نظر، گنگا جمنا کی وادی میں، بلکہ مشرق میں ڈھاکے تک شاید ہی کوئی باوقعت بستی ایسی ہوگی جس میں تعمیری شان و شوکت کی اس صنف (یعنی مقابر) کے دو چار نمونے موجود نہ ہوں۔ جونپور و الہ آباد میں خصوصاً کثرت سے ایسی مثالیں ملتی ہیں لیکن پٹنے اور ڈھاکے میں چھوٹی قسم کے مقبروں کی دو دلکش ترین مثالیں ایسی موجود ہیں کہ ان سے بہتر کہیں نظر نہیں آتیں۔

میسور و اودھ

ان دو ملکوں کے طرز تعمیر پر دو ایک باب سیاہ کر دینا کچھ مشکل نہیں مگر اسے دلنشیں کرنے کی غرض سے چند تصاویر بہر حال کندہ کرانی پڑتیں اور یہ مضمون اتنا ضروری نہ معلوم ہوا کہ اس کے لئے یہ زحمت برداشت کی جاتی۔ مذکورۂ بالا دونوں ملکوں میں میسور کی اسلامی حکومت صرف چالیس برس (۱۷۶۰ء تا ۱۷۹۹ء) رہی تاہم چونکہ وہ فرنگی اثرات سے کافی دور تھی

اس لیئے ایک ایسا طرز اختیار کیئے رہی جس میں صحیح معنی میں بعض خصوصیات فن موجود ہیں۔ تیر نگاپٹم کی حویلی جو دریا دولت موسوم ہے، طرز میں دیاگ کے محل سے ملتی جلتی ہے جو قریب قریب اسی زمانے میں تعمیر ہوا تھا۔ لیکن اس حویلی میں وہ شان وقوت نہیں اور نہ تزئین و آرائش میں دیاگ کے محل سے کوئی مقابلہ کر سکتی ہے ۔ باقی خاندان (حیدر علی) کا مقبرہ اور اس پاس کے گنبدوں میں بھی عظمت رفتہ کی یادگار پائی جاتی ہے مگر یہ دہلی و آگرہ کے شاہی مقبروں کے پاسنگ بھی نہیں ہیں ۔

دوسری طرف دوسرے نواب وزیر اودھ، ابو المنصور خاں صفدر جنگ (۱۷۳۹ء تا ۱۷۵۴ء) کے مقبرے کو لیجیئے جو دہلی و قطب صاحب کے درمیان بنا ہوا ہے، تو یہ اس مقام کی شاہی عمارتوں میں کچھ بدزیب نہیں معلوم ہوتا حالانکہ یہ بہت بعد کی (۱۷۵۶ء کی) عمارت ہے۔ دور سے یہ نہایت شاندار و پرشکوہ نظر آتا ہے۔ اگرچہ قریب سے معاینہ کرنے پر بھرم کھل جاتا ہے۔ اسے ایک وسیع باغ میں محرابی حجروں کی کرسی دے کر (جو دس فیٹ بلند اور ۱۱۰ فیٹ مربع ہے) بنایا ہے عرض و طول ۶۰، ۶۰ فیٹ کے قریب اور نقشے کی عام وضع قطع ہمایوں کے مقبرے سے فی الجملہ مشابہت رکھتی ہے وسطی کمرہ ۲۰ فیٹ مربع اور اس کے اندر سنگ مرمر کا بہت خوبصورت تعویذ ہے پتھر کی خوب جلا کی ہے مگر ساخت میں قدرے تصنع پایا جاتا ہے۔ فرش اور دیواروں کے نچلے حصے میں سنگ مرمر لگایا ہے اور چالیس فیٹ کی بلندی پر ایک چپٹا گنبد قایم کیا ہے۔ وسطی کمرے کے گرد چار مربع اور چار مثمن حجرے پیچھے اور ایسے ہی اوپر کی منزل میں بنے ہوئے ہیں۔ مجموعی عمارت کی نسبت "دہلی پاسٹ اینڈ پریزنٹ" کے مصنف (مسٹر فنشاں) کی رائے ہے کہ کونے کے برجوں کی سجاوٹ کامیاب نہ ہو تو بھی بیچ میں ہلکے رنگ کے سنگ سرخ اور سنگ مرمر کا اجتماع نظر فریب ہے مگر اندر چونے سے جو نقش و نگار بنائے ہیں، وہ اس مقبرے میں غالباً سب سے ذلیل چیز ہے ۔ لیکن اس کے خاندان والوں نے آخر میں جس شہر کو اپنا

صدر مقام بنالیا تھا، وہاں تو وہ ایسی بھی کوئی عمارت نہ بنا سکے جس کی اتنی مشروط تعریف ہی کی جا سکتی ؕ

اگر محض تعمیر کی کثرت اور نقش و نگار کی افراط ہی سے فن کی ضروریات پوری ہو جایا کریں، تو ہندوستان کا کوئی بڑا شہر اس کے اتنے نمونے نہ پیش کر سکتا تھا جتنے لکھنؤ میں جمع ہیں۔ حقیقت میں یہ دیکھکر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اس خاندان نے اپنی صرف ایک صدی کی زندگی میں اپنے صدر مقام کو اتنی بھڑکیلی عمارات سے کس طرح معمور کر دیا جو سب کی سب، یا شاذ و نادر مستثنیات کو چھوڑ کر باقی تمام، بدترین ذوق کا ثبوت دیتی ہیں ؕ یورپ میں فن تعمیر کی نشاۃ جدیدہ کے متعلق جب کہ سولھویں صدی میں قدیم طرز کو دوبارہ فروغ ہوا، جو کچھ بھی کہا جائے، ہندوستان میں تو یہ حد درجے افسوسناک ثابت ہوا۔ قدیم ستون گری کے طریقے جس لایعنی گنوارپن سے یہاں ایک ایسی قوم نے استعمال کئے ہیں، جو خود اپنے طرزوں میں وہ اعلیٰ درجے کے نمونے تیار کر سکتی تھی، وہ فن تعمیر کی تاریخ میں ایک سخت حیرت انگیز حادثہ ہے ؕ

اطالوی طرز کی جو عمارتیں لکھنؤ میں بنیں ان میں سب سے قدیم اور مشہور ابنیہ میں ایک "کونسٹنشیہ" کی عمارت ہے [1] جسے جنرل کلاڈ مارٹن [2] نے اپنے رہنے کے واسطے بنایا تھا مگر وہ اس کی وفات کے بعد تکمیل کو پہنچ سکی [3] ؕ

---

[1] "Mansion of Constantia" کی وجہ تسمیہ غالباً یہ تھی کہ جنرل موصوف نے "Labore et Constantia" (محنت و استقامت) کو اپنی توقیع بنالیا تھا اور مکان کی رو کار پر بھی یہی الفاظ لکھوائے تھے ؕ

[2] جنرل مارٹن، لیون (فرانس) میں سنہ ۱۷۳۵ء میں پیدا ہوا اور لکھنؤ میں سنہ ۱۸۰۰ء میں وفات پائی۔ وہ فرانسیسی فوج میں معمولی سپاہی بھرتی ہوا تھا مگر لالی کی سخت گیری سے نوکری چھوڑ کر بھاگا اور پانڈیچیری کے محاصرے کے زمانے میں انگریزوں سے آملا جہاں اسے کپتانی کے عہدے تک ترقی مل گئی۔ سنہ ۱۷۷۶ء میں اسے نواب اودھ کی ملازمت میں منتقل کر دیا گیا اور وہیں سنہ ۱۷۹۶ء میں میجر جنرل کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ اس نے

معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنرل اپنا معمار بھی آپ ہی تھا اور اسی لئے جو نمونہ تیار کر گیا ہے وہ ترتیب کے اعتبار سے عجیب معجون مرکب سا، اور ضوابط فن (طرز پلاڈیو) کے لحاظ سے ایسی سنگین غلطیوں کا مجموعہ ہے جو کسی طرح معاف نہیں کی جا سکتیں البتہ ایسے موسم اور ان خاص حالات کی بنا پر جن سے بانی کو یہاں سابقہ تھا، نظر انداز کرنے کے لائق ہیں نگران اسقام کے باوجود درجہ بدرجہ چھتوں کے اوپر جو بڑا مرکزی برج بنایا ہے، اس میں کچھ نہ کچھ بات عجیب اور قابل دید ضرور ہے اور ان چھتوں کے نیچے فراخ ایوانات کا جو سلسلہ تیار کیا ہے، اس کی اندرونی ترتیب بہت ہی خوشگوار اثر پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف موسم کے اعتبار سے بھی نہایت ہی موزوں ہے۔ خط افقی کو جا بہ جا برجیاں بنا کے توڑ دیا ہے جو بہترین ذوق کی دلیل ہوں تو نہوں، اپنی جگہ پر خوشنمائی ضرور رکھتی ہیں اور ایسے شہر کی نواح میں موزوں بھی ہیں، جہاں اس قسم کی آرائشی چیزوں کی اتنی افراط ہے جتنی لکھنؤ میں۔ غرض مجموعی طور پر دیکھئے تو یہ عمارت فونٹ ہل میں بیک فورڈ کے عجیب نمونے سے جو اس کی حریف ہے، زیادہ معقولیت رکھتی ہے اور اگر اس کی جزئیات زیادہ خالص ہوتیں اور وہ بیہودگیاں نہ کی جاتیں، جو ایک اناڑی لامحالہ کیا کرتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اس میں ایک نہایت دلکش تعمیر کا نقش اول موجود ہے ؎

تصویر بر صفحہ دیگر

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ نہایت معقول اثاثہ اور کثیر سرمایہ چھوڑا جس کا ایک حصہ یوں کلکتہ اور لکھنؤ میں مدارس قایم کرنے کیلئے تھا مگر وصیت نامہ بہت طویل اور خود اپنی قلم سے ایسی بری انگریزی میں لکھا تھا کہ اس روپے کا بڑا حصہ عدالت ہی کی نذر ہو گیا ؎



تصویر نمبر (۴۳۰)

بڑے برج کے سب سے نیچے ایک دھندھلے لداؤ کے حجرے میں بانیٔ مکان دفن ہوا ۱؎ اس کی قبر کا سیدھا سادہ تعویذ فرش پر بنا ہوا ہے اور اس کے ہر گوشے پر گولنداز سپاہی (کی مورت) پوری وردی پہنے، بحالت غم ہتھیار نگوں کئے، گویا اپنے آقا کے خاتمے پر ماتم کناں ایستادہ ہے۔ یہ تعویذ اور مورتیں بھی یہاں کے ہر دوسری چیز کی طرح بُری بنی ہوئی ہیں۔ لیکن ایک سپاہی کی قبر کے لئے ایسی یادگار بنانے کا تخیل یقیناً بہت ہی موزوں اور دلکش ہے۔

یہ عمارت جب نئی نئی بنی تو لازماً حیرت انگیز تھی۔ کم سے کم اودھ کے بادشاہوں پر تو اس کا بہت ہی اثر پڑا اور گو انکی مسجدیں، مقبرے اور امام باڑے تو اسی بگڑے ہوئے اسلامی طرز میں جو ان دنوں مروج

۱؎ آصف الدولہ نے خواہش کی تھی کہ سو لاکھ (= ایک کرور) روپے میں اس مکان کو خرید لیا جائے۔ جنرل مارٹن ڈرا کہ مرنے کے بعد دیسی عدالت والے اس کی ضبطی کا حکم نہ دے دیں اور اسی سے بچانے کے لئے اپنی قبر یہاں بنوالی۔ غدر کے زمانے میں بلوائیوں نے اس عمارت پر قبضہ کیا اور اس کی قبر کھود کر ہڈیاں باہر پھینک دی تھیں مگر ۱۸۶۵ء میں پھر قبر بنوا دی گئی۔

تھا تعمیر ہوتے رہے لیکن ان کے سوا لکھنؤ میں جس قدر محلات بنے وہ آیندہ اسی اطالوی نما طرز میں تھے۔ فرحت بخش، سعادت علی خاں نے، چھتر منزل، نصیر الدین حیدر نے بنوائی اور اسی طرح بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں جن میں ایک طرف تو فرانسس اوّل کے عہد کی عجیب و رنگین بے قاعدگی نظر آتی ہے اور دوسری طرف ہنری چہارم کی عمارات سے بھی زیادہ انوکھے نقش و نگار موجود ہیں۔ مگر ان سب سے بڑھ چڑھ کر ان میں بے ڈھنگی قیصر باغ کی عمارت ہے جسے واجد علی شاہ نے تیار کرایا تھا۔ یہ ایک نہایت وسیع صحن کے چار طرف عمارات کا سلسلہ ہے اور نپولین ثالث کے قصر لوورے اور تیلریز کو ملا دینے سے جو صورت نکل آئی تھی، اس سے وسعت و ترتیب میں کچھ نہ کچھ مشابہت رکھتا ہے لیکن پیرس کے نفیس پتھر کی بجائے یہاں اینٹ، چونا اور اس فرنگی محل کے موزوں اجزا کی بجائے یہ قریب قریب ساری دو منزلہ عمارت نئی نئی وضعوں کا مجموعہ ہے۔ عام طور پر دونوں منزلوں میں صندوقی اور بہت ہی حقیر صورتوں کے ستون چلے گئے ہیں اور درمیان میں یکے بعد دیگرے اطالوی دریچے (جن کے پٹ وینسی وضع کے ہیں) اور اسلامی محرابیں یا محض کھلے ہوئے در بلا کسی ترتیب کے آجاتے ہیں۔ ان کے اوپر کنگورے اسلامی طرز کے اور برجیاں ایسے نمونے کی بنائی ہیں کہ روم و اطالیہ میں کسی نے کبھی دیکھی بھی نہ ہونگی۔ پھر ان سب کو ایسے رنگوں سے رنگ دیا ہے جو جتنے شوخ ہیں اسی قدر گنوار و بھی ہیں۔ اندر کئی وسیع و خوشنما ایوان ہیں مگر سب سے وہی بد مذاقی ظاہر ہوتی ہے جیسی بیرونی عمارت سے۔

البتہ بیگم کوٹھی، جو قیصر باغ کے سلسلے کی دوسری عمارتوں سے الگ بنی ہوئی ہے، غالباً ان سب کی نسبت اس طرز کا بہتر نمونہ ہے اگرچہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ اطالوی فن کا کوئی اچھا نمونہ پیش کرتی ہے یا اس طرز میں مشرقی ضروریات کے مطابق تصرف کی کوئی عمدہ مثال ہے۔ لیکن اس میں ایک خاص قسم کی بوقلمونی پائی جاتی ہے جس نے کسی حد تک اس کے دوسرے عیوب کی تلافی کر دی، اصل یہ ہے کہ اطالوی طرز تعمیر کے سبھی مشرقی نمونے

قدیم ستون اور گردنے کی صحیح تقسیم کے اصول کے خلاف ورزی کرتے ہیں اور دوسروں کی نسبت کم سہی، بنگیم کوٹھی میں بھی یہ خرابی موجود ہے۔ حقیقت میں ہندوستان کا کوئی باشندہ ہماری (فرنگی) تقسیم کی اصل وبنا کو ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھ سکتا نہ اس کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ گردنے کو کنگنی، حاشیہ، سرستون کے مستقل اجزا میں کیوں تقسیم کیا جائے۔ کھمبوں کی بلندی میں خاص خاص قطروں کی پابندی کیوں کی جائے وغیرہ وغیرہ۔ سچ پوچھئے تو یہ ایسی بات ہے جیسے کوئی شخص زبان کو جانے بغیر اس کی تحریر کو نقل کرنے کی کوشش کرے حالانکہ اس کی الف بے تے بھی نہیں جانتا۔ ظاہر ہے کہ کتنی ہی دیدہ ریزی اور دماغ سوزی کرے، اس کام کو وہ صحت کے ساتھ کبھی انجام نہ دے سکیگا فن کی اس ابجد سے ناواقف ہونے کے علاوہ ہندوستان میں معمار کو یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ سایہ دینے کی غرض سے ہی تو کنگنی ضرور زیادہ چوڑی ہونی چاہئے اور پیچ سے اٹھانی کے ساتھ بنانا منظور ہے تو اسے اتنا دبیز نہ ہونا چاہئے جو ہندوستان کی برسات میں مشکل سے تھم سکتی ہے۔ دوسرے اہل ہند کے خیال میں اینٹ کے ستون لازماً اتنے موٹے ہونے چاہئیں کہ اطالوی طرز میں عموماً اس قدر موٹے نہیں ہوتے۔ تیسرے ایسے ملک میں جہاں دیمک سے بچ جائے تو بھی لکڑی بہت جلد فرسودہ ہو جاتی ہے، چوبی سرستون بدترین چیز سمجھے جائیں گے۔ خلاصہ یہ کہ مغربی فن کے اصول سے ناواقفیت اور دوسری طرف یہ علم کہ میرے ملک کی آب وہوا اور ضرورتوں کی مناسب کیا چیز ہوگی، یہ ملکر ہندوستان کے معمار کو لامحالہ خلط مبحث میں مبتلا کر دیتی ہیں لیکن ہمارے (یعنی انگریزوں کے) ہاں تعلیم اور تجربے سے جو شوق پیدا ہوتا ہے۔ اہل ہند میں محض تقلید اور ایک ہی وضع کی پابندی کا جذبہ اپنی ریس کرنے کی کافی وجہ بن جاتا ہے۔ یہی اپنے سے بہتر چیز کی نقالی کی فضول کوشش ہے کہ انھوں نے اپنے خوبصورت طرز کو چھوڑ دیا اور بد ذوقی اور گنوارپن کی وہ عجیب و غریب معجون مرکب تیار کی جو لکھنؤ اور دوسرے مقامات میں ہمیں نظر آتی ہے ۔

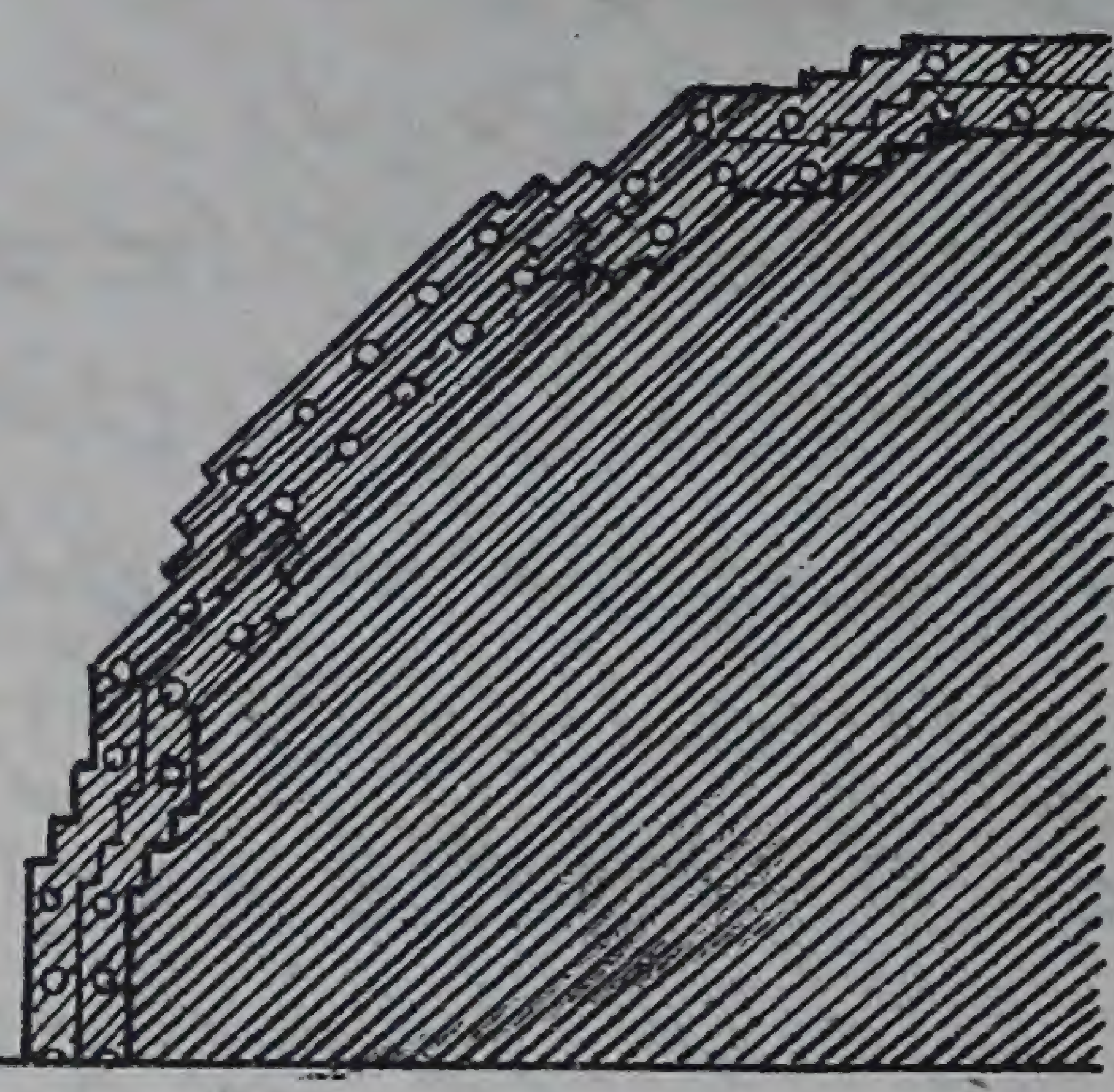
کلکتے کے بابو اور دیسی راجاؤں نے زیریں بنگالے میں اپنے رہنے کے لئے جو بڑی بڑی سرائیں تیار کی ہیں، وہ عموماً اسی مخلوط طرز میں ہیں اگرچہ ان میں بعض کی شان مستزاد ہے۔ لیکن غالباً اس کی سب سے حیرت انگیز مثال وہ حویلی ہے جو دلی کے آخری بادشاہ نے خود لال قلعے میں تعمیر کرائی تھی۔ یہ شاہجہاں کے اس دیوانِ خاص کے عقب میں تھی اور اس سے ابھری ہوی نظر آتی تھی، جس کو تخت طاؤس رکھنے کے لئے بنایا گیا تھا اور جو حسن وتجمل کے اعتبار سے اس صنف کی بہترین عمارات عالم میں شمار ہوتا ہے۔ قلعے میں داخل ہوتے ہی فن تعمیر کے اس بے بہا نمونے کے اوپر اینٹ اور چونے کی ایک چھوٹی سی عمارت نظر آتی تھی جسے معمار نے اپنے نزدیک ڈورک طرز میں بنایا اور اطالوی دریچوں میں دیسی پٹ لگائے تھے۔ پوری عمارت پر ہرا، حاشیئے پر سرخ اور نقش ونگار پر زرد رنگ کر دیا تھا! غرض ہالینڈ کی کسی نہر کے کنارے پر جو بنگلے گرمی گزارنے کے لئے بنے ہوے نظر آتے ہیں وہ اتنے بدنما نہ ہوں گے۔ جتنی کہ یہ عمارت تھی۔ پھر اس محل کی سادگی اور جمال کے مقابلے میں جو صاف شفاف سنگ مرمر کا بنا ہوا سامنے موجود تھا، یہ زبان حال سے جس کے سمجھنے میں کسی کو دھوکا نہیں ہو سکتا، صاف صاف بتاتی تھی کہ آج اس تخت پر جلوس کرنے والے کس درجہ ذلیل وخوار ہو چکے ہیں جہاں کبھی ان کے اسلاف یعنی خاندان تیموری کے وہ نامور فرماں روا راج کرتے تھے جنہوں نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی اور اس کے شہروں کو ان بے مثل و بے عیب عمارات سے مزین کیا جن کی کیفیت اس کتاب کے ایک جداگانہ جزو میں تحریر کی جا چکی ہے[1]۔

اسی قسم کی عمارتوں میں جن تک یورپ کا برا اثر نہیں پہنچ سکا اور جو انہی اسلاف کی یادگاروں میں منسوب ہونے کے لائق ہیں، لکھنؤ میں بھی

[1] یعنی "ہسٹری اوف دی موڈرن اسٹائلز اوف آرکی ٹیکچر" جلد دوم میں۔

چند عمارتیں پائی جاتی ہیں: جیسے وہ بڑا امام باڑہ کہ گو تفصیلی امتحان کی تاب نہیں لاسکتا، تاہم اتنے بڑے پیمانے پر بنایا گیا ہے کہ قدیم تر عہد کے کاموں کے ساتھ شمار کیا جاسکتا ہے۔ اسے اودھ کے چوتھے نواب آصف الدولہ نے قحط زدوں کی امداد کے لئے ۱۷۸۴ء میں تعمیر کرایا تھا۔

خاکہ دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اس کا بڑا دالان ۱۶۲ فیٹ لمبا اور ۵۳½ فیٹ چوڑا ہے۔ دونوں طرف کے پیش یا برآمدے ۲۶½ و ۲۷¼ فیٹ عریض ہیں اور دونوں سروں پر ہشت پہلو کمرے بنا دیئے ہیں جن کا عمود ۵۳ فیٹ ہے دوسرے لفظوں میں آثار چھوڑ کر پورا طول ۲۶۳ اور عرض ۱۴۵ فیٹ ہوا۔ اس وسیع عمارت کو سادہ وضع اور سادہ تر ساخت کے لداؤں سے بنایا ہے جن کو اینٹ اور مٹی کے سانچوں پر کنکر کوٹ کر کئی فیٹ موٹی تہ دی تھی اور یہ سانچے سال سال دو، دو سال تک کھڑے رہنے دیئے تھے کہ چھت خوب جم جائے اور سوکھ جائے۔



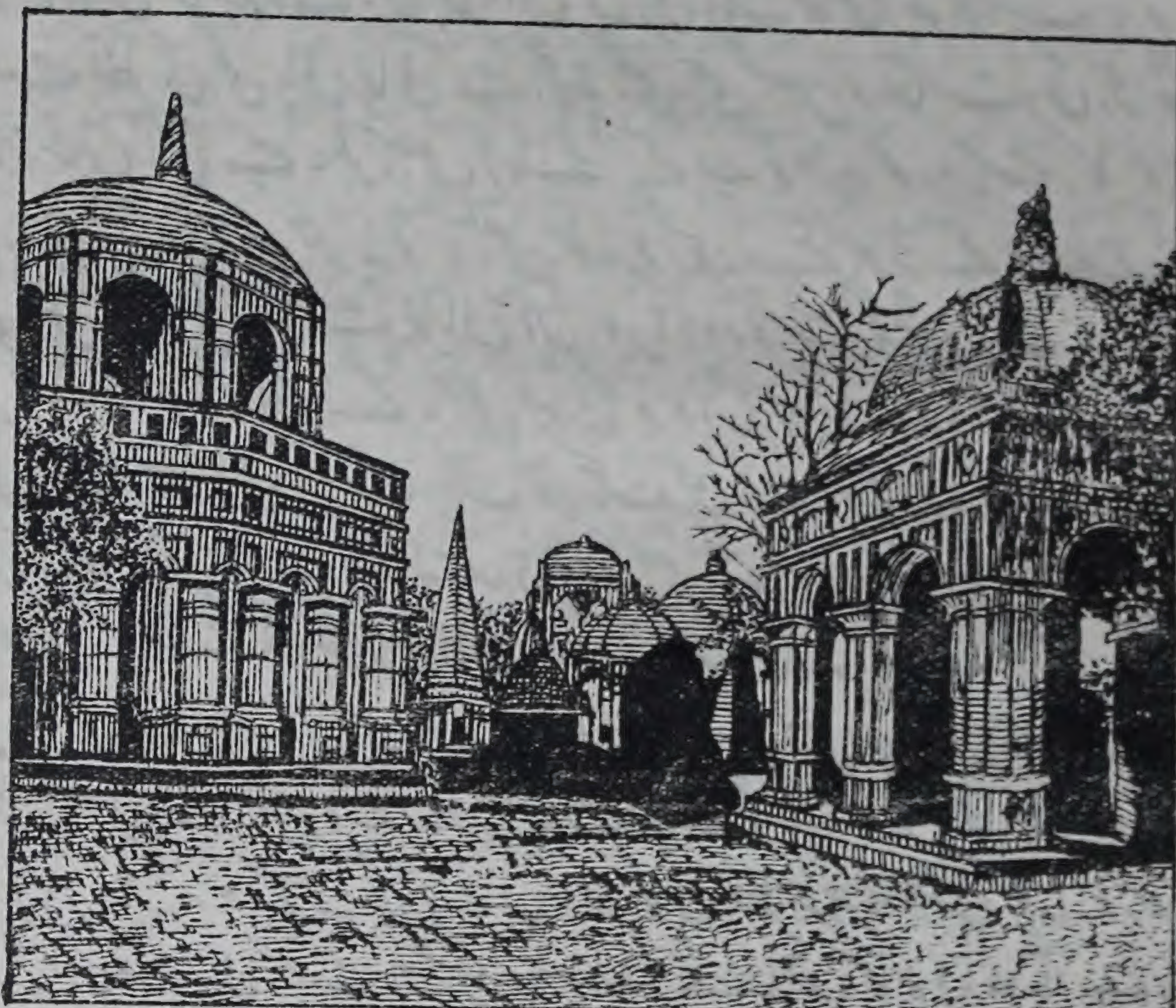
خاکہ (۳۴۵)

پھر اس بھرت کو نکال دیا تو پورا لداؤ ایک جان ہو کر قائم رہ گیا جس میں چال کرنے یا لٹک پڑنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی اور بظاہر یورپ کے غوطی لداؤ سے بھی زیادہ پائدار و بہتر صورت چھت بنانے کی نکل آئی۔ دوسرے اس کے سادہ اور ارزاں تر ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کیونکہ

یہ فی الواقع مٹی کے سانچے پر تیار کی جاتی ہے جس کو معمار اپنی پسند کے موافق جس شکل میں چاہے مرتب کرلے۔

یورپ کے لوگ جو شروع شروع میں ہندوستان آکر آباد ہوئے، وہ فرنگستان سے کچھ ایسے جلاوطن اور بے تعلق سے ہوگئے تھے کہ انھوں نے بہت سی عادتیں اور خیالات انھی لوگوں کے اختیار کرلئے جن کے درمیان وہ رہتے سہتے تھے۔ ان خاص خاص عادات میں ایک عجیب شوق شاندار قبریں بنانے کا بھی انھیں لاحق ہوگیا اور سورت و احمد آباد وغیرہ مغربی سواحل کے ان مقامات پر جہاں فرنگی لوگ شروع میں آکر بسے، ہم ولندیزوں اور انگریزوں کی سترہویں صدی کی قبریں دیکھتے ہیں جو وسعت میں مسلمان امرا کی مدمقابل اور صورت میں انھی سے مشابہ ہیں لیکن غور سے معاینہ کیجیے تو ان کی جزئیات بہت ناقص ثابت ہوں گی۔ اصل میں ادھر تو ان کے معماروں کو اتنا خیال تھا کہ ستون، گول اور کمانیں مدور ہوتی ہیں اور دوسری طرف وہ مغربی رودکار کی بھی دھندلی سی یاد رکھتے تھے لیکن اس کا ٹھیک ٹھیک نقشہ کاغذ پر نہ کھینچ سکتے تھے اور نہ زبانی اپنا مطلب پوری طرح سمجھا سکتے تھے کہ دیسی راج اسے درست بنا سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض جگہ ہمیں بارہ ستون پر جن کی کوئی وضع ہی نہیں گنبد بنے ہوئے ملتے ہیں اور بعض جگہ ایسے ہندی اجزا خلط ملط کردیئے گئے جن کا کوئی نام نہیں اور جن کی تعمیر کا طریقہ دیکھ کر پریشانی ہوتی ہے کہ الٰہی یہ شئے کس طرح بنائی گئی اگرچہ اس میں ایک قسم کی بوقلمونی ضرور آگئی ہے۔ یہ سب عمارتیں اینٹ، چونے سے بنی تھیں لہٰذا بہت سی گر گر کھنڈر ہوگئی ہیں البتہ سر جورج آکسن ڈین (متوفی ۱۶۶۹ء) اور اس کے بھائی کرسٹوفر کے مقبرے سورت میں اب تک سلامت اور بامرمت حالت میں ہیں اور انگلستان میں بنائے جائیں تو لوگ دنگ رہ جائیں۔ اس میں سر جورج کے مقبرے کے اندر اس کے بھائی کرسٹوفر کی چھتری ہے۔ لیکن زیادہ وسیع اور رفیع الشان عمارت اس کے نامور بھائی کا مقبرہ ہے جو دومنزلہ، ۴۰ فیٹ اونچا اور ۲۵ فیٹ

قطر کا ہے[1]۔ بعض دوسرے مقبرے خصوصاً وہ جو زیادہ پرانے ہیں، بہتر مذاق کا ثبوت دیتے ہیں اور جن ہندوستانی نمونوں کی نقل ہیں، ان سے فی الجملہ زیادہ مماثلت رکھتے ہیں[2]۔



تصویر (۲۴۱)

قیاس آرائی کے لئے یہ بھی بہت دلچسپ اور نادر موضوع ہوگا کہ اگر فرنگیوں کا

[1] اینڈرسن "انگلش ان ویسٹرن انڈیا" وغیرہ۔ سورت کے ولندیزی قبرستان میں بیرن فان ریڈ کے مقبرے کی نسبت کہا جاتا ہے کہ شان و شوکت میں سب سے بڑھا چڑھا ہوا تھا۔

[2] ہسٹری ... آرکیٹکچر" دوم، ۲۰۹

کسی قسم کا اثر نہ ہوتا تو ہندوستان میں اسلامی طرز تعمیر کا انجام کیا ہوتا ؟ اس تحقیق کے واسطے مصالحہ وافر نہیں ہے تاہم اورنگ زیب کی وفات سے قبل ہی انحطاط فن کے آثار نمایاں ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اٹھارویں صدی گزرنے کے بعد آگرہ اور دہلی میں جو مکانات ایسے بنے کہ ان تک فرنگی اثر کا کوئی شائبہ تک نہیں ملتا، ان میں بھی ایک خاص قسم کا ضعف اور صحت نظر کی کمی پائی جاتی ہے اگرچہ کبھی کبھی حسن و نفاست کی بھی خاصی ممتاز شان آگئی ہے۔ مگر اس زمانے کے بعد تو مزید غور و بحث کا موقع ہی باقی نہیں رہتا کیونکہ یا تو مستقل طور پر کسی نئے طرز کے وجود میں آنے سے قبل) فرنگی اثرات نمایاں ہیں اور یا دور دست گوشوں میں انحطاط بغیر کسی بیرونی اثر کے بالکل صریح و واضح ہو گیا ہے، جیسا کہ ابھی بیان ہوا، میسور کی حالت ایک حد تک یہی ہے البتہ جوناگڑھ (گجرات) میں ایک مجموعہ مقابر موجود ہے جو گذشتہ صدی میں بلکہ بعض تو چالیس پچاس برس پیشتر ہی تعمیر ہوئے تھے ان میں فن عمارت کی جو اوضاع و اشکال نمایاں ہیں، جہاں تک سمجھنے واقفیت ہے وہی قریب ترین صورتیں ہیں جو یہ اسلامی طرز تعمیر ان دنوں اختیار کر رہا تھا۔ بے شبہ اس کے نقش و نگار اور جزئیات ایک خاص قسم کی نفاست سے خالی نہیں ہیں۔ دریچوں کی جالیاں اکثر کمال نظر فریب ہوتی ہیں اور نقاشی کا سارا کام پوری صحت اور حسن تناسب کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے۔ مگر یہ سب چوبی کام ہیں جس کے معنی یہ ہوے کہ یہ ساری نقاشیاں اور صناعیاں سنگین عمارت کی نسبت کسی الماری یا مسہری یا اور اسی قسم کے ساز و سامان کے واسطے زیادہ، موزوں ہوتیں ایسے پھر گنبدوں کو دیکھئے تو مشکل سے پتہ چلیگا کہ یہ ترک و افغان شاہوں کی پر جلال و عظمت اوضاع کے یادگار ہیں۔ کنگوروں میں طفلانہ جدتیں کی ہیں اور دیوار گیریاں کام کی بجائے زیادہ تر نمائشی بنادی ہیں حقیقت میں یہ ایسا طرز رہ گیا ہے جو تعمیر کے صحیح اصول سے بے تعلق ہو کر اب اپنی کامیابی کے لئے محض تکلف و آرائش کا رہین منت ہے لیکن جب اصل شے ہی کچھ نہ ہو تو پھر خالی بناؤ سنگار سے حسن تناسب کی وہ کمی پوری نہیں ہو سکتی جو ایسی

عمارت میں لامحالہ پائی جاتی ہے۔[1]

اپنی فن تعمیر کی اس تاریخ کو ختم کرتے وقت (جس میں اس فن کے صرف ان آثار و شیون سے بحث کی گئی ہے جو ہندوستان کی حدود میں ظاہر ہوئے) یہ عجیب و سبق آموز نکتہ بھی لکھنے کے لائق ہے کہ ہم پوری طرح ایک دائرے ہی میں چکر کھاتے رہے۔ یہ بیان شروع تو یوں ہوا تھا کہ کس طرح مسیح علیہ السلام سے دو سو برس قبل ایک چوبی طرز نے آہستہ آہستہ سنگی اوضاع و اشکال اختیار کیں اور بتدریج ایسا طرز بن گیا کہ پھر اسے دیکھکر اس کے کبھی چوبی ہونے کا پتہ بھی نہ چل سکتا تھا لیکن اب اس بیان کا خاتمہ اس قول پر ہوتا ہے کہ حل شہیئر، بیجاپور، یا دہلی کا طرز عمارت آخر میں پھر اپنی اوضاع کی طرف عود کر رہا ہے جو فن نجاری کو زیادہ زیب دیتے ہیں بہ نسبت ایسی معماری کے، جیسی بھروت یا سانچی کے بڑے دروازوں میں صرف کی گئی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہ بات بھی قابل بحث ہو سکتی تھی کہ ہندوستانی طرز عمارت اسی غلط روش پر چلتا رہا تو آیا وہ غالباً بالکل نیست و نابود ہو جائے گا یا نہیں؟ لیکن اب ایسی تحقیق بیکار ہے کیونکہ لکھنؤ وغیرہ کی مثال سے صاف ثابت ہے کہ اس طرز تعمیر کی موت بیرونی طرز کی نقالی سے واقع ہوگی۔

[1] حقیقت میں یہ زمانہ ہے جب کہ اسلامی تعمیر کو پوری طرح ہندی اثرات سے متاثر کہہ سکتے ہیں۔ مترجم۔

باب یازدہم

چوبی طرز تعمیر

موضوع : مسجد شاہ ہمدان، سری نگر (کشمیر)

(ﭘ)

ہندوستان میں جو نقلی چوبی طرز مروج ہوا، اور جس کا ہم ابھی ذکر کر رہے تھے، وہ محض انحطاط و کہنگی کی علامت تھا لیکن اس سلسلے میں اگر ہم اس داستان کو اصلی چوبی طرز کے تذکرے پر جیسا کہ وہ کشمیر میں مروج ہے، ختم کریں تو زیادہ لطف و انبساط کا موجب ہوگا۔ شہر سری نگر کی جامع مسجد وسیع و قابل لحاظ عمارت ہے اور گو اتنی شان و شکوہ نہیں رکھتی جس قدر بعض وہ مساجد جن کا گذشتہ ابواب میں حال بیان ہوا تاہم اس میں بڑی دلچسپی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ شروع سے اسے خالص چوبی ہی بنوایا گیا ہے اور اسی لئے اس کی خصوصیات کی مطالعے سے بہت سے ایسے مسائل کے حل کرنے میں ہمیں بڑی مدد ملتی ہے جو ہندوستان کے طرز تعمیر کی تاریخ مرتب کرنے میں پیدا ہوتے ہیں افسوس یہ ہے کہ یہ مقبول عام مسجد نہیں ہے اور ایک ہزار ایک (فرنگی) سیاحوں میں سے جو وادی کشمیر کی سیر کرتے ہیں، کوئی اس کا ذکر نہیں کرتا اور نہ اب تک کسی تصویر کش نے اپنا مصورہ (کیمرا) اس کی حدود میں لا کے لگایا ہے[۱]۔

[۱] اگر لفٹنٹ کول ان نقشوں اور عمارتی جزئیات کو جو پہلے جنرل کننگ ہیم چھاپ چکے تھے دوبارہ چھاپنے کی بجائے اس غیر معروف عمارت کا ہی نقشہ اور نقش و نگار کے نمونے ہمیں مہیا کر دیتے تو یہ ایسی خدمت ہوتی کہ سب ان کے احسان مند ہوتے۔ مجھے اس مسجد کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا وہ کرنل مونٹ گومری کی گفتگو سے اخذ کیا گیا ہے۔

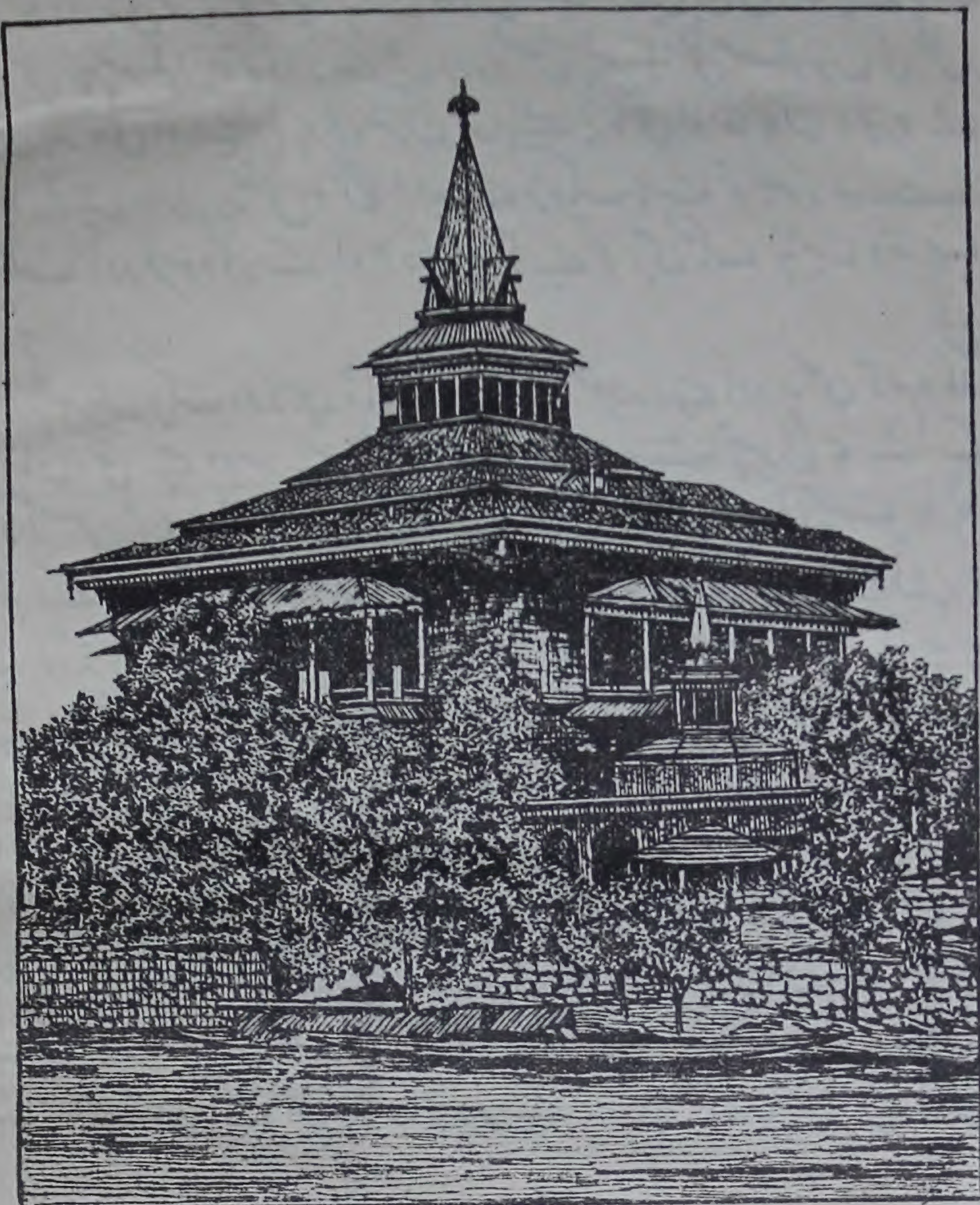
اس کا نقشہ وہی عام نقشہ ہے کہ بیچ میں صحن اور مشرق کی طرف تین گہ کا اور باقی رُخ چار چار گہ کے دالان[1] بنائے ہیں جن کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں تمام ستون دیودار کے ہیں اور یہ محض پتھر یا سنگی ستونوں کی نقل کے نہیں بلکہ اصلی اور بے ریا چوبی ستون ہیں جیسے برما کی خانقاہوں وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان پر نقش و نگار، میرے نزدیک بہت خوبصورت و پر تکلف، اور فرسودگی کے باوجود کہا جاتا ہے کہ ابھی تک نہایت دلفریب ہیں۔

شہر میں ایک اور مسجد شاہ ہمدان والی مشہور ہے اور یہ بھی تمام و کمال چوبی بنائی گئی ہے۔ دوسرے جامع مسجد سے بہت چھوٹی ہونے کے باوجود اس میں یہ بات بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ اس کی چھت غالباً مارتانڈ کے مندر کی قدیم چھت سے مشابہ ہے اور دوسرے چوٹی پر جو عجیب وضع کا کلس ہے وہ بھی بدھوں کی "ہٹی" کی یاد دلاتا ہے۔ اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس میں بہت کچھ تصرف کر دیا گیا ہے تاہم مثال کے طور پر سوئیام بھوناتھ (نیپال) وغیرہ مقامات میں ہٹی کی جو شکلیں ملتی ہیں ان سے کچھ بہت مختلف نہیں ہیں۔

دیواریں بھی ہماری دلچسپی کا موجب ہیں کہ ان میں شہتیروں کو جس طرح جمایا اور آراستہ کیا ہے وہ پتھر کی کسی دوسری چنائی سے مشابہ ہونے کی نسبت، جہاں تک ہمیں یاد آتا ہے، اڑیسہ کے مندروں سے بہت صاف مشابہت رکھتے ہیں۔ بھوانیشور کے بڑے مندر کے برج میں

تصویر بر صفحہ دیگر

[1] یہ عبارت کچھ غلط معلوم ہوتی ہے۔ مسجد میں تین طرف چار چار گہ کے دالان کہیں نہیں ہوتے۔ مترجم۔



تصویر (۴۴۳)

اور اسی طرح وہاں کے بعض دوسرے مندروں میں جس طرح ردّے جمائے
ہیں، ان سے قریب قریب وہی کیفیت مترتب ہوتی ہے جیسی ان چوبی دیوارو
سے۔ لہٰذا یہ غیر اغلب نہیں ہے کہ ان کی وضع کسی ایسے ہی قدیم نمونے

سے اخذ کی گئی ہو۔ اس کے علاوہ اڑیسہ کے مندروں میں جس طرز کے
بیل بوٹے تراشے ہیں اور اس طریق تزئین کو جس حد تک وسعت دی ہے
وہ بھی پتھر کی بجائے زیادہ تر کسی چوبی اصلیت کا خیال دلاتی ہے ؛
مگر ان مسائل پر اسی وقت کوئی مفید بحث ہو سکتی ہے جب کہ ہمیں
اس کشمیری طرز کے متعلق موجودہ معلومات سے کچھ زیادہ واقفیت بہم
پہنچ جائے۔ البتہ جب اس مقصد کے لئے ضروری سواد فراہم ہو جائے گا تو
پھر اس اصلی اور نقلی چوبی فن تعمیر کے بارے میں ایسے ابواب لکھنے ممکن
ہوں گے جو نہایت ہی دلچسپ اور ہندوستان کی تاریخ طرز تعمیر کا موزوں ترین
تتمہ ہوں گے اگرچہ اب بھی اس تاریخ کا اسی چوبی فن کے ذکر سے آغاز
اور اسی پر اختتام ہوتا ہے ؛

تمت

۷۸۶

صحت نامہ

"اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں"

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۸	۸	اند	مانند
〃	۱۶	کمان	گمان
۶۹	۲۴	میں	ہیں
۷۰	۲	سیہ	سید
۱۳۶	۱۰	نو اور افراد	نوآور افراد
۱۴۹	۶	ہو رہنے	ہوا رہنے
۱۷۴	۱۸	کی سامنے	کے سامنے
۱۸۳	۱	کے خلاف ورزی	کی خلاف ورزی
〃	۱۹	ضرورتوں کی مناسب	ضرورتوں کے مناسب
۱۸۷	حاشیہ سطر (۱)	قبہ ستان	قبرستان
۱۸۹	۱۰	اپنی اوضاع	اپنی اوضاع
۱۹۰	۱۱	کی مطالعے	کے مطالعے
۱۹۳	۶	بہم پہنچ جانے	بہم پہنچ جائے